اردو دائرہ معارف اسلامیہ

زیرِ اہتمام

دانش گاہ پنجاب لاہور

شعبہ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

اردو

دائرۂ معارف اسلامیہ

زیرِ اہتمامِ

دانش گاہِ پنجاب ، لاہور

جلد ۱۹

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم —— محمرہ)

۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

باردوم

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سیّد محمّد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ (پنجاب) . . . . . رئیس ادارہ (رخصت پر)*

پروفیسر سیّد محمّد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب) . . . . سینیر ایڈیٹر و قائم مقام رئیس ادارہ*

پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب) . . . . . سینیر ایڈیٹر

پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی، ایم اے (پنجاب) . . . . . ایڈیٹر

شیخ نذیر حسین، ایم اے (پنجاب) . . . . . ایڈیٹر

ڈاکٹر عبدالغنی، ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب) . . . . . ایڈیٹر

حافظ محمود الحسن عارف، ایم اے (پنجاب) . . . . . ایڈیٹر

*از ۹ مارچ ۱۹۸۶ء

مجلس انتظامیہ

۱- پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد، ایم اے (پنجاب)، بی اے (مانچسٹر)، ڈی فل (اوکسفرڈ)، وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)

۲- پروفیسر ڈاکٹر منیر الدین چغتائی، ایم اے (پنجاب)، ڈی فل (آکسن)، پرو وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب

۳- پروفیسر شیخ امتیاز علی، ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)، ایل ایل ایم (پنجاب)، ایل ایل ایم (سٹنفرڈ)، وائس چانسلر، قائداعظم یونیورسٹی و صدر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسلام آباد

۴- جسٹس (ریٹائرڈ) سردار محمد اقبال، وفاقی محتسب، حکومت پاکستان، اسلام آباد

۵- سیّد بابر علی شاہ، ۷۔ ایف سی سی - گلبرگ، لاہور

۶- معتمد مالیات، حکومت پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۷- معتمد تعلیم، حکومت پنجاب، لاہور (یا نمائندہ)

۸- ڈین کلیۂ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۹- ڈین کلیۂ سائنس، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۰- ڈین کلیۂ قانون، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۱- رجسٹرار، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۲- خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور

۱۳- ڈاکٹر سیّد محمّد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایمریطس، صدر شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور

۱۴- پروفیسر سید محمد امجد الطاف، ایم اے، قائم مقام صدر شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (معتمد)

حضرت محمدؐ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

⊗ حضرت مُحَمّد، صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم: پیغمبر اسلام، سرور کائنات، محمد بن عبداللہ بن عبدالمُطّلب بن ہاشم (پورا سلسلۂ نسب آگے آتا ہے).

[یہ مقالہ بڑے ادب و احترام، بڑی احتیاط اور بڑے خوف سے مرتب ہوا ہے؛ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان قلم پر نہ آ جائے، جو شان اقدس سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔ یہ مقالہ عام مقالات سے مختلف ہے۔ یہ تو مرکزی نقطۂ ایمان ہے جس کے ارد گرد کونین کے سب حقایق لپٹے ہوے ہیں۔ ہم نے ہر طرح قابل اعتماد مصادر کی بنیاد پر حالات مرتب کیے ہیں اور کوشش کی ہے کہ منصب نبوت کی تقدیس کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ یہ مقالہ دو مقالات سیرۃ اور علم سیرۃ نگاری کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جن میں سیرۃ کی کتابوں کی درجہ بندی کی گئی ہے].

نسب: ابو القاسم، محمّد (رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم) بن عبداللہ بن عبدالمطّلب (شیبہ الْحَمَد) بن ہاشم (عَمرو) بن عبد مَناف (=اَلْمُغیرۃ) بن قُصَیّ (زید) بن کلاب بن مُرّۃ بن کعب بن لُؤَیّ بن غالب بن فِہر (قریش) بن مالک بن النَّضر (قیس) بن کنانۃ، بن خُزَیْمۃ بن مُدرِکَۃ (عامر) بن اِلْیاس بن مُضَر بن نِزار بن مَعَدّ بن عَدنان۔ [مُدْرِکَۃ کے نام کے بارے میں اختلاف ہے؛ ابن حزم (جَمْہرۃ انساب العرب، ص ۱۰) نے عامر لکھا ہے، مگر ابن سعد (طبقات، ۱: ۵۵) اور البلاذری (انساب الاشراف، ۱: ۳۵)، ابن کثیر: (السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۶۴ء، ۱: ۱۸۸) وغیرہ نے عمرو نقل کیا ہے؛ مدرکہ کے باپ کے نام کے تلفظ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے اسے اِلْیَاس پڑھا ہے (دیکھیے لسان العرب، بذیل مادہ الس و یوس؛ الزرکلی: الاعلام، بذیل مادہ اِلیاس) اور بعض نے اَلْیَاس بن مُضَر، یعنی ال کو غیر لازم قرار دیا ہے (دیکھیے تاج العروس، مطبوعۂ کویت، بذیل مادّۂ یئس، ائس؛ البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۳۱، ۳۳؛ ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲ و ۳).]

اس حد تک تو نسب خود رسول اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم سے مروی ہے اور اس سے اوپر کے متعلق آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے: کَذَبَ النَّسَّابُون، یعنی نسب بتانے والے جھوٹے ہیں (السہیلی: الروض الانف، ۱: ۱۱؛ طبقات، ۱: ۵۶).

[آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے نسب کے سلسلے میں عدنان تک تو سب متفق ہیں، لیکن اس سے اوپر حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام تک ماہرین انساب میں اختلاف ہے کہ کتنی پشتیں ہیں۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ بعض نسّاب نسبت کے وقت اوپر کے صرف نامور اور مشہور آبا و اجداد کا ذکر کر دیتے ہیں اور کم مشہور افراد کو درمیان سے حذف کر دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں کتب اسماء الرجال میں بھی موجود ہیں؛ چنانچہ جن لوگوں نے آنحضرت صلّی اللہ

علیہ و آلہ وسلم کے اجداد کا استقصا کیا ان کے ہاں تعداد زیادہ ہے اور جن حضرات نے صرف نامور اور چیدہ آبا و اجداد شمار کیے، ان کے نزدیک تعداد کم ہوگئی۔ ماہرین انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ عدنان کا نسب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام تک صحیح ہے، البتہ درمیان کے آبا و اجداد کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کا زمانہ بہت بعید ہے اور اتنے دور تک کے سلسلۂ نسب میں اسما کی تعداد میں اختلاف رونما ہو جانا کوئی بعید نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے سلسلۂ نسب کی ایک ایک کڑی، جس سے آپؐ کا سلسلۂ پیدائش مربوط ہے، نجابت و شرافت اور عزت و نیک نامی کا پیکر تھی۔ آپؐ کے سب آبا و اجداد اور امہات، یعنی والدہ ماجدہ، نانیاں اور دادیاں نہایت پاکباز، نیک اور باوقار خواتین تھیں۔ آپؐ کے تمام بزرگ شرعی نکاح سے پیدا ہوے تھے۔ آپؐ کے سارے خاندان میں کبھی کوئی شخص زنا اور بدکاری کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ آپؐ کا سارا سلسلۂ نسب محترم اور نامور بزرگوں پر مشتمل ہے۔ وہ سب کے سب سردار اور قائد تھے اور معاشرے میں بڑی معزز اور موقر حیثیت رکھتے تھے۔ شرافت نسبی آپ کی امتیازی خصوصیت ہے]۔

یہ اکیس آبا و اجداد ہیں۔ ہر ایک میں اوسطاً ۳۳ سال کا فرق سمجھیں تو ۶۹۳ سال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آگے صراحت ہوگی، آپؐ کی ولادت سنہ ۵۶۹ء [مشہور ۵۷۰ء] میں ہوئی۔ اس لیے عدنان کی ولادت ۱۲۴ قبل مسیح قرار دی جا سکتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت (السہیلی، ۱ : ۱۱) ہے کہ عدنان اور اسمٰعیل علیہ السّلام کے مابین تیس پشتیں ہیں۔ اس میں ۹۹۰ سال کا اضافہ کریں تو ۱۶۸۳ سال ہوں گے یعنی ۱۲۱۴ ق م ان کا سال ولادت ہوگا۔ تورات (تکوین، ۱۱ : ۲۶) کے مطابق تارح [=آزر] کی عمر ۷۰ سال تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ولادت ہوئی اور تکوین (۱۶ : ۱۶) کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی عمر ۸۶ سال کی تھی جب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام پیدا ہوے اور حضرت اسحٰق علیہ السّلام کی ولادت کے وقت تو ان کی عمر (تکوین، ۲۱ : ۵) ایک سو سال کی تھی۔ اس زمانے کے جن لوگوں کی عمریں تورات میں دی گئی ہیں وہ بکثرت صد سالہ ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے مذکورہ بالا اجداد میں سب ہی پہلوٹی بیٹے نہ ہوں گے۔ اس لیے آپؐ کے اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مابین صحیح مدت بیان نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ مغربی تحقیق میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا زمانہ ۱۸۵۰ ق م، یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے ۲۴۱۹ سال قبل سمجھنا چاہیے [نیز دیکھیے: رحمۃ للعالمین، ج ۲، باب ہشتم]۔

[آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے اپنے اور اپنے خاندان کے مقام و مرتبے کی وضاحت کرتے ہوے فرمایا: اَنَا سَیِّدُ وُلدِ آدم یومَ القیامۃِ و لا فَخْرَ، یعنی میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ ایک مقام پر آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم علیہ السّلام میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو منتخب فرمایا اور بنو اسمٰعیلؑ میں سے بنو کنانہ کو اور بنو کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوے فرمایا کہ میں بنی نوع انسان میں خاندان اور ذات کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں۔ آپؐ کے حسب و نسب اور خاندان کی شرافت و عظمت کی شہادت ابو سفیان جیسے مخالف نے بھی سر عام ہرقل کے دربار شاہی میں دی تھی۔ (دیکھیے البخاری:

الصحیح، ۱ : ۷ تا ۸، مطبوعہ لائیڈن)].

آبا و اجداد کے کچھ حالات : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ قرآنی بیانات کے باعث ان دونوں اجداد کے متعلق بعض گتھیاں قابل ذکر ہیں؛ [اس لیے مجبوراً ہمیں اجداد کے سلسلے میں بعض اسرائیلی روایات اور تورات و انجیل کے حوالے دینے پڑے ہیں ؛ ورنہ در حقیقت آپ ص کی سیرۃ اقدس آپ ص کے حالات زندگی سے شروع ہوتی ہے اور اسی سے اس کا آغاز ہونا چاہیے ۔ بہر حال مختصراً بعض عقدوں کا ذکر ناگزیر ہے، کیونکہ نسب کے سلسلے میں یہودی اور عیسائی مستشرقین نے بہت سی موشگافیاں کی ہیں ۔] حضرت ابراہیم ع عراقی باشندے تھے؛ ان کے باپ کا نام قرآن مجید (۶ [الانعام] : ۷۴) میں آزر ، اور تورات (تکوین، ۱۱:۲۵) کے مطابق تارح تھا (جو مغربی تحقیق میں بعض اوقات بگڑ کر یونانی میں آتر Athar بھی ہو گیا ہے اور یہی لفظ عربی میں آزر ہے [رک بہ آزر]۔ قرآن (۱۹ [مریم] : ۴۶) کے مطابق بت پرست باپ نے ابراہیم ع کو گھر سے نکال دیا ۔ تکوین (۱۲:۱، ۵) کے مطابق، خدا کی وحی پر وہ اپنی بیوی سارہ وغیرہ کے ہمراہ کنعان (شمالی فلسطین) میں آ بسے ۔ بعض سفروں میں مصر کے فرعون اور جرار Gerar کے حکمران ابیمالک کے سپاہی دونوں کو زبردستی پکڑ کر لے گئے، مگر با عزت طور پر دونوں بادشاہوں نے حضرت سارہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس واپس کرتے ہوئے بہت سے جانور اور نوکر (غلام، باندیاں) تحفے میں دیں، (تکوین، ۱۲ : ۲۰؛ ۲۰ : ۱ تا ۱۴) ۔ مصری تحفے میں حضرت ہاجرہ رض بھی شامل تھیں ۔ صحیح بخاری (۶۰ : ۱۱) میں اَخْدَمَهَا (بطور خادمہ کے دیا) کا لفظ آیا ہے ۔ تکوین (۱۶ : ۱) میں مصری خادمہ ہاجرہ کا ذکر ہے ۔ اس کی شرح میں یہودی فاضل سالومون بن اسحق نے لکھا ہے کہ وہ فرعون کی بیٹی تھیں، اور باپ نے ان سے کہا تھا اس (ابراہیم و سارہ) کے خاندان میں تیرا بطور خادمہ رہنا تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ کسی اور جگہ (میرے محل میں) مالک بن کر رہے ۔ حضرت سارہ کے اولاد نہ ہوئی، اس اثنا میں حضرت ہاجرہ رض [سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نکاح کر لیا تھا (تکوین، ۱۶ : ۳)] اور ان کے بطن سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے (تکوین ۱۶ : ۵)۔ سوکنوں کے جھگڑے کے باعث (تکوین ۲۱ : ۱۰-۱۵) [مگر فی الحقیقت امتحاناً حکم ربی سے] حضرت ہاجرہ رض اور اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صحرا میں لا چھوڑا۔ وہاں ایک فرشتے نے (تکوین، ۲۱ : ۱۹-۲۱) حضرت ہاجرہ رض کو ایک کنواں بتایا ۔ اس سے کنبے کی جان بچی اور وہ صحرائے فاران میں رہنے لگے۔ بائیبل کے نقشوں میں بئر سبع فلسطین میں غزّہ کے جنوب مشرق میں، اور فاران جزیرہ نمائے سینا کے وسط میں بتائے جاتے ہیں، مگر اسلامی روایتوں میں حضرت ہاجرہ رض اور اسمٰعیل ع کو وہاں لا چھوڑا گیا جہاں بعد میں زمزم کا کنواں نکلا اور شہر مکہ بسا ۔ بظاہر ان دونوں میں تطبیق ممکن نہیں ، لیکن امام بخاری (الصحیح : کتاب الانبیاء ، باب ۸) نے صراحت کی ہے کہ کعبے کے اندر جو رنگین تصویریں کھینچی گئی تھیں ان میں حضرت ابراہیم ع اور حضرت اسمٰعیل ع کی تصاویر بھی تھیں اور یہ قبل از اسلام کی بات ہے ۔ [بعد میں آپ ص کے حکم سے مٹا دی گئیں].

[یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بائیبل کے مرتب کرنے والوں نے حضرت اسمٰعیل ع اور ان کی والدۂ محترمہ حضرت ہاجرہ رض کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کی نجابت ، شرافت اور عظمت سے کماحقہ واقف نہیں ہونے پاتا ۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے اولوالعزم اور برگزیدہ پیغمبر تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں منصب نبوت سے نوازا اور توحید کا علم بردار

بنا کر گمراہی اور بت پرستی سے مخلوق خدا کو بچانے کے لیے مبعوث فرمایا؛ چنانچہ انھوں نے تعلیم شریعت اور تبلیغ دین ایسے بلند مقاصد کے سلسلے میں سخت ترین مصائب برداشت کیے؛ بخوشی آتش نمرود میں کود گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے بال بال بچا لیا۔ انھوں نے عبادت اور تبلیغ احکام الٰہی کی خاطر ترک وطن کیا۔ ان کی تین بیویاں تھیں: حضرت سارہؓ، حضرت ہاجرہؓ اور حضرت قطورہؓ۔

حضرت ہاجرہؓ کو بائیبل (کتاب تکوین) میں حضرت سارہؓ کی لونڈی بتایا گیا ہے، جو قطعاً درست نہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے خلاف تعصب کی بنا پر یہ بات لکھی گئی ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت ہاجرہؓ مصر کے شاہی خاندان سے تھیں۔ بقول القسطلانی (شرح صحیح بخاری، ۵: ۳۴۳، مطبوعہ قاہرہ) کان ابوھاجرَ من ملوک القِبْطِ، یعنی حضرت ہاجرہؓ کے والد قبطی بادشاہوں میں سے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ہاجرہؓ شاہان قبط کے خاندان سے تھیں (نیز دیکھیے عنایت رسول چڑیا کوٹی: النصوص الباھرۃ، در خطبات احمدیہ، ۱۶۳ تا ۱۷۷)۔ امام بخاریؒ کے ہاں یہ الفاظ ہیں: اَخْدَمَھَا ھَاجَرَ، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شاہ مصر نے حضرت سارہؓ کی بزرگی اور ان پر خدائی اکرام و انعام دیکھ کر حضرت ہاجرہ کو ان کی خدمت میں دے دیا۔ یہ جملہ از راہ تواضع مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے؛ اگر معاذ اللہ حضرت ہاجرہ لونڈی تھیں تو کتاب تکوین (باب ۱۶: ۳) میں انھیں حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ کیوں لکھا ہے؟ انگریزی میں wife، عربی ترجمہ میں زوجہ اور اردو ترجمہ میں جورو (بیوی) مرقوم ہے۔ اس کے صاف اور واضح معنی یہ ہیں کہ وہ لونڈی ہرگز نہ تھیں، بلکہ وہ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی بیوی تھیں، جس طرح حضرت سارہؓ تھیں اور حضرت اسمٰعیلؑ اسی طرح بیٹے تھے جس طرح حضرت اسحٰقؑ تھے۔ حضرت ہاجرہؓ اور ان کے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو، جن کی اولاد سے ہمارے نبی کریم حضرت محمّد مصطفٰی صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہیں، اللہ تعالیٰ نے بڑے انعامات سے نوازا۔ تورات میں بھی حضرت ہاجرہؓ کی اولاد کی کثرت اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کی بشارت موجود ہے (دیکھیے تکوین، ۱۶: ۱ تا ۶)۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس بتائی گئی ہے (تکوین، ۱۶: ۱۶)]۔

اس پرانی تاریخ کا ایک اور واقعہ بھی بنواسمٰعیل اور بنو اسرائیل میں اختلاف کا باعث ہے اور وہ بیٹے کی قربانی کا مسئلہ ہے۔ تکوین (۲۲: ۱ تا ۲) کے الفاظ ہیں: ان باتوں کے بعد خدا نے ابراہیمؑ کو آزمانا چاہا اور کہا، تیرے بیٹے، تیرے اکلوتے، اسحٰقؑ کو جس سے تو محبت کرتا ہے، لے اور موریہ کے ملک کو جا اور اسے وہاں ایک پہاڑ پر، جو میں تجھے بتاؤں گا قربان کر۔ اسلامی روایتوں میں یہ حضرت اسمٰعیلؑ سے متعلق ہے اور قرآن مجید (۳۷ [الصّٰفّٰت]: ۱۰۱ تا ۱۱۲) کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سخت امتحان میں کامیاب ہونے کی وجہ سے بطور انعام ایک مزید بیٹے، حضرت اسحٰق کی ولادت کی بشارت دی گئی۔

تورات کی داخلی شہادت بھی قرآن مجید کی تائید کرتی ہے۔ اس کے مذکورۂ بالا اقتباس میں اکلوتے بیٹے کا لفظ ہے اور حضرت اسحٰقؑ پہلونٹی بیٹے نہیں، دوسرے بیٹے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی وفات تک (تکوین، ۲۵: ۹) دونوں بھائی زندہ تھے۔ اس لیے کسی وقت بھی اسحٰق اکلوتے بیٹے نہ بنے۔ خروج (۱۳: ۲، ۱۲ اور ۲۲: ۲۹)، نیز اعداد (۳: ۱۳؛ ۸: ۱۷) وغیرہ کے مطابق پہلونٹی بیٹا قربانی میں دینا چاہیے۔ تورات کو بھی انکار نہیں کہ اسمٰعیلؑ پہلونٹی بیٹے تھے۔

[حاصل کلام یہ ہے کہ بائیبل کے مطابق

قربانی کے لیے اکلوتا بیٹا پیش کیا جاتا تھا اور اکلوتا بیٹا حضرت اسمٰعیلؑ ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔ کتاب تکوین کی تصریحات ملاحظہ ہوں: (۱) اور جب ابرام (ابراہیمؑ) کے لیے ہاجرہ سے اسمعیلؑ پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا (تکوین ۱۶ : ۱۶)؛ (۲) اور جب اس کا بیٹا اسحٰقؑ پیدا ہوا تو ابراہیمؑ سو برس کا تھا (تکوین ۲۱ : ۵؛ نیز دیکھیے کتاب تکوین، ۱۷: ۲۴ و ۲۵؛ ۲۱ : ۳ و ۵)۔ ان سب حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت اسحٰقؑ سے تیرہ چودہ برس بڑے تھے اور اکلوتے بیٹے صرف حضرت اسمٰعیلؑ تھے اور یہی مفہوم و مقصود ہے اسلامی روایات کا (دیکھیے ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۱۶؛ ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، ۱ : ۱۹۱؛ شبلی: سیرۃ النبی، جلد اول)].

حضرت ابراہیمؑ کے کنعان آنے پر خدا نے (تکوین ۱۲ : ۷) ان سے وعدہ کیا کہ ان کی پناہ گاہ، سارا کنعان ہمیشہ کے لیے ان کے اور ان کی اولاد کے قبضے میں دے دے گا۔ پھر اسمٰعیلؑ کی ولادت پر اس کی تجدید بھی کی (تکوین، ۱۷ : ۸)۔ اس وعدے کو بنی اسرائیل سے مختص کر دینا بعد کی تحریف معلوم ہوتی ہے۔

[حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو مکّۂ مکرمہ میں آباد کیا اور وہ انھیں ملنے کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم پا کر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر بیت اللہ تعمیر کیا۔ کعبہ شریف کی تعمیر در اصل حضرت آدمؑ نے کی تھی۔ طوفان نوحؑ کے وقت یہ عمارت منہدم ہوگئی تھی۔ حضرت جبریلؑ کی نشان دہی پر حضرت ابراہیمؑ نے از سر نو عمارت بنائی۔ تعمیر کعبہ کے دوران میں باپ بیٹا یہ دعا کرتے تھے: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲ [البقرۃ] : ۱۲۷)، یعنی اے ہمارے رب! ہمارا یہ عمل قبول فرما، تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ آج بھی مقام ابراہیمؑ اور منیٰ کی قربان گاہ اس زمانے کی یادگاریں ہیں].

حضرت اسمٰعیلؑ کی خاطر جب خدا نے چاہ زمزم پیدا کیا تو قبائل جُرہم اور اِیاد کے خانہ بدوش عرب حضرت ہاجرہؓ کی اجازت سے وہاں آ بسے۔ [کعبے کی تولیت حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے ہاتھ میں رہی۔ ایک عرصے کے بعد] بنو جرہم اور حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں تولیت کعبہ پر جھگڑا ہوا [تو کعبے کی خدمت اور تولیت اولاد اسمٰعیلؑ اور بنو جرہم میں تقسیم ہوگئی]۔ جب بنو خزاعہ نے لڑ کر مکے پر قبضہ کیا تو ایک مدت تک کعبے کی تولیت بھی ان کے پاس رہی؛ لیکن بنو اسمٰعیلؑ بہرحال مکے ہی میں مقیم رہے۔ ان کے ایک فرد کلاب نے شمالی عرب میں اپنے ایک سفر کے دوران میں قبیلہ قضاعہ میں شادی کی۔ اس سے قُصَیّ [رَکَ بآن] پیدا ہوے۔ [قُصَیّ جوان ہوکر اپنے قبیلے میں واپس آ گئے۔ اس زمانے میں حُلَیْل بن حُبْشِیَّۃ بن سَلُول بیت اللہ کا متولّی و حاجب تھا۔ اس نے اپنی بیٹی حُبّٰی بنت حُلَیْل کی شادی قصی کے ساتھ کر دی۔ حُلَیْل بوڑھا ہوگیا تو اس نے خانۂ کعبہ کی کنجیاں اپنی بیٹی حُبّٰی کے سپرد کر دیں]۔ اس طرح بنو اسمٰعیل کو مکرر کعبے کے انتظام میں شرکت ملی۔ خسر کی وفات کے بعد قصی نے اپنے ننھیال (بنو قضاعہ) کی مدد سے بنو خزاعہ کو مجبور کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر مضافات میں جا بسیں (البلاذری: انساب الاشراف، ۱ : ۴۹ تا ۵۰)۔ السہیلی (۱ : ۹۷) کے مطابق خزاعی سردار الحارث بن مُضاض الاصغر (قصی کے ہمعصر؟) نے کعبے کے قیمتی چڑھاووں کو چاہ زمزم میں ڈال کر اسے پاٹ دیا اور کنواں صدیوں غائب رہا۔ [قُصَی کو بڑا اقتدار حاصل ہوا۔ اس کی اولاد بہت پھلی پھولی اور وہ قوم کا بہت بڑا سردار تسلیم کیا گیا]۔

قصی نے مکے میں ایک شہری مملکت کا آغاز کیا ۔ وہاں دارالنّدوہ (پارلیمنٹ) اور رفادہ (ٹیکس) کے نئے ادارے قائم کیے ، لیکن اپنی وفات پر حکومت اپنے بچوں میں بانٹ دی ۔ کسی کو کعبے اور اس کی چابی کی رکھوالی دی ، کسی کو فوج کی قیادت ، کسی کو ٹیکس کا آمد و خرچ ۔ بعد کی نسلوں میں انتظامات کی مزید تقسیم در تقسیم ہوئی ۔ آغاز اسلام کے وقت وہاں دس سرداروں کی ایک مجلس کار فرما نظر آتی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ : "شہری مملکت مکہ"، در ماہنامہ معارف ، اعظم گڑھ ، جنوری فروری ۱۹۴۲ء) ۔ [قصی کے چار بیٹے تھے، جن میں عبد مناف بڑے نامور اور صاحب عزت و شرف گزرے ہیں] ۔ عبد مناف کے بھی چار بیٹے تھے، جن میں ہاشم ناموری اور شہرت میں سب پر سبقت لے گئے۔

ہاشم کا اصلی نام عمرو تھا ۔ وہ بڑے دولت مند رئیس ہونے کے ساتھ جود و سخاوت اور مروت و احسان میں بھی بے مثال تھے ۔ ہاشم کہلانے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے عہد میں مکّۂ مکرمہ میں سخت قحط پڑ گیا۔ وہ فلسطین جا کر آٹے کی بوریاں بڑی تعداد میں اونٹوں پر لاد کر لائے ۔ بہت سے اونٹ ذبح کر کے شوربا تیار کیا اور روٹیاں پکا کر اس شوربے میں بھگو بھگو کر تمام اہل شہر کو کھانا کھلاتے رہے ۔ عرب ایسے کھانے کو ھشیم اور ثرید کہتے ہیں ۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا اور اسی وجہ سے ان کا نام ہاشم پڑ گیا۔ وہ حاجیوں کی خدمت اور مہمان نوازی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ۔ اس سخاوت اور فیاضی سے ہاشم کا نام چار دانگ عرب میں مشہور ہو گیا۔ ذاتی اثر و رسوخ اور وجاہت کی وجہ سے ان کی دوسرے ممالک کے درباروں میں بھی رسائی تھی ۔ قریش کے تجارتی قافلے بیرونی ممالک میں آتے جاتے تھے ؛ چنانچہ] انھوں نے تقریباً ۴۶۶ء میں فلسطین کا سفر کیا اور مقامی (بوزنطی) افسروں سے اجازت حاصل کی کہ مکی کاروان رومی علاقے میں تجارت کے لیے آیا کریں ۔ اس کے بعد راستے کے عرب قبائل سے بھی عبور و مرور کے لیے معاوضہ دے کر معاہدے کیے ۔ پھر مکے سے ایک بڑا قافلہ فلسطین گیا ۔ راستے میں ہاشم نے مدینے میں [بنو نجّار کی] سلمٰی [بنت عمرو بن زید النجارية] سے شادی کی، مگر آگے گئے تو غزہ پہنچنے پر اچانک وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ۔ ہاشم کی وفات پر ان کے بڑے بھائی مطلب نے یمن کا، دوسرے بھائی عبد شمس نے حبشہ کا اور تیسرے بھائی نوفل نے عراق کا سفر کر کے وہاں کے حکمرانوں سے بھی اپنے تجارتی کاروانوں کے آنے جانے کی اجازتیں حاصل کیں اور اس طرح مکۂ مکرمہ بین الممالک تجارت کا مرکز بن گیا (تفصیل کے لیے دیکھیے ارمغان ماسینون (Massignon) اور اس کا ملخص ترجمہ البلاغ، کراچی، جون ۱۹۶۸ء، بعنوان "ایلاف : جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات")؛ [نیز رک بہ ایلاف] ۔ اس سے وہاں کی عبادت گاہ کعبہ کی زیارت و حج عام ہو گئے اور مکی زبان بھی ملک کے چاروں اطراف میں زیادہ سمجھی جانے لگی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان قریشی کاروانوں اور سالانہ میلوں نے ، جن میں قریش کو سرمایہ دارانہ تجارت، نیز قافلوں کی حفاظت کے لیے بدرقوں (خفارہ) کے انتظام کے سلسلے میں بہت اہم حیثیت حاصل تھی ، جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی وفاق (فیڈریشن) پیدا کر دیا (اور مکہ مکرمہ اس کا مرکز بنا)، جس نے سیاسی مرکزیت کا راستہ کھولا جو کہ اسلام کا کارنامہ بننے والا تھا۔

ہاشم کی وفات (۴۶۷ء) کے چند ماہ بعد ان کی بیوی سلمٰی کے ہاں مدینۂ منورہ میں شیبہ (عبدالمطلب) پیدا ہوئے ۔ [البلاذری (انساب الاشراف، ۱ : ۶۴) وغیرہ ہاشم کی وفات عبدالمطلب کی پیدائش سے پہلے بیان کرتے ہیں، لیکن ابن سعد اور ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب اپنے باپ ہاشم کی وفات سے پہلے

پیدا ہو چکے تھے (طبقات، ۱ : ۷۹؛ بیروت ۱۹۶۰ء؛ ابن خلدون : تاریخ، اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ، ۱ : ۲۷۶)۔ بچے کے سر میں کچھ بال سفید تھے ، اس لیے اس کا نام شیبہ (بوڑھا) رکھا گیا ۔ تقریباً سات برس کی عمر تک عبدالمطلب اپنی والدہ کے پاس اپنے ننھیال میں رہے ۔ پھر ان کے چچا مُطَّلب انھیں مکۂ مکرمہ اپنے پاس لے آئے۔ یاد رہے کہ ہاشم کی وفات کے بعد رفادہ و سقایۃ ، یعنی حُجّاج کی مہمان نوازی اور پانی پلانے کی خدمت ، مطّلب کے سپرد ہوئی تھی۔ مطّلب بھی اپنے بھائی ہاشم کی طرح اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ۔ بقول ابن خلدون، مُطّلب بڑی عزت و فضیلت کے مالک تھے اور ان کی سخاوت کی وجہ سے قریش انھیں الفضل، یعنی پیکر فضیلت کہا کرتے تھے .

مُطّلب کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے معاملات کو عبدالمطلب نے سنبھالا اور رفادہ و سقایۃ کی خدمت بطریق احسن انجام دینے لگے۔ انھوں نے یمن اور حبشہ کے درباروں میں اپنی قوم کی نمائندگی بھی کی] ۔

ان کی ملکیت میں ایک قدرتی چشمہ بھی تھا (البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۷۴-۷۵) ۔ بات یہ ہوئی ایک دن خواب میں اشارہ پایا کہ فلاں جگہ کھود کر صدیوں سے غائب شدہ چاہ زمزم برآمد کریں ۔ اس کے اندر سے دفینہ بھی ملا جو کعبے کے پرانے چڑھاووں پر مشتمل تھا (ابن ہشام ، ص ۹۱ ببعد) ۔ چاہ زمزم کی ملکیت سے سقایۃ الحاج کے عہدے کی اہمیت بڑھی اور ان کی وجاہت میں اضافہ بھی ہوا ۔ عبدالمطلب اور مکی رؤسا ابرھہ حبشی (اصحاب الفیل) کے مکے پر حملے کے خلاف کچھ نہ کر سکے، لیکن عبدالمطلب کے سر برآوردہ ہونے کا پتا اس سے چلتا ہے کہ جب ابرھہ قدرتی حوادث کا شکار ہو کر اور کثیر جانی نقصان کے ساتھ بھاگا اور پھر جلدی ہی یمن میں مر بھی گیا اور قومی آزادی کی کوشش میں یمن کو فی الجملہ کامیابی حاصل ہوئی ، حبشیوں کو نکال باہر کیا گیا اور سیف بن ذی یزن [رَک بآن] آزاد یمن کا بادشاہ بن گیا تو اس پر مبارکباد دینے کے لیے مکے سے جو وفد گیا اس کی طرف سے اظہار مطلب کا کام جناب عبدالمطلب نے انجام دیا تھا (ابن حبیب: المنمق، ص ۵۴۰ ؛ ابن عبد ربہ : العقد الفرید، ۱ : ۱۷۱ ؛ الاغانی ۲۱ : ۷۵ ببعد) ۔ عبدالمطلب کو شاہی تحفوں میں خضاب بھی ملا ، جس سے اہل مکہ ناواقف تھے (البلاذری : انساب، ۱/۶۵-۶۶).

[آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے دادا عبدالمطلب اپنے اسلاف کی طرح بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ جود و سخا اور فیاضی میں سارے عرب میں مشہور تھے۔ بیت اللہ کے زائرین کی خدمت کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتے، بے کسوں اور مظلوموں کی فریاد رسی اور اعانت میں کبھی سستی نہ کرتے اور انسانوں کے علاوہ جانوروں کے لیے بھی خوراک مہیا کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے ۔ اخلاق فاضلہ اور محاسن عالیہ کے پیکر تھے اور اخلاق رذیلہ اور پست خیالات سے خود بھی ہمیشہ بچتے اور اپنی اولاد کو بھی ان سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے ۔ ان کی دینداری اور پرہیزگاری بھی قابل ذکر ہے ۔ آخری عمر میں بت پرستی اور شرک کو بالکل چھوڑ دیا تھا ۔ ملت ابراھیمی اختیار کرکے پکے موحد بن گئے تھے ۔ شراب نوشی ، زناکاری ، ظلم و سرکشی اور برھنہ ہو کر طواف کعبہ کرنے سے منع کیا کرتے تھے ۔ مزید برآں وہ مستجاب الدعوات بھی تھے ۔ ان اوصاف و کمالات کی بنا پر لوگ انھیں الفیاض اور شیبۃ الحمد کے معزز القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ (محمود شکری الآلوسی : بلوغ الارب ، ۱ : ۳۵۵)].

عبدالمطلب کو زمزم کی ملکیت کے لیے بڑی دشواریاں پیش آئیں، (مگر اہل شہر امن پسند تھے اور اسے قبول کرلیا کہ کسی غیرجانبدار حکم سے فیصلہ

کرائیں) ۔ اس پریشانی کے زمانے میں منت مانی کہ اگر خدا نے مجھے دس بیٹے دیے اور وہ بلوغ کو پہنچے تو میں ان میں سے ایک کو کعبے میں لے جا کر اللہ کے حضور میں قربان کر دونگا (ابن ہشام، ص ۱ : ۱۶۰ ببعد؛ البلاذری : انساب، ۱ : ۷۹) ۔ جب دسویں بیٹے بھی بلوغ کو پہنچ گئے تو جناب عبدالمطلب نے منت یاد کی اور قرعہ ڈال کر قربانی کے بیٹے کا انتخاب کیا۔ قرعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے والے باپ جناب عبداللہ کے نام نکلا۔ عبدالمطلب کا عزم دیکھ کر رشتہ داروں اور دوستوں نے مداخلت کی اور انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ کسی کاھنہ یا عرافہ سے حل معلوم کیا جائے؛ چنانچہ (بروایت السہیلی) قطبہ یا سجاح نامی کاھنہ سے ملنے یثرب (مدینہ) گئے۔ اس زمانے میں وہ خیبر میں تھی ۔ وہاں پہنچے تو اس نے قصہ سن کر مشورہ دیا کہ بیٹے اور رواجی خون بہا کے مابین قرعہ ڈالو اور خون بہا کی مقدار میں اضافہ کرتے جاؤ تا آنکہ قرعہ خون بہا پر نکلے۔ آخر دس کی جگہ سو اونٹوں پر قرعہ بیٹے کی بجائے خون بہا پر نکلا ۔ جناب عبدالمطلب نے احتیاطاً تین بار قرعے کی تکرار کرکے اطمینان کر لیا کہ واقعی وہ اللہ کو منظور ہے ۔

[جناب عبدالمطلب کثیرالاولاد تھے۔ ان کی حسب ذیل چھے بیویاں تھیں، جن کے بطون سے بارہ اور بقول ابن سعد تیرہ بیٹے اور چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں: (۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم ؛ اولاد : عبداللہ ، زبیر ، ابو طالب (عبد مناف) ، عبدالکعبہ، ام حکیم البیضاء ، عاتکہ، برّہ، امیمہ، اروی؛ (۲) بنو عامر بن صعصعہ کی صفیہ بنت جنیدب بن حجیر؛ اولاد : الحارث؛ (۳) ہالۃ بنت وہیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب؛ اولاد : حضرت حمزہؓ، حضرت صفیہؓ، المقوّم، حَجل؛ (۴) نُتَیلہ بنت جناب بن کلیب؛ اولاد : عباسؓ، ضرار، قُثَم؛ (۵) لُبنیٰ بنت الھاجر؛ اولاد : ابولہب (جمہرۃ انساب العرب، ص ۱۵) ؛ (۶) مُمَنّعَۃ بنت عمرو بن مالک؛ اولاد : الغَیداق (مصعب) (انساب الاشراف، ۱ : ۷۱ ؛ طبقات، ۱ : ۹۳) .

عبدالمطلب نے خاصی طویل عمر پائی ۔ ان کا ایک شاندار کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے زمزم کا چشمہ دوبارہ کھود کر جاری کیا ۔ اس میں سے سونے کے دو ہرن اور چند تلواریں نکالیں۔ ہرنوں سے کعبے کی زینت کے لیے سونے کا پترا تیار کیا اور تلواروں سے کعبے کے لیے لوھے کا دروازہ بنایا ۔ کعبے کی زیبائش کے سلسلے میں سونا استعمال کرنے کے شرف کی اولیت جناب عبدالمطلب کو حاصل ہوئی ۔ عبدالمطلب ہی نے زمزم کے ساتھ ایک حوض بنایا تاکہ لوگ اس سے پانی پی سکیں .

عبدالمطلب کے بیٹے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے والد محترم جناب عبداللہ اور آپؐ کی پھوپھی ام حکیم البیضاء جڑواں (توأم) پیدا ہوئے تھے ۔ جناب عبداللہ اپنے باپ کے بڑے لاڈلے اور محبوب بیٹے تھے ۔ وہ حسن سیرت اور حسن صورت کا بڑا حسین امتزاج تھے ۔ ان کے اخلاق حمیدہ، اوصاف جمیلہ اور پاکبازی کا شہرہ تھا ۔ اٹھارہ سال (اور بعض نے پچیس سال یا کم و بیش بھی لکھے ہیں) کی عمر میں عبدالمطلب نے بنو زُہرہ کی نیک اور پاکباز خاتون حضرت آمنہ بنت وھب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّۃ سے جناب عبداللہ کا نکاح کر دیا ۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت آمنہ کے دادا عبد مناف اور عبدالمطلب کے دادا عبد مناف دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں ۔ اول الذکر عبد مناف بن زہرہ ہیں اور ثانی الذکر عبد مناف بن قصی ہیں ۔ قصی اور زہرہ دونوں بھائی اور کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب کے بیٹے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ددھیال اور ننھیال دونوں کلاب بن مرّہ پر مل جاتے ہیں .

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی دادی کا نام فاطمہ بنت عمرو بن عائذ اور نانی کا بَرّہ بنت عبد العزیٰ بن عثمان تھا ۔ آپؐ کے نانا وھب بن عبد مناف کی والدہ کا نام ھند بنت ابی قیلہ (وجز) بن غالب تھا (انساب الاشراف ، ۱ : ۹۱) ۔ آپؐ کے نانا وھب بنو زھرہ کے نامور اور معزز سردار تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ طہارت نفس، شرافت نسب، عزت و وجاھت، عفت و عصمت اور پاکبازی میں بے مثال تھیں اور اپنی قوم میں سیدۃ النساء کے لقب سے مشہور تھیں ۔ بقول ابن کثیر (السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۱۷۷)، وَ ھِی یومئذٍ سیدۃُ نساءِ قومِھا، یعنی حضرت آمنہ اس وقت اپنی قوم میں سیدۃ النساء تھیں اور بقول الطبری (تاریخ، ۲ : ۱۷۴)، وھی یومئذٍ افضل امراۃ من قریش، یعنی حضرت آمنہ اپنے زمانے میں قریش کی سب سے زیادہ فضیلت مآب اور محترم خاتون تھیں ۔ ددھیال اور ننھیال دونوں کے اعتبار سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم عرب کے بہترین قبیلے اور بہترین قوم میں سے تھے ۔

نکاح کے بعد جناب عبداللہ قریش کے دستور کے مطابق چند روز اپنے سسرال میں رہنے کے بعد اپنی زوجہ سیدہ آمنہ کو لے کر اپنے گھر چلے آئے ۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد جناب عبداللہ تجارت کے سلسلے میں قریش کے ایک قافلے کے ساتھ ملک شام میں گئے اور غزہ سے واپس گھر آرہے تھے کہ راستے میں بیمار ھو گئے ۔ راستے میں یثرب (مدینہ منورہ) پڑتا تھا اور وھاں ان کے والد عبدالمطلب کے رشتے دار (اخوال) بنو عدی بن النّجار رھتے تھے ۔ حضرت عبداللہ بحالت بیماری ان کے ھاں ٹھیر گئے ۔ قافلے والوں نے مکۂ مکرمہ پہنچ کر عبدالمطلب کو جناب عبداللہ کی علالت اور مدینے میں رک جانے کے بارے میں اطلاع دی ۔ عبدالمطلب نے اپنے بڑے بیٹے حارث کو جناب عبداللہ کے پاس مدینے بھیجا ۔ حارث بڑی تیزی سے منزلیں طے کرتا ھوا مدینے پہنچا تو بنو عدی بن النجار نے اسے جناب عبداللہ کی علالت کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ وفات پا چکے ھیں اور یہ کہ انھیں دارالنابغہ میں دفن کیا جا چکا ھے ۔ حارث نے واپس مکے آکر اپنے باپ کو حالات سے آگاہ کیا ۔ پردیس میں جوان بیٹے کی موت نے عبدالمطلب کو محزون و مغموم کر دیا ۔ جوان عبداللہ کی وفات سے سارا خاندان رنج و ملال اور غم و اندوہ کا شکار ھو گیا ۔ حسن صورت اور حسن سیرت کا مجسمہ، جس سے شادی کرنے کے لیے مکے کی کئی خواتین بے قرار تھیں، دنیا سے اچانک عالم شباب میں رخصت ھوگیا ۔ سیدہ آمنہ پر یہ اندوھناک اور دلخراش خبر سن کر کیا گزری ھوگی ، جن کا رفیق زندگی شادی کے چند ماہ بعد ھی انھیں ھمیشہ کے لیے غمزدہ اور افسردہ چھوڑ گیا ؛ مگر سیدہ آمنہ صبر و رضا اور ھمت و استقامت کا پیکر تھیں ۔ اللہ تعالی نے انھیں خاتم النبین سیدالمرسلین، رحمۃ للعٰلمین کی امومت کا شرف بخشنا تھا ۔ راضی برضاے الٰہی ھوکر وہ صبر و شکر کی مثال بن گئیں ۔ جناب عبداللہ کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیدائش سے تقریباً سات ماہ قبل ھوئی ۔ وفات کے وقت جناب عبداللہ کی عمر اٹھارہ برس تھی، مگر الواقدی نے پچیس سال لکھی ھے (طبقات، ۱ : ۹۹ ؛ ابن الجوزی : الوفاء، ۱ : ۸۹) ۔ کتب سیرت میں ایسی روایات بھی موجود ھیں جو جناب عبداللہ کی وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بعد (باختلاف مدت) بیان کرتی ھیں (دیکھیے البلاذری: انساب الاشراف، ۱ : ۹۲ ؛ الطبری، ۱ : ۹۸) ۔ ابن سعد نے طبقات (۱ : ۱۰۰) میں مختلف روایات ذکر کرنے کے بعد وفات قبل از ولادت ھی کو صحیح قرار دیا ھے ۔

آپؐ کی ولادت سے پہلے ایک اور اھم واقعہ

پیش آیا اور وہ تھا اصحاب الفیل [رک بآں] کا مکۂ مکرمہ پر حملہ ۔ یمن کے حبشی حاکم ابرھہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت سے پچاس پچپن دن پہلے ماہ محرم میں ھاتھیوں کے ساتھ بلدالحرام پر حملہ کیا تھا ۔ عربوں کے ھاں اس سال کو عام الفیل کہتے ھیں اور ایک عرصے تک یہی تقویمی سال شمار ھوتا رھا ۔

ولادت نبوی : ھمارے رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت با سعادت موسم بہار میں دو شنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ عام الفیل/۵۷۱ء کو مکہ مکرمہ میں ھوئی ۔ تاریخ انسانیت میں یہ دن سب سے زیادہ با برکت، سعید اور درخشاں و تابندہ تھا ۔ آپؐ کی ولادت کے سلسلے یہ بات قطعی اور یقینی ھے کہ ربیع الاول کا مہینہ اور دو شنبہ کا دن تھا اور وقت بعد از صبح صادق و قبل از طلوع آفتاب۔ دو شنبہ کا دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک زندگی میں بڑی اھمیت کا حامل ھے ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دو شنبہ کو پیدا ھوے؛ دو شنبہ کے دن آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا؛ دو شنبہ کو مکے سے مدینے کو ھجرت کے لیے نکلے اور دو شنبہ کو آپؐ مدینے میں (شاید قُباء مراد ھے جو مضافات مدینہ میں ھے) تشریف فرما ھوے ؛ دو شنبہ کے دن آپ نے اس دار فانی کو خیر باد کہا اور دو شنبہ کے دن ھی آپؐ نے حجراسود کو (۳۵ برس کی عمر میں) بیت اللہ میں نصب فرمایا تھا (ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۱۹۸) ۔ ایک روایت میں دو شنبہ کے ساتھ ۱۲ ربیع الاول کا بھی ذکر ھے اور ساتھ ھی معراج نبوی کا دن بھی دو شنبہ بتایا گیا ھے ۔ (کتاب مذکور، ۱ : ۱۹۹) ۔ جمہور کے نزدیک ولادت مبارک کی تاریخ قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاول ھے، مگر کتب سیرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے سلسلے میں اور تاریخیں بھی مذکور ھیں ۔ شبلی نعمانی نے سیرت النبی (۱ : ۱۷۱) میں مصر کے مشہور ھیئت دان محمود پاشا فلکی کی تحقیقات کے پیش نظر ۹ ربیع الاول/۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ترجیح دی ھے ۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری نے اپنی کتاب رحمۃ للعٰلمین (۱: ۴۰) میں آپؐ کی پیدائش ۹ ربیع الاول عام الفیل / ۲۲ اپریل ۵۷۱ء / یکم جیٹھ ۶۲۸ بکرمی قرار دی ھے ۔ اس وقت شاہ ایران نوشیروان کے جلوس تخت کا چالیسواں سال تھا اور اسکندر ذوالقرنین کی تقویم کی رو سے سنہ ۸۸۲ تھا ۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۷ جون ۵۶۹ء (دیکھیے *Muhammad Rasulullah*، ص ۱ ، کراچی ۱۹۷۹ء ؛ وھی مصنف ، در *Journal of Pak. Historical Society*، ۱۹۶۸ء کراچی ، ۱۶ : ۲۱۶ تا ۲۱۹) ، نیز ۵۷۰ء (وھی مصنف : *Le Prophete de l'Islam*، ۱:۳۷، پیرس ۱۹۵۹ء) قرار پاتی ھے]۔

تاریخ بڑے لوگوں، خاص کر انبیاء کی ولادت کے وقت عام طور پر عجیب و غریب واقعات کے پیش آنے کا بھی ذکر کرتی ھے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت مبارک سے پہلے بھی اسی قسم کی روایات ملتی ھیں ۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت مبارک سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے عجیب و غریب خواب دیکھے، جن سے آپؐ کی عظمت و جلالت پر روشنی پڑتی ھے ۔ جب آپؐ شکم مادر میں تھے تو سیدہ آمنہ نے ایک نور دیکھا جو شام کے محلات کو روشن کر رھا تھا۔ یہی نور آپؐ کی ولادت کے وقت انھوں نے فی الواقع بچشم خود ملاحظہ کیا ۔ علاوہ ازیں جو خواتین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت با سعادت کے وقت سیدہ آمنہ کے پاس موجود تھیں، مثلاً عثمان بن ابی العاص کی والدہ فاطمہ بنت عبداللہ، وہ بیان کرتی

ہیں کہ اس مبارک ساعت میں تمام گھر نور سے بھر گیا ۔ اسی طرح حضرت عبدالرّحمٰنؓ بن عوف کی والدہ الشّفّاء کہتی ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت کے وقت بطور دایہ (قابلۃ) خدمات انجام دیں اور کسی کو یہ کہتے سنا کہ آپؐ سے ایسا نور روشن ہوا جس سے روم کے محلات نظر آئے (ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۰۶، ۲۰۷ ؛ ابن الجوزی : الوفاء باحوال المصطفی، ۱ : ۹۴، ۹۵) ۔ حافظ ابن حجر العسقلانی (فتح الباری، ۶ : ۴۲۶) نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ آپؐ کی ولادت کے وقت ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، آتش کدے بجھ گئے اور بحیرہ ساوہ (طبریہ) خشک ہو گیا (نیز دیکھیے ابن ہشام : سیرۃ؛ ابن الجوزی : الوفاء، ۱ : ۹۷؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت کے بارے میں آیات و نشانات اور یہود یثرب کی پیش گوئیوں، نیز راہبوں اور عیسائی مذہبی راہنماؤں کے اقوال و افکار کے لیے دیکھیے ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۱۱ تا ۲۲۱)] .

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اہم واقعات رونما ہوئے : (۱) کسریٰ نے ہولناک خواب دیکھا جس میں اس کی حکومت کی بربادی اور اسلامی فتوح کی پیشین گوئی تھی ؛ مزید برآں اسی زمانے میں ایران میں ایک زلزلہ آیا جس میں قصر شاہی کے کنگرے گر گئے ، پائے تخت میں صدیوں سے جلتا ہوا آتشکدہ بجھ گیا ، ایک جھیل سوکھ گئی ، ایک صحرا میں ایک ندی پیدا ہو گئی، وغیرہ (ابن ہشام)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ولادت کے سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں وہ طویل روایت ہے جو الزرقانی نے نقل کی ہے (دیکھیے شرح المواھب، ج ۱).

عالم مثال کے ان مظاہر یا مکاشفات میں واقعات کا مطالعہ کرنے والے کے لیے کافی غذائے فکر ہے ۔ دنیا کے دو بڑے ممالک کے سربراہوں، یعنی قیصر روم اور کسریٰ ایران کو خواب میں تنبیہ کی گئی کہ اپنی اصلاح کر لو ۔ ان کے لیے یہ خواب نہ صرف ان کے ظالمانہ طرز حکومت کے اختتام کی دھمکی تھی ، بلکہ ان کے (عیسائی اور مجوسی) دینوں میں اس وقت انسانی عناصر نے جو روز افزوں دخل پا لیا تھا اس پر یہ خدا کی ناراضی کا اعلان بھی تھا ۔ ان "بڑوں" کو تقریباً نصف صدی کی مہلت دی گئی ۔ جب وہ درست نہ ہوئے تو چشم زدن میں دونوں سلطنتیں اور دونوں دین گویا ناپید کر دیے گئے .

بت اوندھے گرے ۔ یہ سارے ہی بت تھے ۔۔ خدا کو نہ ماننے والوں کے بھی، خدا کی خدائی میں غیروں کو شریک کرنے والوں کے بھی اور خدائے کائنات کو ایک خانوادے کے افراد سے مختص کرنے والوں کے بھی ۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ ہی میں نہیں، آج بھی سارے ادیان اسلام ہی کو اپنا واحد اور سب سے بڑا حریف سمجھتے ہیں ۔۔ چاہے شیوعیت ہو یا نصرانیت یا یہودیت .

[جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی ولادت کی اطلاع آپؐ کے معمّر دادا جناب عبدالمطلب کو دی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے ، کیونکہ آپؐ ان کے مرحوم پیارے فرزند جناب عبداللہ کی یادگار تھے۔ اپنے نوجوان بیٹے کی اچانک وفات سے ضعیف العمر باپ کو جو شدید صدمہ ہوا تھا ، آپؐ کی ولادت سے ایک حد تک اس کا ازالہ ہو گیا ۔ جناب عبدالمطلب کے دوسرے بیٹوں کو بھی بڑی خوشی ہوئی۔ آپؐ کے چچا ابولہب [رک باں] کی لونڈی ثُوَیبہ نے جب آپؐ کی ولادت کی خوش خبری اپنے مالک کو سنائی تو ابولہب نے خوش ہو کر اسے آزاد کر دیا ۔ عبدالمطلب خوشی خوشی پوتے کو دیکھنے کے لیے گھر آئے ۔ آپؐ کو گود میں اٹھا کر یمن و برکت کے لیے خانۂ کعبہ میں لائے اور آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں ۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر

ادا کرتے ہوے آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس واپس لے آئے۔ سیدہ آمنہ نے انھیں ان خوابوں سے بھی آگاہ کیا تھا جو سیّدہ نے حضور علیہ الصّلوۃ والسّلام کی پیدائش سے پہلے دیکھے تھے (ابن کثیر: السیرۃ النبویہ، ۱: ۲۰۸، ۲۲۴؛ ابن الجوزی: الوفاء باحوال المصطفیٰ، ۱: ۹۵، ۹۶)۔

دستور کے مطابق سب سے پہلے آپؐ کی والدہ ماجدہ سیّدہ آمنہ نے آپؐ کو تقریباً سات روز تک دودھ پلایا۔ اس کے بعد چند روز تک ثویبہ (مولاۃ ابی لہب) نے آپؐ کو دودھ پلایا اور یہ واقعہ حلیمہ سعدیہ [رک بآں] کی سپردگی سے پہلے کا ہے۔ اس وقت ثویبہ کی گود میں ان کا بیٹا مسروح تھا۔ اس سے قبل وہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب [رک بآں] کو بھی دودھ پلا چکی تھیں۔ پھر ابو سلمہ عبداللہ بن عبدالاسد المخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا۔ اس طرح مسروح، حضرت حمزہؓ اور حضرت ابو سلمہؓ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے رضاعی بھائی ٹھیرے۔ قیام مکہ کے دوران میں، جب کبھی وہ آپؐ سے ملنے آتیں تو آپؐ اور حضرت خدیجہؓ دونوں ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے (الوفاء باحوال المصطفیٰ، ۱: ۹۷)۔ ہجرت کے بعد بھی آپؐ اپنی اس رضاعی ماں کے بارے میں، جو مکّے میں رہائش پذیر تھیں، اکثر دریافت فرماتے رہتے تھے اور تحفے تحائف بھی بھیجتے رہتے تھے، یہاں تک کہ ۷ھ میں خیبر سے واپسی پر آپؐ کو ان کی وفات کی خبر ملی۔ اُن کا بیٹا مسروح اپنی والدہ سے پہلے ہی وفات پا چکا تھا (البلاذری: انساب، ۱: ۹۴، ۹۶؛ السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۲۴؛ الروض الانف، ۱: ۱۰۸)۔ ثویبہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ذہبی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور امام السیوطی کا میلان ان کے اسلام لانے کی طرف ہے۔

سنت ابراہیمیؑ کے مطابق عربوں، بالخصوص قریش مکہ میں عقیقہ کرنے کا دستور تھا؛ چنانچہ جناب عبدالمطلب نے ساتویں دن اپنے لاڈلے پوتے کا عقیقہ کیا اور ختنہ کرایا (آپؐ کے مختون پیدا ہونے کی روایات بھی منقول ہیں)۔ اس موقع پر جانور ذبح کر کے قریش کو کھانے کی دعوت بھی دی۔ کھانے کے بعد قریش نے پوچھا: اے عبدالمطلب! آپ نے اپنے جس بیٹے کے لیے ہماری ضیافت کی ہے اس کا نام کیا رکھا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کا نام محمّدؐ رکھا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آسمان میں اللہ اور زمین میں اس کی مخلوق آپؐ کی تعریف کرے۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ محمّدؐ کا مفہوم ہے تمام صفات خیر اور اوصاف حمیدہ کا جامع۔ یہ بھی روایات ہیں کہ آپؐ کا اسم گرامی محمّد الہامی ہے، نیز آپؐ کی والدہ ماجدہ نے خالق حقیقی کی طرف سے اشارہ پا کر آپؐ کا نام احمد رکھا (ابن سعد: طبقات، ۱: ۱۰۴؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱: ۲۰۶، ۲۱۰؛ عیون الاثر، ۱: ۳۰)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے اسماے گرامی محمّدؐ اور احمدؐ کا مادہ حمد ہے اور حمد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے اخلاق حسنہ، اوصاف حمیدہ، کمالات جمیلہ اور فضائل ومحاسن کو محبت، عقیدت اور عظمت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اسم پاک محمّدؐ مصدر تحمید (باب تفعیل) سے مشتق ہے اور اس باب کی خصوصیت مبالغہ اور تکرار ہے۔ لفظ محمّد اسی مصدر سے اسم مفعول ہے اور اس سے مقصود وہ ذات بابرکات ہے جس کے حقیقی کمالات، ذاتی صفات اور اصلی محامد کو عقیدت و محبت کے ساتھ بکثرت اور بار بار بیان کیا جائے۔ لفظ محمّد میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ وہ ذات ستودہ صفات جس میں خصال محمودہ اور اوصاف حمیدہ بدرجۂ کمال اور بکثرت موجود ہوں۔ اسی طرح احمد اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک اسم مفعول کے معنی

میں۔ اسم فاعل کی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کرنے والا اور مفعول کی صورت میں سب سے زیادہ تعریف کیا گیا اور سراہا گیا (الروض الانف، ۱:۱۰۶؛ فتح الباری، ۶:۴۰۳؛ لسان العرب اور تاج العروس، بذیل مادہ) ۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں صرف چند اشخاص ایسے ملتے ہیں جن کا نام محمّد تھا ۔ لسان العرب اور تاج العروس میں سات آدمیوں کے نام ضبط کیے گئے ہیں اور بعض نے زیادہ بھی نقل کیے ہیں ۔ ان لوگوں کے والدین نے اہل کتاب سے یہ سن کر کہ جزیرۃ العرب میں ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے جس کا نام محمّد ہوگا، اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے یہ نام رکھ لیا؛ البتہ کسی نے احمد نام نہیں رکھا ۔ مشیّت الٰہی دیکھیے کہ محمد نام کے ان لوگوں میں سے کسی نے بھی نبوّت و رسالت کا دعویٰ نہیں کیا (فتح الباری، ۷: ۴۰۴، ۴۰۵) ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا اسم گرامی احمد قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ مذکور ہے اور وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی پیشگوئی کے طور پر: وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ (۶۱ [الصف]:۶)، یعنی میں (عیسیٰ) اس پیغمبر کی بشارت سناتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا ۔ آپؐ کا اسم گرامی محمّدؐ چار مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے اور ہر مرتبہ آپؐ کے منصب رسالت کے سیاق و سباق میں: (۱) وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج (۳ [آل عمران] : ۱۴۴)، یعنی محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم تو اللہ کے رسول ہیں؛ (۲) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (۳۳ [الاحزاب]: ۴۰)، یعنی محمّد صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور انبیاءؑ (کی نبوت) کی مہر یعنی اس کو ختم کر دینے والے ہیں؛ (۳) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ لا كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ [محمّد]: ۲)، یعنی اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو (کتاب) محمّدؐ پر نازل ہوئی اسے مانتے رہے اور وہ ان کے ربّ کی طرف سے برحق ہے ان سے ان کے گناہ معاف کر دیے اور ان کی حالت سنوار دی؛ (۴) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۴۸ [الفتح] : ۲۹)، یعنی محمّد اللہ کے رسول ہیں۔ ان چاروں آیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا نام لے کر آپؐ کی رسالت و نبوّت کے منصب کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے تاکہ کسی قسم کے شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

اسی مناسبت کی بنا پر آپؐ نے اور آپؐ کی امّت نے دنیا کی تمام قوموں اور امتوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کی اور قیامت تک کرتی رہے گی؛ ہر کام کے آغاز و اختتام پر اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد کا حکم دیا گیا اور امت کا ہر فرد یہ فریضہ انجام دے رہا ہے ۔ بالکل اسی طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے محامد و محاسن اور خصال محمودہ، اوصاف حمیدہ اور فضائل و کمالات کا بیان اور ذکر جس کثرت سے کیا گیا ہے اور ابد تک کیا جاتا رہے گا اس کی مثال بھی دنیا میں نہیں مل سکتی ۔

امام ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے ختنے کے بارے میں تین اقوال ہیں: (۱) آپؐ مختون پیدا ہوئے؛ (۲) مائی حلیمہ سعدیہ کی حضانت کے دوران میں جب فرشتوں نے شق صدر کیا تو ختنہ بھی کر دیا؛ (۳) آپؐ کا ختنہ آپؐ کے دادا عبدالمطّلب نے کیا اور یہ بات عربوں کے دستور عام کے مطابق تھی (زاد المعاد، مطبوعہ قاہرہ، ۱:۱۹) ۔ ابن کثیر نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے مختون و مسرور پیدا ہونے سے متعلق کئی روایات نقل کی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ مختلف طریقوں

سے مروی روایات کی بنا پر بعض حضرات نے اسے متواتر کا درجہ دیا ہے؛ علاوہ ازیں دوسری دونوں روایتیں بھی نقل کی ہیں (السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۰۸، ۲۰۹؛ نیز دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ۱: ۱۰۳)، البتہ ابن الجوزی نے بڑے جزم سے لکھا ہے کہ آپ مختون و مسرور پیدا ہوے (الوفاء، ۱ : ۹۷)] .

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی وفات پر کہے ہوے مرثیے میں حضرت حسّانؓ بن ثابت نے محمّدؐ اور احمدؐ دونوں نام بطور مترادف کے استعمال کئے ہیں - شاخت Schacht کی علم عروض سے قطعی نا واقفیت تھی کہ اس نے اپنے مقالے [رک بہ احمد، در ۱۱، لائیڈن، بار دوم] میں محض قیاساً یہ لکھا ہے کہ حضرت حسّانؓ نے وزن شعر کی ضرورت سے محمد کی جگہ احمد کا لفظ قافیے میں استعمال کیا ہے - اول تو شاخت نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ مذکورہ مرثیے کی ایک بیت میں احمد ہے تو دوسرے میں محمّد کا لفظ بھی ہے؛ دوسرے یہ کہ باحمد، لاحمد، واحمد وغیرہ میں، یعنی احمد کے لفظ سے پہلے کوئی متحرک حرف ہو، تو وہ لفظ محمد کا ہموزن ہو جاتا ہے - [یہ شاخت کی نا واقفیت کی دلیل ہے - بہر حال یہ دونوں نام پیارے اور کثیر المعانی ہیں اور اب تو دنیا میں ان سے عظیم تر نام کوئی موجود ہی نہیں].

رضاعت: عرب میں ایک رواج تھا جو آج سعودی دور میں بھی باقی ہے کہ نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانے کے لیے کسی بدوی عورت کے سپرد کرکے صحرا میں بھیج دیا جاتا تھا۔ [اسی دستور کے مطابق شرفاے مکہ بھی بچے کی پیدائش کے چند روز بعد اسے کسی بدوی عورت کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ بچہ صحرا کی کھلی اور صاف ہوا میں پرورش پائے؛ اس کی زبان فصیح اور جسم مضبوط ہو اور وہ اس قابل ہو جائے کہ مصائب و تکالیف کا صبر و تحمل سے مقابلہ کر سکے اور فصاحت و شجاعت کا پیکر بن کر سادہ زندگی بسر کر سکے - جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ چند روز آپؐ کی والدہ سیدہ آمنہ نے بنفس نفیس دودھ پلایا - پھر کچھ دن ثویبہ نے بھی دودھ پلایا] - پھر طائف کے مضافات کی چند بدوی عورتیں حسب عادت مکّہ مکرمہ آئیں اور نوزائیدہ بچے تلاش کیے - آنحضرتؐ یتیم تھے، اس لیے کسی کو لینے کی رغبت نہ ہوئی - حلیمہ سعدیہ سواری کے جانور کی کمزوری کے باعث ذرا دیر سے پہنچیں - اتنے میں مالداروں کے سارے بچے آٹھ چکے تھے - حلیمہ نے خالی ہاتھ واپس جانے کے بجاے آنحضرتؐ کو لے لینا ہی طے کیا۔ اس سے ان کے گھر میں فوراً بڑی برکت پیدا ہو گئی؛ چنانچہ غذا سے محرومی کے زمانے میں ان کے ریوڑ یوں نظر آتے تھے گویا شاداب چراگاہ میں چرتے رہے ہوں (ابن ہشام، ص ۱۰۴ ببعد) - یہ واقعہ بڑا معنی خیز ہے کہ حلیمہ سعدیہ نے جب آپؐ کو دودھ پلانا چاہا تو آپؐ نے صرف ایک طرف سے دودھ پیا اور دوسری طرف رضاعی ماں کے اصرار کے باوجود بھی قبول نہ کی، بلکہ اسے اپنے دودھ بھائی کے لیے چھوڑ دیا (السہیلی، ۱ : ۱۰۸) -

رضاعت کے زمانے میں حلیمہ وقتاً فوقتاً مکہ آتیں اور بچہ ماں کو دکھاتی رہی ہوں گی اور حسب دستور رضاعت کی اجرت اور تحفہ تحائف پاتی رہی ہوں گی، اگرچہ مآخذ میں اس کے بارے میں سکوت ہے - بہرحال اس زمانے کے دو تین واقعات قابل ذکر ہیں - حلیمہ نے ایک بار عکاظ کے سالانہ میلے میں شرکت کی تو وہاں ایک یہودی فال گو نے بچے کو دیکھ کر غل مچایا کہ لوگو! آؤ اور اس بچے کو قتل کر دو ورنہ وہ تمھیں قتل کرے گا - [اس پر اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ کیا یہ یتیم ہے؟ حلیمہ سعدیہ نے کہا: نہیں! میں اس کی ماں ہوں اور یہ (حارث، ان کے خاوند) اس کے والد ہیں - اس پر یہودیوں نے کہا کہ اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اسے قتل کر دیتے]۔

(ابن سعد، ۱ : ۱۱۳)۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ کسی دن شاید گدگدانے پر مچل کر آپؐ نے اپنی بڑی دودھ شریک بہن شیماء کو اس زور سے کاٹا کہ اس کے شانے پر دانتوں کے نشان پڑ گئے (ابن ہشام، ص۸۵۵)۔ تیسرا واقعہ، جو غالباً تین چار سال بعد کا ہے، یہ ہے کہ ایک دن حلیمہ کا ایک بچہ چراگاہ سے بھاگتا ہوا آیا اور کہا : چند لوگ آئے اور قریشی بھائی کا سینہ چیر ڈالا ۔ حلیمہ چراگاہ میں پہنچیں تو دیکھا کہ آنحضرتؐ ایک چٹان پر بیٹھے اور ٹکٹکی لگائے آسمان کو تک رہے ہیں ۔ پوچھا تو کہا : فرشتے آئے تھے ، سینہ چاک کر کے دل نکالا اور دھو کر برائیوں سے پاک کیا ؛ پھر اس کی جگہ پر رکھ کر سینہ بند کر دیا جس کی خنکی میں اب تک محسوس کر رہا ہوں ۔ وہ واپس آسمان پر جا رہے تھے تو میں نظر سے انہیں کا تعاقب کر رہا تھا ۔ (ابن ہشام ، ص ۱۰۵)۔

[اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت حلیمہ بنو سعد کی معزّز اور شریف خاتون تھیں ۔ ان کے والد کا نام ابو ذؤیب عبداللہ بن الحارث بن شِجنہ بن جابر تھا ، جو بنو سعد بن بکر بن ہوازن کے قبیلے سے تھا ۔ مائی حلیمہ کے شوہر الحارث بن عبدالعزّٰی بن رِفاعہ بھی بنو سعد کے قبیلے سے تھے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے رضاعی بہن بھائیوں کے نام یہ ہیں : عبداللہ بن حارث، اُنَیْسہ بنت الحارث اور الشَّیْماء (خِذامہ یا بقول بعض حُذافہ) بنت الحارث، جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم کی دیکھ بھال اور پرداخت میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں (ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۲۲۵ ؛ جمھرۃ انساب العرب، ص ۲۵۶ ؛ طبقات ، ۱ : ۱۱۰، ۱۱۱ ؛ انساب الاشراف، ۱:۹۳)۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دھلوی، حلیمہ سعدیہ اپنے نام اور نسبت کی طرح حلم، وقار اور سعادت سے موصوف تھیں (مدارج النبوۃ، ۱:۲۴) ۔ قبیلہ بنو سعد کی فصاحت زبان مسلم تھی ۔ آپؐ نے ابتدائی تربیت بنو سعد میں پائی ۔ پھر آپؐ قبیلہ قریش سے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے اور اس کا آپؐ نے متعدد بار اظہار بھی فرمایا (الروض الانف ، ۱ : ۱۰۹)۔

حضرت حلیمہ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے ہر چیز میں برکت نظر آنے لگی اور ہر شے وافر ہو گئی ۔ خود آپؐ کی نشو و نما اس تیزی سے ہوئی کہ دوسرے لڑکوں میں اس کی مثال نہیں ملتی ۔ دو سال کے عرصے میں آپؐ بڑے صحت مند اور توانا ہو گئے ۔ میں نے آپؐ کا دودھ چھڑا دیا اور آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے پاس لے آئی ۔ ہماری یہ دلی خواہش تھی کہ آپؐ کچھ مدت اور ہمارے پاس رہیں ، کیونکہ آپؐ کی وجہ سے ہمارے ہاں بڑی خیر و برکت رہی ۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ آپؐ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں ۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے بیٹے کو کچھ عرصہ اور ہمارے پاس رہنے دیں ، تاکہ آپؐ اور مضبوط و توانا ہو جائیں ؛ علاوہ ازیں شہر مکہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے اور مجھے اس کا بھی خدشہ ہے ۔ ہمارے اصرار سے وہ رضامند ہوگئیں اور ہم آپؐ کو ساتھ لے کر خوش و خرم وطن کو لوٹے۔

بنو سعد میں واپسی کے بعد شق صدر کا واقعہ پیش آیا ۔ کتب سیر و احادیث میں اس کی تفصیلات درج ہیں ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم بنو سعد کے گھروں کے پیچھے اپنے ایک رضاعی بھائی کے ساتھ تھے، جو اپنے مال مویشی چرا رہا تھا۔ اس اثنا میں دو فرشتے (روایات میں دو پرندے یا دو آدمی بھی مذکور ہیں) آئے ۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کے پاس برف سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت تھا ۔ انہوں نے آپؐ کا پیٹ (یا سینہ) چاک کر کے قلب اطہر کو نکالا ۔ پھر قلب کو چاک کر کے اس میں سے جما ہوا خون نکال باہر پھینکا ۔ پھر قلب اور پیٹ کو برف

اور آب زمزم سے دھویا اور اسے علم و حکمت ، ایمان و ایقان ، رافت و رحمت اور شفقت سے بھر دیا ۔ بعد ازاں قلب کو اپنی جگہ رکھ کر چاک شدہ حصے کو ٹانکے لگا دیے اور دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر لگا دی ۔ پھر فرشتوں نے آپؐ کو سینے سے لگایا ، آپؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا : اے حبیبؐ خدا ! آپؐ خوف زدہ نہ ہوں ۔ اگر آپؐ کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کیسی بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے تو آپؐ بے حد خوشی اور راحت محسوس کریں ۔ یہ روایت متعدد طرق سے حدیث و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے ۔ صحیح مسلم میں بھی بصحت سند موجود ہے ۔ حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے سینۂ مبارک میں ٹانکوں کے نشان دیکھا کرتا تھا ۔ اس واقعے کے سلسلے میں پہلی روایت حضرت حلیمہ سعدیہ کی ہے ؛ دوسری روایت رسول اللہ صلّی علیہ و آلہ وسلّم کی ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے سوال کرنے پر اپنی زندگی کے آغاز کا یہ واقعہ ذکر فرمایا ۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے پہلے آپؐ نے فرمایا کہ میں دعاے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ ہوں ؛ تیسری قسم کی روایات صحابۂ کرامؓ کی ہیں ، جنھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے یہ بات سنی اور پھر آگے بیان کی (دیکھیے الطبقات ، ۱ : ۱۱۰ یا ۱۱۲ ؛ السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۲۲۷ تا ۲۳۱ ؛ ابن الجوزی : الوفاء با حوال المصطفیٰ ، ۱ : ۱۱۰ ببعد) ۔

بعض سیرت نگاروں نے کہا ہے کہ آپ کی عمر سوا دو برس تھی جب یہ واقعہ پیش آیا (ابن کثیر : کتاب مذکور ، ۱ : ۲۲۸) ، لیکن ابن سعد نے اس وقت آپؐ کی عمر چار سال بتائی ہے (الطبقات ، ۱ : ۱۱۲) ۔ جب آپؐ حضرت حلیمہ کے ہاں قیام فرما تھے تو ایک دن مائی حلیمہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو دیکھنے باہر نکلیں تو آپؐ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ باہر دھوپ میں تھے ۔ یہ دیکھ کر وہ بولیں کہ اتنی گرمی میں آپؐ باہر پھر رہے ہیں ۔ اس پر رضاعی بہن نے جواب دیا : اماں جان ! میرے بھائی کو گرمی نہیں لگتی ۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک بادل سایہ کیے رہتا ہے ۔ جب آپؐ چلتے ہیں تو بادل بھی ساتھ چلتا ہے اور جب آپؐ ٹھیر جاتے ہیں تو بادل بھی ٹھیر جاتا ہے (الوفاء باحوال المصطفیٰ ، ۱ : ۱۱۴ ؛ السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۲۲۸)] ۔ اس پر مائی حلیمہ نے طے کیا کہ بچے کو اس کی ماں کے سپرد کر دینا ہی بہتر ہے ۔ اس وقت آپؐ کی عمر چار یا پانچ سال کی بیان کی جاتی ہے ۔ واپسی میں مکّے کے قریب آپؐ کہیں کھو گئے ؛ اس کی اطلاع پر دادا نے تلاش کرایا (ابن ہشام ، ص ۱۰۶ ببعد ؛ البلاذری : انساب ، ۱ : ۹۵) ؛ آپؐ ایک درخت کے نیچے کھیلتے ہوے صحیح سالم مل گئے [(الوفاء باحوال المصطفیٰ ، ۱ : ۱۱۶) ۔ عبدالمطلب آپؐ کو گھر لائے اور اس خوشی میں بہت سا سونا اور کئی اونٹ صدقے میں دیے اور دایہ حلیمہ کو بہت سا انعام و اکرام دے کر واپس بھیجا (مدارج النبوۃ ، ۲ : ۳۰)] ۔

[مائی حلیمہ سعدیہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے ۔ امام السیوطی تو اس بات کے قائل ہیں کہ جس بی بی نے بھی آپؐ کو دودھ پلایا وہ اسلام لے آئی (مسالک الحنفاء ، ص ۴۴) ۔ شبلی نعمانی نے بہت سے حوالوں سے اس کی تصریح و توثیق کی ہے کہ مائی حلیمہ اسلام لے آئی تھیں ، نیز حافظ مغلطائی کے ایک مستقل رسالے التُّحْفَۃ الحَسِیْمَۃ فی اثبات اسلام حلیمہ کا ذکر بھی کیا ہے (سیرت النبی ، بار اول ، ۱ : ۱۲۲) ۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم حضرت حلیمہ کی بڑی عزت و تکریم کرتے تھے ۔ آپؐ کو ان سے اور ان کی اولاد سے بڑی محبت و موانست تھی ۔ آپؐ نے اس رشتۂ رضاعت و حضانت کو ہمیشہ یاد رکھا ۔ آخر آپؐ نے اپنی زندگی مبارک کے پہلے پانچ سال اسی خاندان میں گزارے تھے ، دو برس تک مائی حلیمہ کا

دودھ پیا ، پھر تین برس تک ان کی نگہداشت میں پرورش اور تربیت پائی - ان کے لڑکے لڑکیاں آپؐ کو اٹھاتے کھلاتے رہے - السہیلی رقمطراز ہیں کہ حضرت حلیمہ آپؐ کو آپؐ کی والدہ کے پاس لائیں تو آپؐ کی عمر پانچ سال ایک ماہ تھی - اس کے بعد حضرت حلیمہ نے آپؐ کو صرف دو مرتبہ دیکھا : ایک مرتبہ تو حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد وہ مکہ مکرمہ میں آئیں اور آپؐ سے خشک سالی کی شکایات کی اور بتایا کہ ساری قوم قحط کا شکار ہو رہی ہے - یہ سن کر آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے سفارش کی تو انہوں نے بیس بکریاں اور سواری کے لیے ایک اونٹ دے کر رخصت کیا ؛ دوسری مرتبہ یوم حنین میں ملاقات ہوئی (الروض الانف ، ۱ : ۱۱۱ الطبقات ، ۱ : ۱۱۳) - ابن سعد لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی رضاعی ماں آپؐ کے پاس آئی تو آپؐ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا : اُمّی ، اُمّی ! پھر آپؐ نے اپنی چادر مبارک ان کے لیے بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئیں - پھر آپؐ نے ان کی حاجت روائی بھی کی (الطبقات، ۱:۱۱۳)- حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم سے ان کی مقام جعرانہ میں بھی ملاقات ہوئی تھی اور ان کے بیٹھنے کے لیے آپؐ نے اپنی چادر مبارک بچھائی تھی - البلاذری کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت حلیمہ کی بہن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے اپنی رضاعی ماں کی بابت دریافت فرمایا - جواب ملا کہ وہ وفات پا چکی ہیں - یہ سن کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے - پھر آپؐ نے اپنی رضاعی خالہ کو لباس ، سواری کا جانور اور دو سو درہم نقد دے کر رخصت کیا (انساب الاشراف ، ۱ : ۹۵).

حضرت حلیمہ کے شوہر اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے رضاعی باپ حارث بن عبدالعزّی کے بارے میں اصحاب سیر مثلاً السہیلی، حافظ الذہبی اور حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ وہ مکّے میں اسلام لے آئے تھے اور ان کا اسلام پختہ اور عمدہ تھا- اسی طرح آپؐ کے رضاعی بھائی عبداللہ اور بہن شیماء بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے - حضرت شیماء کو غزوہ حنین میں گرفتار کر کے جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے سامنے لایا گیا تو آپؐ نے اپنی رضاعی بہن کو اس کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور فرمایا کہ اگر چاہو تو عزّت و شفقت سے میرے پاس قیام کرو اور اگر اپنی قوم میں جانا چاہو تو تمہیں بحفاظت پہنچا دوں - وہ اسلام لے آئیں اور ان کی خواہش کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ وَ آلہ وسلّم نے انہیں ان کی قوم میں بھیج دیا اور روانگی کے وقت تین غلام، ایک لونڈی اور کچھ اونٹ اور بکریاں عطا کیں - اسی رشتہ رضاعت و حضانت کا پاس کرتے ہوئے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے غزوۂ حنین میں قید ہونے والے قبیلہ بنو سعد کے تقریباً چھے ہزار مردوں ، عورتوں اور بچوں کو آزاد کر دیا اور ان کے مال مویشی بھی انہیں واپس کر دیے - اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے.

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وَ آلہ وسلّم کے پانچ سالہ قیام کے بارے میں حضرت حلیمہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اس عرصے میں آپؐ کی عادات نہایت پاکیزہ اور پسندیدہ تھیں ؛ نہ تو آپ روتے تھے اور نہ بے تمیزی کے مرتکب ہوتے تھے ، نہ عام بچوں کی طرح کپڑوں میں بول و براز کرتے تھے ؛ فضول کاموں اور کھیلوں سے بھی پرہیز کرتے تھے (مدارج النبوۃ ، ۲:۲۶ تا ۲۸).

نوعمری : جب حضرت حلیمہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو لے کر آپؐ کی والدہ محترمہ کے پاس آئیں تو حضرت آمنہ اپنے لخت جگر اور نور نظر

کو تندرست و توانا دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں اور محبت و شفقت اور لاڈ پیار کے اظہار کے وہ تمام انداز اختیار کیے جو ایک بیوہ ماں اپنی آنکھوں کے تارے اور افسردہ دل کے سہارے کے لیے کر سکتی ہے۔ ماں نے اپنے لال کی تربیت اور پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آپؐ کی دیکھ بھال اور نگہداشت، خبر گیری اور حضانت کے لیے اپنی خادمہ ام ایمن کو متعین فرما دیا۔ ام ایمن کا بیان ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے کبھی بھوک یا پیاس کی شکایت نہیں کی۔ آپؐ صبح آب زمزم نوش فرما لیتے اور پھر سارا دن کوئی چیز طلب نہ فرماتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ناشتہ تیار کر کے سامنے رکھا تو کہ دیا کہ مجھے خواہش نہیں (مدارج النبوۃ، ۲ : ۳۰)۔ ام ایمن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو بچپن ہی سے سیر چشمی، بے نیازی، قناعت اور غنائے نفس سے نواز رکھا تھا۔ آمنہ کے لال نے اپنی عمر عزیز کا چھٹا سال اپنی مادر مہربان اور شفیق دادا کی محبت و شفقت کے سائے میں بسر کیا۔ جب آپ چھے برس کے ہوگئے تو آپؐ کی والدہ ماجدہ نے آپؐ کو آپؐ کے دادا کے ننھیال دکھانے کے لیے سفر یثرب (مدینہ) کی تیاری کی۔ ایک اونٹ پر حضرت آمنہ سوار ہوئیں اور دوسرے پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور آپؐ کی خادمہ (کھلائی) ام ایمن۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ اپنے مرحوم شوہر حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر کی زیارت خود بھی کریں اور اپنے ہونہار لال کو بھی مرحوم باپ کی قبر کی زیارت کرا سکیں؛ چنانچہ ماں بیٹا مع ام ایمن سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے یثرب پہنچے اور وہاں بنو عدی بن النجار کے ہاں دارالنابغۃ میں قیام فرمایا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ سلمیٰ بنت عمرو یثرب کے اسی خاندان سے تھیں اور آپؐ کے دادا یہیں پیدا ہوئے اور آٹھ برس تک یہیں اپنے ننھیال میں پرورش پاتے رہے تھے۔ وہاں ایک مہینہ ٹھیرنے کے بعد جب واپس لوٹیں تو راستے میں بیمار ہو کر مکے اور مدینے کے درمیان مقام ابواء پر اپنے معصوم اور پیارے لال کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سو گئیں اور وہیں مدفون ہوئیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و سلّم کو بچپن میں قیام مدینہ کی کئی باتیں یاد رہ گئیں تھیں۔ ہجرت کے بعد آپؐ کا ایک مرتبہ بنو عدی بن النجار کی منازل اور قیام گاہوں پر گزر ہوا تو فرمایا کہ میں بچپن میں جب اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو بنو عدی کی اس گڑھی میں اپنے ننھیال کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور منڈیر پر بیٹھنے والے پرندوں کو ہم سب مل کر اڑایا کرتے تھے۔ آپؐ نے دارالنابغہ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میری والدہ اور میں یہاں ٹھیرے تھے اور اسی گھر کے اندر میرے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر ہے اور بنو عدی کا یہی وہ تالاب (باؤلی) ہے جس میں میں نے تیراکی اور شناوری کی خوب مشق کی۔ ام ایمن کہتی ہیں کہ یہود کے کچھ لوگ آتے جاتے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو دیکھتے تھے۔ میں نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ یہ شخص اس قوم کا نبی ہے اور یہ شہر اس کا دارالھجرت ہے۔ مجھے اس کے یہ الفاظ خوب یاد ہیں (الطبقات، ۱ : ۱۱۶؛ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۳۵؛ الوفا، ۱ : ۱۱۷)۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی مشفق و مہربان ماں کی وفات کے بعد ام ایمن آپؐ کو لے کر مکہ مکرمہ آئیں اور آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے سپرد کیا۔ دادا نے اپنے پوتے کی کفالت و تربیت اور نگہداشت کا پورا پورا حق ادا کیا۔ عبدالمطلب آپؐ کو اپنی تمام اولاد سے زیادہ لاڈ کرتے، پیار اور عزت و محبت سے پرورش کرتے؛ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی

عدم موجودگی میں کھانا نہ کھاتے تھے۔ آپؐ جب چاہتے دادا کے پاس بلا روک ٹوک آتے جاتے اور ان کی مسند پر بیٹھ جاتے تھے (مدارج النبوۃ، ۲ : ۳۱) ۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ عبدالمطلب کے لیے دیوار کعبہ کے پاس مسند بچھائی جاتی تھی ۔ ان کے سب بیٹے اور قریش کے سردار اس مسند کے ارد گرد بیٹھتے تھے ۔ عبدالمطلب آتے تو صرف وہی مسند پر بیٹھتے، البتہ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلّم تشریف لاتے تو دادا کی مسند پر بیٹھ جاتے اور اگر کوئی شخص آپؐ کو اس مسند سے اٹھانا چاہتا تو عبدالمطلب اسے روک دیتے اور کہتے کہ میرے بیٹے کو بیٹھا رہنے دو؛ اس کی شان ہی کچھ اور ہے؛ اسے اپنے شرف و مرتبے کا احساس ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ اتنا بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام پائے گا کہ کسی عربی کو نہ پہلے ملا اور نہ بعد میں ملے گا ۔ پھر وہ آپؐ کے جسد مبارک پر محبت و شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور آپؐ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ۔ دادا اپنے ہونہار پوتے کا بڑا خیال رکھتے تھے ۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ میرا پوتا بڑا ہوکر نبوت و حکومت سے نوازا جائے گا ۔ اسی لیے وہ آپؐ کی خادمہ ام ایمنؓ کو اس بات کی تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ ایک پل کے لیے بھی آپؐ سے غافل نہ ہونے پائے (طبقات، ۱ : ۱۱۸ ؛ السیرۃ النبویۃ ، ۱: ۲۳۹ و ۲۴۰؛ الوفاء، ۱ : ۱۱۹ تا ۱۲۰ ، ۱۳۰)].

مشفق و مہربان دادا دو سال بعد فوت ہو گئے اور اس وقت آنحضرتؐ کی عمر آٹھ سال کی تھی ۔ (دادا کی عمر کی روایتیں مختلف ہیں : اسی ، ایک سو دس ، ایک سو بیس اور ایک سو چالیس) ۔ جنازے کے پیچھے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم روتے ہوئے جا رہے تھے [(الطبقات ، ۱ : ۱۱۹)] ۔ سارا شہر سوگوار تھا ۔ شہر میں کئی دن ان کا سوگ منایا گیا (البلاذری : الانساب، ۱ : ۸۷).

[ام ایمنؓ نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو بچپن میں کھلایا اور نگہداشت و خدمت کا حق خوب ادا کیا ۔ وہ آپؐ سے بڑے لطف و محبت سے پیش آتی اور اچھی طرح دیکھ بھال کرتی تھیں ۔ یہ خادمہ آپؐ کو اپنے والد اور والدہ کی طرف سے ملی تھیں ۔ ان کا اصلی نام برکت تھا اور حبشہ کی رہنے والی تھیں۔ مدت العمر آپؐ کی خدمت کرتی رہیں ۔ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا تو آپؐ نے ام ایمن کو آزاد کر دیا.

ام ایمن کا نکاح پہلے عُبَید بن الحارث الخزرجی سے ہوا تھا اور ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا ، جس کا نام ایمن تھا اور اسی نسبت سے وہ ام ایمن کہلائیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی امّ ایمنؓ کی بڑی عزت کرتے اور میری ماں کہ کر یاد کیا کرتے تھے ۔ آپؐ نے عبید کی موت کے بعد بعثت نبوی کے آغاز میں حضرت ام ایمن کا نکاح حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا اور اس نکاح سے اسامہؓ بن زید پیدا ہوئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات پر ام ایمنؓ کو روتے دیکھ کر پوچھا گیا تو کہنے لگیں کہ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ آپؐ اس دنیا سے تشریف لے جائیں گے ، مگر میں تو اس بات پر روتی ہوں کہ اب سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا ہے ۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے موقع پر ام ایمنؓ نے روتے ہوئے کہا کہ آج اسلام کمزور ہو گیا ہے ۔ بالاخر ام ایمنؓ نے خلافت عثمانی میں وفات پائی (الذہبی: سیر اعلام النبلاء ، ۲: ۱۵۹ تا ۱۶۱).

یہ قدرت کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ آپؐ بطن مادر میں تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا ۔ چھے برس کے ہوئے تو مہر مادری سے محروم ہوگئے اور آٹھ برس کے ہوئے تو مشفق و مہربان دادا کا سایۂ عاطفت بھی اٹھ گیا ۔ والد کو تو آپؐ نے دیکھا بھی نہ تھا، اس لیے پدرانہ محبت و شفقت کے لطف سے آشنا بھی نہ ہونے پائے تھے ۔ مہر مادری سے محرومی کا

احساس و شعور تو تھا ، لیکن دادا کی شفقت اور لطف نے اس زخم پر مرہم کا کام کیا ۔ اب دادا کی وفات کے وقت آپؐ خاصے با شعور ہو چکے تھے اور اس محرومی اور غم کی شدت کا احساس اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ آپؐ ان کے سرہانے کھڑے روتے رہے تھے (الوفاء ، ۱ : ۱۲۹) اور جب جنازہ اٹھا تو آپؐ جنازے کے پیچھے پیچھے روتے جا رہے تھے تا آنکہ انھیں حجون کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا (الوفاء ، ۱ : ۱۳۰)].

کہتے ہیں کہ عبدالمطلب نے وصیت کی کہ ابو طالب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے نگران بنیں ۔ آپؐ کے کئی چچا تھے ۔ ابو طالب اور زبیر کی ماں اور عبداللہ کی ماں ایک ہی تھی۔ زبیر کو عام بہبود کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی (دیکھیے نیچے) ۔ اس کے باوجود ابو طالب کو ، جو مفلس بھی تھے، ترجیح دینے کی وجہ شاید یہ تھی کہ عبداللہ اور ابو طالب میں روابط زیادہ بہتر رہے ہوں .

[بکریاں چرانے کے ضمن میں یہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ بنو سعد کے ہاں دوران قیام میں بکریاں چراتے وقت آپؐ اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ ہوتے تھے ۔ امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق آپؐ اہل مکہ کی بکریاں قراریط پر چرایا کرتے تھے (الصحیح ، کتاب الاجارہ ؛ الطبقات ، ۱ : ۱۲۵) ۔ نیز ابن سعد کے مطابق آپؐ اپنے گھر والوں کی بکریاں مقام اَجیاد (دامن مکہ) میں چرایا کرتے تھے (اَنا اَرْعٰی غَنَمَ اَھْلِی بِاَجْیَاد ، الطبقات ، ۱ : ۱۲۶) ۔ آپؐ نے ایک حدیث میں یہ بھی وضاحت فرمائی کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں ۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ پیلو کے درختوں کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اس کے سیاہ پھل کھاؤ ، وہ بہت اچھے ہوتے ہیں ۔ جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا تو سیاہ پھل ہی کھایا (توڑا) کرتا تھا (الطبقات ، ۱ : ۱۲۶) ۔ بعض سیرت نگاروں نے قراریط پر بکریاں چرانے والی روایات کی تاویل کی ہے اور زیادہ تر رجحان یہ ہے کہ یہ سِکّہ نہیں بلکہ اجیاد کے قریب ایک مقام ہے ۔ اس زمانے میں اشراف اور معززین کے لڑکے اور جوان عام طور پر بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے ۔ اس میں تحقیر یا ذلت کا کوئی پہلو نہیں ، بلکہ یہ قیادت ، جفا کشی ، بلند ہمتی اور مردانگی کی نشانی تھی، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی تھیں ۔ اس سے بڑھ کر اور زیادہ شرف کیا ہو سکتا ہے.

ابو طالب کی بیوی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی چچی کا نام فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھا اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ تھیں ۔ وہ مکے میں ایمان لائیں ، مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں وفات پا کر مدفون ہوئیں ۔ انھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بڑی محبت و الفت سے پرورش کیا ۔ آپؐ بھی ان کی بڑی عزت و تکریم کرتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا کرتے تھے ۔ آپؐ اکثر ان کی زیارت کو جاتے اور دوپہر کے وقت انھیں کے ہاں آرام فرماتے تھے ۔ جب آپؐ کی چچی فوت ہوئیں تو آپؐ نے ان کو کفن کے ساتھ پہنانے کے لیے اپنی قمیص بھی دی تا کہ اس کی وجہ سے انھیں جنت کا لباس پہنایا جائے اور جب انھیں قبر میں اتارا گیا تو آپؐ قبر میں ان کے ساتھ اترے تا کہ ان پر قبر میں آسانی اور آسائش ہو جائے (الذہبی : سیر اعلام النبلاء ، ۲ : ۸۷ ؛ الاستیعاب ، ۲ : ۷۵۳) .

ابو طالب کو اس بات کا یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مستقبل بڑا درخشاں اور شاندار ہے ۔ وہ آپؐ کی نگہداشت کا بڑا اہتمام کرتے ۔ آپؐ کی چچی بھی اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ کی دیکھ

بھال کرتیں ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات پر آپؐ بڑے دل گرفتہ اور مغموم نظر آتے تھے ۔

ابو طالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بڑی محبت تھی ۔ وہ آپؐ کی خوب اچھی طرح دیکھ بھال کرتے اور ہر طرح خیال رکھتے تھے ۔ ابو طالب عیالدار تو بہت تھے ، لیکن مالدار نہ تھے ۔ ان کے ہاں آپؐ کی موجودگی باعث خیر و برکت ثابت ہوئی ؛ جب ابو طالب کے اہل و عیال اکیلے کھانا کھاتے تو سیر نہ ہونے پاتے ، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شریک طعام ہوتے تو سب لوگ خوب سیر ہو جاتے ۔ ابو طالب آپؐ کے مبارک ہونے کا اکثر اعتراف کیا کرتے تھے ۔ ابو طالب کے بال بچے رات بھر سونے کے بعد صبح اٹھتے تو ان کی آنکھیں کیچ آلود ہوتیں اور بال بکھرے ہوئے اور پریشان ہوتے، لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے چہرے پر تازگی ، رونق اور آب و تاب ہوتی اور آنکھیں صاف اور نکھری ہوئی ہوتیں (الطبقات ، ۱ : ۱۱۹ و ۱۲۰ ؛ الوفا ، ۱ : ۱۳۱ ؛ السیرۃ النبویہ ، ۱ : ۲۴۲).

چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رسالت و نبوت سے سے نوازنا تھا ، اس لیے آپؐ کی تربیت اور نشو و نما خاص انداز میں ہوئی ۔ اللہ تعالی نے ہر قدم پر اپنے حبیبؐ کی راہنمائی اور حفاظت فرمائی اور جاہلیت کی تمام بری اور مشرکانہ عادات سے ہمیشہ بچائے رکھا ۔ آپؐ اپنی قوم کی کسی مشرکانہ تقریب میں کبھی شامل نہ ہوئے ۔ آپؐ کا بچپن ، لڑکپن اور جوانی نہایت پاکبازی اور راستبازی میں گزری ۔ بچپن ہی سے آپؐ شرم و حیا کا پیکر تھے ۔ ایک طرف آپؐ امانت داری، راست گفتاری اور دیگر اوصاف حمیدہ سے آراستہ تھے تو دوسری طرف بد گوئی ، فحش بیانی ، غیر مہذب اور آوارہ عادتوں سے بہت دور تھے ۔ آپؐ نے نہ تو کبھی میلے ٹھیلے میں شرکت کی اور نہ لہو و لعب میں شامل ہوئے ۔ اگر ایک دو مرتبہ ارادہ بھی کیا تو اللہ تعالی نے اس ارادہ سے باز رکھا اور کسی صورت میں بھی آپ تماشا گاہ تک پہنچ نہ پائے].

السہیلی (۱ : ۱۱۲) نے البخاری سے روایت کی ہے کہ اس زمانے میں شہر میں ایک شادی تھی ۔ آپؐ کو تماشا دیکھنے کا شوق ہوا ۔ ایک رفیق چرواہے سے کہا : میری بکریاں بھی آج تو سنبھال لے ؛ کسی اور دن تیری بکریاں میں سنبھال لوں گا ۔ چرائی شہر کے باہر ہوتی تھی ۔ شہر آئے تو تقریب ابھی شروع نہ ہوئی تھی ۔ انتظار میں دھوپ کے باعث ایک جگہ سائے میں ذرا پیٹھ لگائی تو غنودگی طاری ہوگئی اور جب بیدار ہوئے تو جلوس باجا سب ختم ہو چکا تھا ۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور مکرر سو گئر ۔ اس دن عہد کیا کہ آئندہ کھیل کود میں وقت ضائع نہ کروں گا ۔

[ابو طالب اپنے خاندان سمیت ایک بت کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے اور وہاں نذریں نیازیں چڑھاتے اور قربانی وغیرہ کرتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اہل خانہ ہر سال مجبور کرتے، لیکن آپؐ انکار کر دیتے ۔ ایک سال کا ذکر ہے کہ گھر کے بزرگوں نے بے حد اصرار کیا تو آپؐ بادل ناخواستہ ساتھ چل دیے ۔ واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت پریشان اور ہراساں نظر آ رہے تھے۔ پھپیاں آپؐ کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں ۔ اس کے بعد پھر آپؐ کبھی ایسی تقریب میں شریک نہ ہوئے .

عہد شباب : تین چار سال اسی طرح گزر گئے تو ابو طالب نے فلسطین کے تجارتی سفر کا ارادہ کیا کہ کچھ کمائیں (ابن ہشام : سیرۃ ، ۱ : ۱۹۱ تا ۱۹۳)۔ [سفر طویل اور راستہ دشوار تھا مگر شفیق چچا نے اپنے یتیم بھتیجے کو اپنے ہمراہ سفر میں لے جانے کا ارادہ ترک نہ کیا (ابن ہشام : سیرۃ ، ۱ : ۱۹۲،

قاہرہ ۱۹۳۶ء)]۔ فلسطین آپؐ کے لیے ایک نیا ملک تھا ۔ یونانی حکومت اور عیسائی دین دونوں آپؐ کے لیے اجنبی تھے ۔ اس وقت بھی عیسائیوں میں اپنے دین کی تبلیغ کا شوق تھا ۔ ان کے راہب مہمان نوازی اور خدمت خلق کا ذوق رکھتے تھے۔ بیت المقدس کے شمال میں دمشق کے قریب ایک مقام بُصْریٰ کی منڈی میں بحیرا راہب نے اپنے صومعے میں اس چھوٹے سے تجارتی کاروان کی ضیافت کی ۔ عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشینگوئیوں کے مطابق اس زمانے میں کسی اہم انقلاب کا انتظار تھا (یوحنا ، ۱۶:۱۴ و ۱۶ : ۷ تا ۱۶)؛ یہودیوں کو بھی آنے والے مسیحا کا انتظار تھا ، جسے بنی اسرائیل کے بھائیوں کے خاندان (بنو اسمٰعیلؑ) سے ہونا چاہیے تھا (استثنا ، ۱۸: ۱۸) ؛ [نیز دیکھیے سرسید : خطبات احمدیہ]. اس طرح بحیرا کا مقصد سہ گونہ ہو جاتا ہے : مسافر پروری ، تبلیغ نصرانیت اور تسلی دہندہ کی تلاش [رک بہ بحیرا].

مکہ مکرمہ میں ابو طالب کی ایک دکان تھی ۔ وہ کپڑے اور عطر کا کاروبار کرتے تھے۔ ننھا اور ذہین بھتیجا بھی اسی ماحول میں پروان چڑھا تھا ؛ لہٰذا فطری دیانت داری سے رفتہ رفتہ شہرت اور ہر دلعزیزی کا حاصل ہونا ناگزیر تھا ۔ آپؐ کی راست بازی اور راست گفتاری کی وجہ سے "الامین" اور "الصّادق" کا خطاب آپؐ کے لیے زبان زد عوام و خواص ہو گیا ۔ [کتب احادیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قبل از نبوت عہد شباب میں تجارتی کاروبار کیا اور اس میں بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی].

آپؐ نے اپنے مکرم چچا ابو طالب کی رفاقت میں شام و فلسطین کی طرف جو سفر کیے اس سے آپؐ کو تجارتی اصول و ضوابط سیکھنے میں بڑی مدد ملی ؛ چنانچہ بعد ازاں آپؐ نے اپنی آزاد تجارت شروع فرما دی ۔ تزویج حضرت خدیجہؓ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہی شغل رہا ۔ اس دوران میں آپؐ نے جن لوگوں کے ساتھ این دین کیا انھوں نے آپؐ کو انتہائی امین، پابند عہد اور دیانت دار پایا ، حتّٰی کہ عبداللہ بن ابی الحمساء کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پاس عہد میں تین روز تک ایک ہی جگہ تشریف فرما رہے (ابو داؤد : سنن ، ۵ : ۲۶۸ ، عدد ۴۹۹۶ ؛ شبلی : سیرۃ النبی، ۱ : ۱۸۵ ببعد) ۔ سفر تجارت کے دوران میں ایک بار ایک شخص نے آپؐ کو لات و عُزّٰی کی قسم دینا چاہی تو آپؐ نے فرمایا : میں نے کبھی ان کے نام کی قسم نہیں کھائی ۔ میں ان کے پاس سے گزرتا ہوں تو ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا (ابن الجوزی : الوفا ، ۱ : ۱۴۳)].

[آپؐ سترہ یا بیس سال کے تھے جب حرب فجار چھڑی (الیعقوبی، ۲ : ۱۵) ۔ یہ جنگ قیس اور کنانہ کے قبیلوں میں حج کے محترم زمانے میں ہوئی ۔ قریش مکہ نے بھی اپنے دستے الگ قائم کرکے شمولیت اختیار کی ۔ چونکہ قریش اس جنگ میں برحق تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اس جنگ میں اپنے چچاؤں کی مدافعت میں حصہ لیا (ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ، ۱: ۱۹۵ تا ۱۹۸؛ المسعودی : مروج الذہب، ۲ : ۲۷۴). تاہم علامہ سہیلی (روض الانف، ۱ : ۱۲۰) کی تشریح کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس میں نہ تو عملی حصہ لیا اور نہ کسی پر ہاتھ اٹھایا ۔ زیادہ سے زیادہ آپؐ نے اپنے چچاؤں کی معاونت کی ، یعنی ان کو تیر پکڑاتے رہے اور بس ۔ [فجار کی لڑائیاں دو ہوئی ہیں ۔ پہلی لڑائی اس وقت ہوئی جب آپؐ کی عمر کم و بیش دس سال تھی ۔ دوسری جنگ اس وقت ہوئی جب آپؐ کی عمر چودہ یا بیس سال بیان کی جاتی ہے ۔ اس جنگ میں آپؐ نے اپنے چچاؤں کی معاونت کے لیے حصہ لیا

(ابن الجوزی، ۱ : ۱۳۵).

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر مبارک پچیس سال کے قریب ہوئی تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپؐ کی امانت و دیانت ، حسن معاملگی اور ایفاے عہد کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا ۔ یہ شہرت حضرت خدیجہؓ [رک بآں] نے بھی سنی ۔ وہ ایک مالدار تجارت پیشہ خاتون تھیں اور مکہ معظمہ میں اپنی نیک نامی کے باعث "طاہرہ" کے معزز لقب سے یاد کی جاتی تھیں ۔ انھیں اشراف قریش نکاح کا پیام دے چکے تھے، مگر انھوں نے ان تمام کو رد کر دیا تھا اور اب آزادانہ پاک زندگی بسر کر رہی تھیں ۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ میرا سامان تجارت لیکر شام جائیں ؛ جو معاوضہ دوسروں کو ملتا ہے اس سے آپؐ کو دوگنا ملے گا ۔ آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے ایما پر یہ پیش کش قبول کرلی (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۱۲۱ ببعد)].

حضرت خدیجہؓ نے بہت سا سامان آپؐ کے سپرد کیا اور ایک غلام میسرہ بھی رفاقت و خدمت کے لیے ساتھ کر دیا ؛ (ایک روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعض رشتہ دار بھی اس کاروان میں شریک تھے) ۔ اس دفعہ بھی بصریٰ (ملک شام) جانا ہوا (ابن ہشام : سیرۃ ، ۱:۱۹۹ ببعد) ۔ یہ سفر بہت کامیاب رہا اور معمول سے بہت زیادہ نفع مند ثابت ہوا ؛ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے بھی شکر گزاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو وعدے سے زیادہ معاوضہ دیا ۔ ان سفروں میں آنحضرتؐ کی دیانت و امانت سے حضرت خدیجہؓ بے حد متأثر ہوئیں اور ان کا اعتراف کرتے ہوے کچھ تحائف بھی دیے (السہیلی، ۱ : ۱۲۳) ۔ [ابن الجوزی نے روایت کی ہے کہ السائب بن ابی السائب بھی ایک عرصے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے شریک تجارت رہے (الوفا، ۱ : ۱۴۲)].

خانہ داری : اس سفر سے واپسی کے تین ماہ بعد [شبلی ، ۱ : ۱۸۸] اس قدر دانی کا سلسلہ باہم مناکحت کی صورت پر منتج ہوا۔ عام روایتوں کے مطابق اس وقت آپؐ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس سال بیان کی جاتی ہے ۔ حضرت خدیجہؓ سے چار لڑکیاں اور دو سے لے کر چار تک لڑکے پیدا ہوے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نکاح کی سلسلہ جنبانی حضرت خدیجہؓ کی طرف سے ہوئی ۔ بات طے ہوگئی تو حضرت خدیجہؓ نے تاریخ مقرر کی اور فرمایا : "حسب دستور اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ آؤ" ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خاندان کے بزرگوں کے ساتھ تشریف لے گئے [جن میں حضرت حمزہؓ اور ابو طالب نمایاں تھے]۔ رسم نکاح کے بعد جناب ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا ، جس میں رواج کے مطابق خاندان اور نوشہ (آنحضرتؐ) کی ستائش کی اور کہا : "اس کے کردار کا مقابلہ مکے کا کوئی دوسرا نوجوان نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ مالدار نہیں، لیکن دولت تو آنے جانے والی چیز ہے۔ [اس کے پاس پائدار دولت ہے، یعنی امانت و دیانت" (الوفا، ۱ :۱۴۵ ؛ انساب الاشراف، ۱: ۹۷ ببعد)]. اس موقع پر حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار ورقہ بن نوفل نے اٹھ کر اس کی تائید کی (السہیلی ، ۱ : ۱۲۳) ۔ مہر میں اختلاف ہے : بیس اونٹنیاں (ابن ہشام : سیرۃ ۱ : ۲۰۱) ، یا ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی ، یعنی پانچ سو درہم (البلاذری ، انساب، ۱:۹۷)؛ [نیز دیکھیے السہیلی : روض الانف ، ۱: ۱۲۰ تا ۱۲۴؛ ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۱۹۸ تا ۲۰۳؛ الیعقوبی : تاریخ، ۲ : ۱۲۰ تا ۱۲۲].

قریب قریب اسی زمانے میں حلف الفضول [رک بآں] کے مشہور معاہدے کی تجدید ہوئی ۔ اس

کی تجویز زبیر بن عبدالمطلب نے اور سر پرستی عبداللہ بن جُدعان نے کی ۔ آنحضرتؐ نے بھی جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا ۔ معاہدہ یہ تھا کہ اگر مکے میں کسی پر ظلم ہوا تو ہم اس کی مدد کو دوڑیں گے اور ظالم کو مکے میں نہیں رہنے دیا جائے گا ۔ بعثت کے بعد بھی آپؐ فرمایا کرتے تھے : "میں نے یہ حلف اٹھایا تھا ۔ اگر آج بھی کوئی اس کی دہائی دے تو میں اس کی مدد ضرور کروں گا اور قیمتی سرخ اونٹوں کی ایک قطار کے عوض بھی اس فریضے سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوں گا"۔ [اس معاہدے کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدے کا جن لوگوں کو خیال آیا تھا ان کے ناموں میں لفظ فضل (فضیلت کا مادہ) مشترک تھا (المسعودی: مروج الذہب، ۲:۲۷۶ تا ۲۷۸ ؛ ابن الجوزی، الوفا، ۱ : ۱۳۶ تا ۱۳۸)]۔

امام احمد بن حنبل (مسند ، ۴ : ۲۰۶ ، ۲۰۷) نے دو طویل روایتیں قبیلہ عبدالقیس کے اسلام کے متعلق نقل کی ہیں ۔ ان کے وفد سے جب آنحضرتؐ نے مشقّر، صفا اور ہجر نامی شہروں کے حالات پوچھے (جو مشرقی عرب میں موجودہ شہر الھفوف و مضافات سے عبارت ہیں) تو انھوں نے حیرت سے کہا کہ آپؐ تو ہمارے شہروں سے ہم سے بھی زیادہ واقف ہیں ۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تمہارے ملک کی طویل سیاحت کی ہے ۔ [اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان مقامات کو آپؐ نے شغل تجارت کے دوران میں دیکھا تھا] ۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا شام ، یمن اور مشرقی عرب کی طرح آنحضرتؐ تجارت کے لئے حبشہ بھی گئے تھے ؟ اس سلسلے میں [وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا ، تاہم] یہ امر قابل ذکر ہے کہ آغاز اسلام پر جب مخالفین کی طرف سے ایذا رسانی شدت اختیار کر گئی تو آپ نے اپنے جانثاروں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس موقع پر آنحضرتؐ نے جعفرؓ بن ابی طالب کو نجاشی کے نام جو تعارفی خط دیا اس کے الفاظ یہ ہیں : "میں نے تمہارے پاس اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ بن ابی طالب کو ، جس کے ساتھ چند مسلمان بھی ہیں ، بھیجا ہے ۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کی مہمانداری کیجیے" (الوثائق السیاسیة، عدد ۲۱) ۔ انسانیت پروری کی اساس پر پناہ دہی کی درخواست کا ایسا دوستانہ اور ہمدردانہ انداز شاید اس استنباط کی اجازت دیتا ہے کہ نجاشی سے یا اس علاقے سے آپؐ کی پہلے سے واقفیت رہی ہو اور ممکن ہے کہ یہ واقفیت حبشہ کے تجارتی سفر کے باعث ہوئی ہو ، [لیکن کوئی قطعی بات نہیں کی جا سکتی]۔

زیدؓ بن حارثہ : حُباشہ کے میلے میں ایک نو عمر زیدؓ بن حارثہ بکنے آیا تو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام نے خرید کر اپنی پھپی حضرت خدیجہؓ کے نذر کیا اور حضرت خدیجہؓ نے اسے آنحضرتؐ کی خدمت کے لیے مختص کر دیا ۔ کچھ دنوں بعد حضرت زیدؓ کا باپ تلاش کرتے کرتے مکہ مکرمہ آپہنچا تو آنحضرتؐ کی خدمت میں باریاب ہوا اور کہا کہ ایک ہمسایہ قبیلے نے ایک لڑائی میں میرے بیٹے کو گرفتار کر کے بیچ دیا ہے ؛ ورنہ وہ آزاد اور مجھ سردار قبیلہ کا بیٹا ہے ؛ لہذا جو چاہو فدیہ لے لو ، میں اسے آزاد کرا کے گھر لے جانا چاہتا ہوں ۔ آنحضرتؐ اس کی گفتگو سے بہت متأثر ہوے اور فرمایا کہ ایک اس سے بہتر حل ہے ۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور پوچھا کہ کیا وہ اس شخص کو جانتا ہے ؟ زید نے کہا : یہ میرے والد ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا : یہ تجھے واپس لے جانا چاہتے ہیں ؛ اگر جانا چاہو تو میں تجھے آزاد کرتا ہوں ۔ زیدؓ نے کہا : آپؐ نے اب تک میرے ساتھ ایسا مشفقانہ برتاؤ کیا ہے کہ اس سے بہتر ممکن

نہیں۔ میں باپ کے ہاں مالک کی طرح رہنے کے مقابلے میں آپؐ کے ہاں غلام رہنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس سے آنحضرتؐ بے حد متأثر ہوے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر فوراً بیت اللہ میں تشریف لائے اور کمال مہربانی سے اعلان کیا کہ میں زید کو آزاد کرتا ہوں اور اسے اپنا متبنّٰی بناتا ہوں۔ باپ دلگیر تو ہوا، لیکن بچے کے مستقبل کے متعلق مطمئن ہو کر اپنے وطن کو لوٹ گیا [ابن ہشام : السیرۃ النبویہ، ۱ : ۲۶۴ ببعد، قاہرہ ۱۹۳۶ء].

تعمیر خانہ کعبہ : مکے میں کعبے کے بیرونی پردوں کو بخور سے دھونی دی جاتی تھی۔ ایک دن ہوا کی شدت سے چنگاریوں نے پردوں کو آگ لگا دی۔ عمارت کمزور ہوگئی تھی؛ کچھ دنوں بعد موسلا دھار بارش شروع ہوئی تو عمارت بیٹھ گئی۔ تعمیر جدید کے لئے صرف اکل حلال سے چندہ کیا گیا؛ سود خواروں اور قحبہ خانوں کے مالکوں سے رقم قبول نہ کی گئی۔ انھیں دنوں مکے کے قریب شعیبہ (جدہ) میں ایک کشتی، جو مصر سے آرہی تھی، ٹوٹ گئی۔ کچھ لوگ زندہ بچے اور کچھ سامان بھی بچایا جا سکا، جس میں شکستہ کشتی کے تختے بھی تھے۔ اہل مکہ نے ان کا سارا سامان حتّٰی کہ کشتی کے تختے بھی خرید لیے تا کہ کعبے کی چھت میں لگائیں۔ اہل مکہ نے پہلے ملبہ صاف کیا اور پرانی بنیادیں برآمد کرکے نئی دیواریں کھڑی کرنی شروع کیں۔ قبائل شہر نے کام بانٹ لیا اور ہر دیوار معین گھرانوں کے سپرد ہوگئی۔ آنحضرتؐ نے بھی اس موقع پر کام کیا؛ آپؐ پتھر اپنے کندھوں پر اٹھا کر لاتے رہے، جس سے آپؐ کے شانے زخمی بھی ہو گئے۔ چار دیواری کوئی گز بھر بلند ہوئی تو ایک دشواری پیدا ہو گئی۔ کعبے کے دروازے کے مغرب کی دیوار کے زاویے میں حجر اسود [رکن یمانی] کو نصب کرنا تھا۔ اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے رقابت شروع ہو گئی اور قریب تھا کہ خون خرابہ ہو جائے کہ ایک بوڑھے ابو امیّہ حذیفہ بن مغیرہ نے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے مشورہ دیا کہ اس وقت جو شخص سب سے پہلے مسجد کے دروازے سے اندر آئے، اسے حَکم بناؤ۔ سب نے قبول کیا۔ اتفاق سے یہ آنحضرتؐ ہی تھے جو کام کرنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ آپؐ کو دیکھ کر سب لوگ پکار اٹھے : ھذا الامین رضینا بہ، یعنی یہ تو امین ہیں؛ ہم سب ان کے فیصلے پر راضی ہیں (ابن الجوزی، ص ۱۴۸)۔ قصہ سن کر آپؐ نے ایک چادر بچھائی، پتھر کو اس پر رکھا اور چادر کے کونے قبائل کے نمائندوں نے پکڑ کر اٹھائے اور دیوار کے قریب کیا۔ وہاں سے آنحضرتؐ نے [سب کی اجازت سے اور اس طرح سب کے متفقہ وکیل کی حیثیت سے] پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیا (ابن ہشام، سیرۃ، ۱ : ۲۰۴ تا ۲۰۹؛ [نیز رکن یمانی کعبہ].

روحانی ریاضت سے شغف : اہل مکہ اللہ تعالٰی کے وجود کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ بت تو اللہ تعالٰی کے ہاں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور بس (۳۹ [الزمر] : ۳)؛ چنانچہ بیت اللہ میں سیکڑوں بت جمع کر دیے گئے۔ رفتہ رفتہ بہت سے سلیم الطبع لوگوں کو اس سے تنفر پیدا ہو گیا اور ورقہ بن نوفل الاسدی، ابو سفیان الاموی، زید بن عمرو بن نفیل العدوی، قُس بن ساعدہ، عبیداللہ بن جَحش، عثمان بن الحویرث جیسے متعدد فطرت سلیمہ کے مالک لوگوں نے بت پرستی سے کنارہ کشی اختیار کر لی (ابن ہشام، ۱ : ۲۳۸ تا ۲۴۸).

مکہ مکرمہ میں عبادت کے لیے گوشہ نشین (معتکف) ہونے کا رواج عبدالمطلب نے شروع کیا تھا؛ وہ رمضان میں مہینا بھر غار حراء میں گزارا کرتے تھے (البلاذری : انساب، ۱ : ۸۴)، جس کی تقلید زید بن عمرو بن نفیل نے بھی شروع کی (کتاب مذکور،

مخطوطۂ استانبول ۲ : ۶۵۸) - آنحضرتؐ نے بھی غار حراء میں اعتکاف کیا۔ غار حراء مکہ مکرمہ کے مشرق میں کعبۃ اللہ سے کوئی تین میل کے فاصلے پر جبل النور کی چوٹی پر واقع ہے - جب حاجی منیٰ کو جاتے ہیں تو منیٰ سے کچھ پہلے یہ پہاڑ ان کے بائیں ہاتھ پر نظر آتا ہے - غار کا رخ قدرۃً کعبے کی سمت ہے اور متعدد چٹانوں کے ایک دوسرے پر پڑنے سے بنا ہے - [عمر مبارک کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مزاج میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ آپؐ خلوت کی تلاش میں رہتے (وکان یحبب الیہ الخلاء ، دیکھیے البخاری) - اسی جستجو میں آپؐ غار حرا میں پہنچے، جو آپؐ کو دشوارگزار راستے، کعبہ کے سامنے ہونے، نیز اس میں کامل تنہائی اور یکسوئی میسر ہونے کی وجہ سے پسند آیا] - جب آنحضرتؐ یہاں پہلی بار گئے تو کچھ توشہ ساتھ لیا ؛ پھر آپ کا یہ معمول بن گیا کہ کچھ دنوں کے بعد گھر تشریف لاتے اور ایک آدھ دن قیام کر کے اور توشہ لے کر پھر اسی غار میں تشریف لے جاتے تھے (البخاری : الصحیح) - ادھر سے گزرنے والے مسافروں اور مساکین کو بھی آنحضرتؐ شریک طعام کر لیا کرتے (ابن ہشام ، ۱ : ۲۵۲ ؛ [لوفا باحوال المصطفٰی ، ۱:۱۶۵]) - [غار حراء میں آپؐ کی عبادت و ریاضت کو ظاہر کرنے کے لیے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں : وکان یتحنث (البخاری : الصحیح ، ۱۰ : ۵) - تَحَنُّث کے معنی تَعَبُّد ، یعنی عبادت کرنے اور گناہوں سے بچنے کے ہیں ، مگر بقول علامہ عینی اس کے معنی غور و فکر اور عبرت پذیری کے ہیں (شرح صحیح البخاری، باب کیف کان بدؤ الوحی) - ابن الجوزی (الوفا ، ۱ : ۱۶۲) کے مطابق اس کا مفہوم متعدد راتوں کی مسلسل عبادت ہے .

اللہ تعالٰی کی طرف سے آپ کو ذہنی اعتبار سے بار نبوت اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا - اس موقع پر بار دگر شق صدر کا ذکر بھی ملتا ہے (ابن الجوزی : الوفا ، ۱ : ۱۶۶) - اور یہ بھی کہ اس مقصد کے لیے آپؐ کو رویائے صادقہ کے ذریعے بشارات دی جاتیں ، مستقبل کے واقعات سے آگاہ کیا جاتا اور بہت سے مخفی حقائق میں آپؐ کی رہنمائی کی جاتی - یہ سلسلہ کم و بیش چھے ماہ تک جاری رہا - روایات میں ہے کہ آپؐ رات کو جو بھی خواب دیکھتے، بیدار ہونے کے بعد صبح کی روشنی کی طرح اس کی صاف شفاف تعبیر ظاہر ہو جاتی تھی (البخاری : الصحیح ، باب کیف کان بدؤ الوحی)؛ علاوہ ازیں غیبی آوازیں بکثرت سنی جانے لگیں ، حتّٰی کہ آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا : مجھے خطرہ ہے کہ کہیں میری عقل متأثر نہ ہو جائے کیونکہ میں اکثر کوئی آواز سنتا ہوں ، مگر جب دیکھتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں ہوتا (ابن الجوزی، ۱: ۱۶۰) - مزید براں درخت اور پتھر آپؐ کو بلند آواز سے اسلام کرنے لگے - اس کے علاوہ بے شمار نشانات دیکھنے میں آتے رہے (الوفا ، ۱:۱۶۱)].

بعثت مبارکہ : جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عمر قمری اعتبار سے چالیس سال کی ہوئی تو روح الامین آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئے - اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم غار حراء میں تشریف فرما تھے- اس وقت ان کے ہاتھ میں دیبا کے جزدان میں لپٹی ہوئی ایک کتاب تھی - انھوں نے آپؐ سے کہا : اِقرأ (پڑھ)- آپؐ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا : مجھے پڑھنا نہیں آتا - اس پر اس نے مجھے زور سے بھینچا؛ پھر مجھے چھوڑ کر کہا : پڑھ - میں نے پھر وہی جواب دیا کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا - اس نے دوبارہ مجھے بڑے زور سے بھینچا ؛ پھر چھوڑ کر کہا: پڑھ - میں نے پھر وہی جواب دہرایا تو اس نے تیسری مرتبہ اس زور سے بھینچا کہ میں تھک کر چور ہو گیا - بعد ازاں اس نے چھوڑ کر کہا : پڑھ -

اس پر میں نے کہا: کیا پڑھوں؟ اس نے کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۹۶ [العلق]: ۱ تا ۵)، یعنی پڑھیے اپنے پروردگار کے نام سے، جو خالق ہے، جس نے انسان کو منجمد خون سے پیدا کیا ہے، پڑھیے کہ آپ کا رب نہایت بزرگ، کرم والا، ہے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی، اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔ جب تکمیل ہوگئی تو وہ چلے گئے اور یہ عبارت میرے ذہن میں نقش ہوگئی (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۱۹۴ ببعد، بیروت ۱۹۶۰ء؛ ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۲۵۱ تا ۲۵۴، مطبوعہ قاہرہ)۔ البلاذری (انساب، ۱: ۱۱۱) کے مطابق، وضو اور نماز کا طریقہ بھی اس کے ساتھ ہی حضرت جبریلؑ نے آپؐ کو سکھایا۔ آپؐ سخت گھبراہٹ کے عالم میں گھر تشریف لائے؛ حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: مجھے کمبل اڑھاؤ۔ جب طبیعت سنبھلی تو حضرت خدیجہؓ کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔

[مختلف روایتوں پر بحث و تمحیص کے بعد علامہ السہیلی (روض الانف، ۱: ۱۵۲ ببعد) نے خلاصہ یہ نکالا ہے کہ اولاً بشارت نبوت خواب میں بوقت شب ہوئی، پھر حالت بیداری میں نزول قرآن کا آغاز ہوا۔ علامہ قسطلانی (المواہب مع شرح الزرقانی، ۱: ۲۰۷، قاہرہ ۱۳۲۰ھ) نے علامہ ابن البرّ کے حوالے سے بروز دو شنبہ ربیع الاول اور ابن القیم (زاد المعاد) کے حوالے سے ۱۷ رمضان المبارک کو نزول قرآن کی روایت کی ہے۔ اس کی شرح میں الزرقانی نے لکھا ہے کہ ربیع الاول سے رمضان المبارک تک صرف خوابوں (رویائے صالحہ) میں بشارات نبوت دی جاتی رہیں۔ گویا نزول قرآن کے لیے ذہنی طور پر آپؐ کو تیار کیا جاتا رہا اور ۱۷ رمضان المبارک کو نزول قرآن کا آغاز ہوا (نیز دیکھیے شرح سفر السعادۃ؛ سلیمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۱: ۴۷، مطبوعہ لاہور۔

حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دیتے ہوئے کہا: بخدا! اللہ آپؐ کو رسوا (یا ضائع) نہیں کرے گا کیونکہ آپؐ تو صلہ رحمی کرنے والے، صداقت شعار اور راستباز، دوسروں کا بار اٹھانے والے، محتاجوں کی مدد کرنے والے، مہمان نواز اور مصائب میں دوسروں کے مددگار ہیں (البخاری: الصحیح، ۱: ۵، مطبوعہ لائیڈن)۔ آپؐ کی رفیقۂ حیات کی یہ گواہی، آپؐ کے کردار کی عظمت، آپؐ کے اخلاق کی بلندی اور آپؐ کے محاسن کی بڑائی کی روشن دلیل ہے۔ انسان دوسروں سے تو چھپا رہ سکتا ہے، مگر رفیق زندگی سے نہیں۔ حضرت خدیجہؓ کے ان الفاظ میں ان کے پندرہ سالہ عینی مشاہدات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے]۔

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جو عیسائی عالم تھے۔ البخاری (الصحیح، ۱: ۵) کے مطابق اس نے قصہ سنا تو پکار اٹھا کہ یہ تو وہی ناموس اعظم ہے جو حضرت موسیٰؑ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا تھا (ناموس Namos یونانی لفظ ہے، جس کے معنے قانون کے ہیں اور لفظ تورات کا ترجمہ یونانی میں اسی لفظ سے کیا جاتا ہے)۔ البلاذری (انساب الاشراف، ۱: ۱۰۶) کے مطابق ورقہ نے [ایک دوسرے موقع پر] یہ بھی اضافہ کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ وہی نبیؐ ہیں جن کی حضرت عیسیٰؑ نے بشارت دی تھی۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں [جب کہ قوم آپؐ کو ستائے گی اور آپؐ کو اپنے شہر سے نکال دے گی، تاکہ آپؐ کی بھرپور مدد کروں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا سچ مچ میری قوم مجھے اپنے شہر سے نکال دے گی؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے کہا: بخدا! آج تک جو بھی اس دعوت کو لے کر آیا ہے اس کے ساتھ اس کی قوم نے یہی سلوک کیا ہے (البخاری: الصحیح، ۱: ۵)؛ پھر جلد ہی ان کی وفات ہوگئی]۔

اس کے بعد وحی میں تین سال تک فترت یعنی

وقفہ پڑ گیا ۔ اس وقفے کے دوران میں بعض اوقات آپؐ اس کے اعادے کی خواہش کے باعث بے چین اور بے قرار ہو جاتے تو افق آسمان پر دوبارہ اسی ناموس اعظم کی جھلک نظر آ جاتی جو آپؐ کو یقین دلاتا کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور وہ جبریلؑ ہیں (ابن سعد : الطبقات، ۱:۱۹۶ ، مطبوعہ بیروت) ۔ تین سال کے اس انقطاع کے بعد وحی مسلسل آنے لگی.

[اسلام کی دعوت و تبلیغ اور السابقون الاولون:

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جب نبوت سے نوازا گیا تو آپؐ نے سب سے پہلے ان لوگوں کو تبلیغ فرمائی جو کہ آپؐ کے ساتھ ذاتی روابط اور تعلقات رکھتے تھے ۔ آپؐ کو اپنے ان قریبی رفقا کی طرف سے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا ۔ عورتوں میں آپؐ کی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجہؓ ، غلاموں میں آپؐ کے جانثار خادم حضرت زیدؓ بن حارثہ ، مردوں میں آپؐ کے وفادار رفیق حضرت ابوبکرؓ ، چھوٹی عمر کے لڑکوں میں آپ کے عم زاد حضرت علیؓ نے پہلے پہل اسلام قبول کیا (الیعقوبی : تاریخ ، ۲ : ۲۲ تا ۲۴ ، بیروت ۱۹۶۰ء) ۔ حضرت عمرو بن عَبَسَہ السُّلَمی اور خالد بن سعید بن العاصی نے بھی اسی ابتدائی عرصے میں اسلام قبول کیا جوامع السیرۃ، ص ۴۶]۔ خفیہ دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ تقریباً تین سال تک جاری رہا ۔ اسی عرصے میں حضرت ابوبکرؓ کی تبلیغی کوششوں سے حضرت بلالؓ بن رباح ، حضرت عثمانؓ بن عفان ، زبیرؓ بن العوام ، عبدالرحمنؓ بن عوف ، سعدؓ بن ابی وقاص ، طلحہؓ بن عبیداللہ وغیرہ کئی حضرات نے اسلام قبول کیا (ابن ہشام ، ۱ : ۲۶۷ تا ۲۶۹ ؛ دوسرے حضرات کے ناموں کے لیے دیکھیے حوالۂ مذکور، ۲۶۹ تا ۲۸۰ ؛ [ابن سید الناس : عیون الاثر ، ۱:۹۱ ببعد ؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۱:۴۳۲ ببعد ؛ المقریزی : الامتاع ، ص ۱۵ ؛ تاریخ الخمیس ، ۲۸۶ ببعد)].

ابتدا میں تبلیغ سینہ بہ سینہ اور محدود حلقۂ احباب میں ہوتی رہی ۔ پھر وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶ [الشعراء] : ۲۱۴) یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے کی آیت نازل ہوئی ، جو سماجی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ناگزیر تھی تو آنحضرتؐ نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو کھانے پر مدعو کیا اور سب لوگوں کو اسلام کی دعوت دی ۔ ابو لہب کو آنحضرتؐ سے کد تھی ، اس نے اس موقع پر بد زبانی سے جلسہ درہم برہم کر دیا...صرف حضرت علیؓ نے کھڑے ہو کر اپنی جانثاری کا اعلان فرمایا (الطبری ، ۱:۱۱۷۲ ببعد).

دعوت عام : جب خفیہ تبلیغ سے کسی قدر اسلام پھیل گیا تو حکم آیا : فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۵ [الحجر] : ۹۴)، یعنی آپؐ کو جو حکم دیا جاتا ہے وہ برملا بیان کر دیجیے اور مشرکوں سے کنارہ کش رہیے ۔ [اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آواز دے کر تمام اہل مکہ کو کوہ صفا کے نیچے جمع کر لیا ۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو اول آپؐ نے پوچھا کہ اگر میں تمہیں بتلاؤں کہ اس پہاڑی کی دوسری جانب ایک لشکر جرار تم پر یلغار کرنے والا ہے تو کیا تم مان لو گے ؟ سب نے تصدیق کی تو آپؐ نے مکہ مکرمہ میں آباد ایک ایک قبیلے کا نام لے کر فرمایا کہ مجھے اللہ نے تمہاری طرف عذاب شدید سے ڈر سنانے کے لیے مامور کیا ہے ۔ لہذا اگر تم دونوں جہانوں کی کامیابی چاہتے ہو تو پڑھو لا الہ الا اللہ (ابن سعد : الطبقات ، ۱:۲۰۰ ، بیروت ۱۹۶۰ء) ۔ اس موقع پر بھی ابو لہب نے بد زبانی کی ، جس کا جواب قرآن مجید (۱۱۱ [ابی لہب]) میں دیا گیا].

اس اعلان عام کے بعد آنحضرتؐ کا طریقۂ تبلیغ یہ رہا کہ جہاں بھی کچھ لوگ نظر آتے ، آپؐ ان کو مخاطب کر کے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے اور طرح

طرح سے اسلام کی دعوت دیتے ۔ اس ابتدائی زمانے میں توحید باری ، نبوت اور حساب آخرت پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا اور اسی طرح اخلاق صالحہ اور نیکوکاری پر بھی۔ [اسی ابتدائی دور میں نماز کا حکم بھی نازل ہو چکا تھا ۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مدارج النبوۃ ، اردو ترجمہ ، ۱:۸۴، مطبوعۂ کراچی) اس موقع پر ایمان توحید کے بعد عبادات میں سب سے پہلے دو رکعت نماز فرض ہوئی ، جس کی حضرت جبریلؑ نے آپؐ کو تعلیم دی ۔ مقاتل کا قول ہے کہ اولاً دو رکعت نماز فجر اور دو رکعت نماز عشاء فرض ہوئی۔ حافظ ابن حجر (فتح الباری، کتاب الصلوٰۃ) فرماتے ہیں کہ اس پر تو اتفاق ہے کہ واقعۂ معراج سے قبل بھی آپؐ اور صحابہؓ نماز ادا فرمایا کرتے تھے، مگر یہ نمازیں کون کونسی تھیں ، اس میں کچھ اختلاف ہے ۔ بعض علما کے نزدیک صرف فجر اور عصر کی دو نمازوں کا سب سے پہلے حکم ہوا ۔ امام نوویؒ (شرح مسلم) کے مطابق پہلی نماز جو آپؐ پر فریضہ تبلیغ و دعوت کے بعد فرض ہوئی وہ رات کی نماز ، یعنی قیام اللیل ہے ، جیسا کہ سورۃ مزمل اور سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات سے مترشح ہوتا ہے ۔ البلاذری (انساب ، ۱ : ۱۱۱) نے بھی دو روایات اس مضمون کی نقل کی ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ کو ابتدائے وحی کے فوراً بعد وضو اور نماز کی تعلیم دی گئی] ۔ ہر نیا مسلمان اپنی جگہ ایک مبلغ بن کر اپنے حلقے میں تبلیغ شروع کر دیتا ۔ مرد اور عورتیں دونوں اس کام میں جوش و خروش سے شریک تھے (ابن سعد ، ۱ : ۲۰۰ ببعد).

ایذا رسانی : جب مکہ مکرمہ میں اسلام کی اشاعت ہونے لگی اور لوگ مسلمان ہونے شروع ہو گئے، جن میں بالخصوص نوجوان زیادہ تھے ، تو ان کے بڑوں کو بہت دکھ ہوا کہ ہماری اجازت اور مرضی کے بغیر یہ کیوں پرانے قومی دین سے برگشتہ ہو گئے ہیں ۔ اپنے ان نو عمر رشتہ داروں کو ان لوگوں نے طرح طرح سے ایذائیں دیں ؛ مارا پیٹا ، بیڑیاں لگا کر قید کیا ، بے چھت کے کمروں میں بند کیا ، تپتی ہوئی ریت پر برہنہ بدن گھسیٹا ، مگر یہ اذیتیں بے اثر رہیں ۔ ان لوگوں میں آزاد مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکہ لونڈی غلام بھی تھے جنہیں ان کے مالکوں نے شدید تکلیفیں دیں ۔ اسی طرح موالی ، یعنی غیر قبیلوں کے عرب بھی تھے، جو اہل مکہ میں سے کسی ایک کے ساتھ کسی معاہدے کے ذریعے حلیفی (موالی) بن گئے تھے ۔ ان میں سے ایک حضرت عمار بن یاسرؓ کا خاندان بھی تھا ، جس نے اپنے گھر میں ایک مسجد بنا لی تھی، جو اسلام میں اولین مسجد کہی جاتی ہے (السہیلی : روض الانف، ۲ : ۱۳ ؛ [انساب، ۱:۱۶۲] ؛ ابن کثیر: البدایۃ والنہایہ ، ۷ : ۳۱۱) ۔ [اس خاندان یعنی آل یاسر کو خاص طور پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا ۔ حضرت یاسرؓ پر اتنا تشدد کیا گیا کہ وہ شہید ہو گئے ۔ حضرت سمیہؓ کو ابو جہل نے نیزہ مار کر شہید کر دیا (انساب، ۱ : ۱۶۰)] ۔ باہر سے آنے والے سیاحوں اور مسافروں میں سے بھی کچھ مسلمان ہوے ۔ ان میں بعض نصرانی بھی تھے (ابن ہشام : سیرۃ، ص ۲۵۹ ، ۲۵۲) .

تحریر و ضبط قرآن : جب مسلمانوں کی تعداد بیس پچیس ہو گئی تو نازل شدہ سورتوں کی تحریر و کتابت عمل میں آنے لگی .

کتب سابقہ کے برعکس خدا کے آخری نبی نے کتاب اللہ کے تحفظ کے لیے ابتدا ہی سے تحریری اشاعت کا بندوبست کیا ۔ امت میں قرآن مجید کی اشاعت کا جو طریقہ تھا اس کے سلسلے میں ابن اسحق (مخطوطہ فاس؛ نسخہ زیر طبع، ص ۱۹۲) کی یہ روایت اہم ہے : اذا انزل القرآن علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرأہ علی الرجال ثم علی النساء، یعنی جب بھی آپؐ پر کوئی آیت قرآنی نازل ہوتی تو آپؐ اسے اولاً مردوں

کو پڑھ کر سناتے، پھر عورتوں کو۔ عام تعلیم قرآن ہی نہیں، خود زنانہ تعلیم قرآن کو آپؐ جو اہمیت دیتے تھے وہ خاص طور سے مد نظر رہے؛ مگر صرف سنانا کافی نہ تھا، زبانی یاد کرانا بھی ضروری تھا۔ اس کے لیے آنحضرتؐ اپنے کسی کاتب کو بلا کر خود املا کراتے، پھر اس سے پڑھوا کر سنتے اور ضرورت پر تصحیح کراتے۔ آپؐ نے حکم دیا تھا تھا کہ اس کے نسخے ہر مسلمان اپنے گھر میں رکھے، اس کو زبانی یاد کر کے نمازوں میں ہر روز پڑھا کرے اور یہ کہ زبانی یاد کرنے سے پہلے قرآن کی صحیح عبارت کی تعلیم خود آنحضرتؐ سے یا اس شخص سے پائے جسے آنحضرتؐ نے تعلیم قرآنی کی اجازت دی ہو۔ لکھنا، مستند استاد سے پڑھنا اور زبانی یاد کرنا، اس سہ گانہ تدبیر کا اہتمام، ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ آنحضرتؐ ہر سال رمضان المبارک میں نازل شدہ قرآن کا حضرت جبریلؑ سے دور فرماتے تھے (فیدارِسہُ القرآن)۔ بعض روایتوں کے مطابق آپؐ رمضان المبارک ہی میں قرآن مجمع عام میں پڑھتے اور لوگ اپنے اپنے نسخے لا کر تصحیح کر لیتے اور اس وقت تک نازل شدہ قرآن سے آگاہی حاصل کرتے۔ یہ عمل ''عرضۃ'' کہلاتا۔ عرضۂ اخیرہ کی بڑی شہرت ہے کہ یہ وفات سے چھے ماہ پہلے ہوا اور اس مرتبہ ایک کی جگہ دو مرتبہ آپؐ نے پورا قرآن پڑھ کر سنایا (البخاری: الصحیح، کتاب ۱، باب ۱، ص ۶، حدیث ۵؛ محمد حمید اللہ: دیباچہ فرانسیسی ترجمۂ قرآن مجید)۔

ایذا رسانی میں شدت: جلد ہی قرآن کریم میں بت پرستی کی مذمت میں شدت آ گئی اور اعلان کیا گیا کہ: اِنَّکُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَھَنَّمَ ط اَنْتُمْ لَھَا وٰرِدُوْنَ (۲۱ [الانبیاء]: ۹۸)، یعنی بے شک تم اور وہ بت جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو سب دوزخ کا ایندھن ہوں گے اور تم سب اس میں داخل ہو کر رہو گے۔ اس پر غیر مسلموں کی طرف سے ایذا رسانی میں بھی شدت آ گئی، آنحضرتؐ کی ذات کے خلاف بھی اور حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کے خلاف بھی۔

ابو جہل [رک بآن] یوں تو چھپ کر قرآن سنا کرتا، مگر اسے یہ دکھ تھا کہ اس کا اپنا قبیلہ (بنو امیہ)، جو سخاوت وغیرہ میں کبھی آنحضرتؐ کے قبیلہ بنو ہاشم سے پیچھے نہ رہا تھا، اب بنو ہاشم کے فخر نبوت کا مقابلہ نہیں کر سکتا؛ [اس نے اس کا جواب یوں دیا] کہ میں آنحضرتؐ کی نبوت ہی کو نہیں مانوں گا، اگرچہ وہ جو کچھ تعلیم دیتے ہیں وہ ٹھیک ہی ہے (ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۲۳۷ ببعد)۔ اسی زمانے میں ایک اجنبی کچھ اونٹ بیچنے مکہ مکرمہ آیا۔ ابوجہل نے کم مول پر اس سے وہ اونٹ ہتھیا لینے چاہے اور دوسروں کو بھی منع کر دیا کہ زائد رقم پیش نہ کریں۔ اس کی بدخلقی سے بچنے کے لیے اور مقامی خریدار تو چپ ہو گئے لیکن جب اجنبی نے آنحضرتؐ کو اپنا دکھ سنایا تو آپؐ نے معقول قیمت پر ان کو خرید لیا (البلاذری: انساب، ۱: ۱۳۰)۔ اس پر ابو جہل چھچھورے پن پر اتر آیا۔ ایک دن کسی جگہ اونٹ ذبح ہوا تھا۔ ابو جہل نے عُقبہ بن ابی معیط کو بھیجا کہ جا کر اوجھڑی اٹھا لائے اور جب آنحضرتؐ کعبے کے سامنے سجدے میں جائیں تو وہ آپ کی پیٹھ پر رکھ دے۔ یہ اتنی بوجھل تھی کہ آپ سجدے سے سر نہ اٹھا سکے۔ حضرت فاطمہؓ بچی تھیں۔ اطلاع ملی تو دوڑی آئیں اور نہ صرف غلیظ بوجھ کو دور کیا [بلکہ ابو جہل کو ملامت بھی کی (انساب، ۱: ۱۲۵)]۔ ابن الجوزی (المجتبیٰ من المجتنیٰ، مخطوطہ) نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ اس پر ابو جہل نے ننھی بچی کو زور سے طمانچہ مارنے سے بھی دریغ نہ کیا، جس

سے حضرت فاطمہؓ رونے لگیں (البلاذری : انساب ۱ : ۱۶۰).

ایک دن آنحضرتؐ بیت اللہ شریف کے سامنے نماز پڑھ رہے تھے کہ عُقبہ بن ابی مُعَیْط نے اپنی چادر کو لپیٹ کر حضورؐ کی گردن میں گرہ ڈالی اور اس شدت سے بل دیے کہ حضورؐ کا دم گھٹنے لگا۔ بعض نیک دل حاضرین نے آپ کو اس سے چھٹکارا دلایا (السہیلی ، ۱ : ۱۸۴ ؛ [الوفا ؛ ۱۹ ؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۱ : ۴۷]).

(ابو لہب کی بیوی) ام جمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی چچی ہونے کے باوجود درختوں کی ٹہنیاں لاتی اور آنحضرتؐ کے راستے میں ڈال دیتی۔ جب آنحضرتؐ رات کو اندھیرے میں گھر آتے تو آپؐ اس سے تکلیف اٹھاتے (ابن ہشام ، ۱ : ۳۸۱ السہیلی ، ۱ : ۱۸۴)۔ خود ابو لہب آپؐ کے مکان کے دروازے پر اور راستے میں گندگی اور غلاظت پھینک دیتا۔ ایک دن آپ کے دوسرے چچا حضرت امیر حمزہؓ نے دیکھ کر ملامت کی اور اس کے ساتھ اس کی لائی ہوئی غلاظت اس کے سر پر انڈھیل دی۔ اب ابو لہب نے دوسروں کو اجرت دے کر اس کام کے جاری رکھنے پر مامور کیا (البلاذری : انساب ، ۱ : ۱۳۱ ، ۱۳۷)۔

بارہا [رؤساے قریش کی شہ پر قریشی آوارہ مزاج لونڈے] رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو راستے میں پتھر مارتے اور آپ کا مذاق اڑاتے اور طرح طرح سے تنگ کرتے۔ اگر کبھی اتفاق سے یہ اس جگہ پیش آتا جہاں ابو سفیان کا مکان تھا تو آپؐ پناہ لینے کے لئے اس کے گھر میں گھس جاتے اور یہ شریف دشمن لونڈوں کو گھرک کر دفع کرتا ، اور جب وہ جا چکتے تو آنحضرت اپنا راستہ لیتے۔ ہمارا مأخذ (ابن الجوزی) یہ اضافہ کرتا ہے کہ فتح مکہ کے دن کی منادی ''جو ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے تو اسے امن ہوگا'' اس کی شکر گزاری میں تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرح صحابہ کرامؓ اور صحابیات صالحاتؓ کو بھی سخت اذیتیں پہنچائی جاتی رہیں۔ حضرت بلال حبشیؓ، حضرت صہیبؓ رومی، حضرت عَمّار بن یاسرؓ، حضرت خباب بن الارتؓ اس کی واضح مثالیں ہیں (البلاذری : انساب ، ۱ : ۱۵۶ تا ۱۹۸)۔ خواتین میں حضرت لُبَیْنہؓ ، حضرت ام عُبَیْسؓ ، حضرت سُمَیّہؓ (ام عمار) وغیرہ لونڈیاں بھی ہر اذیت کو جھیلتیں لیکن زبان پر کلمہ کفر نہ لاتیں۔ اس سے کہنا پڑتا ہے کہ آزاد مردوں عورتوں کا ہی نہیں غلاموں اور لونڈیوں کا بھی روحانی معیار اور ذہنی حوصلہ بہت بلند تھا اور انہیں اپنی مادی ہی نہیں روحانی زندگی سے بھی بے پناہ دلچسپی تھی ؛ بعض لونڈی غلاموں کو ناقابل برداشت اذیت سے بچانے کے لئے حضرت ابوبکرؓ وغیرہ [نے ان کو خرید خرید کر آزاد کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چناچہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ، عامر بن فُہَیرہؓ، لبینہؓ، زِنّیرہؓ، نَہدیہؓ، ام عُبَیْسؓ کو بھاری داموں پر خریدا اور آزاد کر دیا (شبلی ، ۱ : ۲۳۲)].

لیکن جلد ہی یہ نا ممکن ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم امن و سکون سے مکے میں کوئی تبلیغی کام کر سکیں۔ اس لئے آپؐ مضافات تشریف لے جانے لگے ، خصوصاً حج کے لیے جو اجنبی یہاں وارد ہوتے آپؐ ان کو اسلام کی تبلیغ فرماتے۔ ابو لہب کو آپؐ سے اتنی کد اور عداوت ہو گئی تھی کہ ہر جگہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جب بھی آپ کسی سے مخاطب ہوتے تو شور مچا دیتا اور غلط سلط باتیں کر کے اس اجنبی کو بات سننے سے روک دیتا (ابن ہشام ، سیرۃ ، ۱ : ۳۸۶ ، ۳۸۰)۔ بعثت پر تقریباً پانچ سال گزرے تھے۔ چالیس پچاس آدمی مسلمان بھی ہو گئے تھے ، لیکن ایذا رسانی اتنی شدید

ہو گئی تھی کہ آنحضرتؐ ایک مخلص مسلمان حضرت ارقم بن ابی ارقم [رک بآں] کے گھر میں، (جو جبل صفا کے سامنے تھا، لیکن اب مسجد کعبہ کی توسیع کے باعث وہ حرم کے اندر آ گیا ہے) مجلس لگانے لگے۔ مسلمانوں کو اس مرکز کی اطلاع تھی؛ چنانچہ اگر کوئی اجنبی مسلمان ہونے کے لئے آتا تو اہل اسلام اس کو بھی بیت الارقم پہنچا دیا کرتے تھے۔ بیت الارقم اتنا کشادہ تھا کہ اس میں تیس آدمی آنحضرتؐ کے ساتھ نماز با جماعت پڑھ سکتے تھے۔

قریش کی معاندانہ تدبیریں: قریش کو جب اس طرح مخالفت کر کے کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اس مقصد کے لئے بالواسطہ طریقے اختیار کئے۔ [چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو] روپے پیسے، خوبصورت لڑکیوں، حتیٰ کہ مکے کی بادشاہت کی لالچ دلائی صرف ایک شرط پر کہ آپؐ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں۔ آنحضرتؐ نے ان کے جواب میں سورۂ ۴۱ [حٰمٓ السجدہ] کی آیات سجدہ تلاوت فرمائیں۔ پھر فرمایا: اے ابو ولید! جو کچھ تم نے سنا یہی اس کا جواب ہے (ابن ہشام: سیرۃالنبویہ، ۱: ۳۱۳ تا ۳۱۴)۔ پھر ایک مرتبہ یہ کہا کہ ہم سب تمہارے رب پر ایمان لانے کو تیار ہیں، لیکن تو بھی ہمارے بتوں پر ایمان لا۔ [اس کے جواب میں سورۂ ۱۰۹ (کافرون) [رک بآں] نازل ہوئی]۔ جب ہر طرف سے ہار گئے تو [ابو جہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ سرداران قریش] جناب ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم تمہاری بڑی عزت کرتے ہیں، لیکن تمہارا بھتیجا [ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے دین میں کیڑے ڈالتا ہے، ہمارے داناؤں کو بے وقوف اور بزرگوں کو گمراہ ٹھیراتا ہے۔ اور] باپ بیٹے، بہن بھائی، میاں بیوی میں تفرقہ ڈال کر ناقابل برداشت فساد پھیلا رہا ہے۔ اسے روکو؛ تمہاری خاطر ہم نے اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی؛ اگر تم نہ روکو گے تو ہم مجبور ہو جائیں گے کہ جبراً اسے چپ کرائیں۔ [اس موقع پر ابوطالب بھی اپنی قوم کی شدید مخالفت سے گھبرا گئے۔ اور آپؐ کو بلا کر ساری بات بیان کر دی اور اپنی کمزوری اور ضعف کا واسطہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ بخدا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند بھی رکھ دیں اور مجھے اس تبلیغ سے روکیں تو میں ہرگز نہیں رکونگا، تاآنکہ یا تو یہ دین غالب ہو جائے یا میں جان کھو دوں۔ یہ کہتے ہوئے آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ابو طالب بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دوبارہ اپنی مدد کی آپؐ کو یقین دہانی کرائی (ابن ہشام: سیرۃ، ۱: ۲۸۳ تا ۲۸۵)]۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ قریش نے یہ تجویز پیش کی کہ محمدؐ کو ہمارے سپرد کر دو؛ ہم اسے قتل کر کے ملک کو فساد سے نجات دلانا چاہتے ہیں اور اس کے معاوضے میں جس خوبصورت عقلمند مکی نوجوان کو چاہو چن لو، ہم وہ تمہیں دے دیں گے کہ اسے متبنّیٰ بنا لو۔ ابو طالب نے پر لطف جواب دیا کہ یہ تو انصاف نہیں کہ تم تو میرے بیٹے کو قتل کر دو اور میں تمہارے بیٹے کو ساری عمر کھلاؤں پلاؤں (حوالہ مذکور)۔

حضرت حمزہؓ کا قبول اسلام: آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن شکار سے واپسی پر ان کی لونڈی نے ان کو بتایا کہ آج تمہارے بھتیجے محمدؐ کو ابو جہل نے غیر معمولی طور پر سخت تکلیف دی ہے۔ حمیت میں آ کر سیدھے ابو جہل کے پاس پہنچے۔ اپنی فولادی کمان سے اس پر وار کر کے اسے زخمی کیا اور کہا کہ کیا تو سمجھتا ہے کہ محمدؐ کا کوئی چچا، کوئی محافظ نہیں؟ سن لو، میں بھی مسلمان ہو گیا ہوں (ابن ہشام، ۱: ۳۱۱ ببعد)۔ [بعد ازاں

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ ۶ نبوت کا ہے (السہیلی: روض الانف، ۱ : ۱۸۵ ؛ [نیز رک بہ حمزہؓ]).

حضرت عمرؓ کا قبول اسلام : حضرت عمرؓ فاروق کو بھی شروع میں اسلام اور اہل اسلام سے بے وجہ عداوت تھی؛ [چنانچہ وہ بھی دوسرے مشرکین کی طرح] اسلام لانے والوں کو ستاتے ، لیکن جب دیکھا کہ ہر طرح کی ایذا رسانی کے باوجود اسلام پھیلتا ہی جا رہا ہے تو ایک دن ایک خطرناک فیصلہ کیا کہ (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کو ہی قتل کر دیں۔ ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ آنحضرتؐ کی تلاش میں نکلے۔ راستے میں نُعیمؓ بن عبداللہ (جو ایک مسلمان تھے) ملے۔ ان کا خطرناک ارادہ سن کر کہا : عمر! پہلے اپنے گھر کی خبر لو ؛ تمہاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ لہذا بنی ہاشم کے طاقتور قبیلے سے جنگ مول لینے سے پہلے اپنے کنبے کو تو درست کرو۔ فوراً بہن کے گھر گئے۔ تلاوت قرآن کریم کی آواز سنی تو صحت کا یقین ہو گیا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر میں ایک معلم قرآن حضرت خبابؓ بن الارت ان کو قرآن کریم پڑھا رہے تھے۔ ان کی بہن حضرت فاطمہؓ نے قرآن کے اوراق چھپا لیے۔ بہنوئی نے دروازہ کھولا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا پڑھ رہے تھے ؟ مجھے دکھاؤ اور اس کے ساتھ ہی اپنے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید کو مارنا شروع کر دیا۔ بہن نے چھڑانے کی کوشش کی تو ایک آدھ گھونسا انہیں بھی لگ گیا اور شاید منہ سے خون بہنے لگا۔ اب بہن نے جوش میں آ کر فرمایا جو چاہو کر لو؛ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بہن کو زخمی دیکھا تو شرمندہ ہوئے اور نرمی سے کہنے لگے کہ مجھے بتاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ حضرت عمرؓ اب بالکل پگھل گئے اور کہا میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں تمہارا دین کیا ہے ؟ حضرت فاطمہؓ نے جوش کے عالم میں تلخ ترش باتیں کیں۔ پھر فرمایا : جاؤ پہلے غسل کر کے آؤ چنانچہ بعد از غسل حضرت عمرؓ نے اس صحیفہ مقدسہ سے سورۂ طہ [رک بآں] یا سورۂ حدید [رک بآں] (عبدالحق محدث دہلوی : مدارج النبوت ، ۵۸ ببعد) کی کچھ آیات پڑھیں تو ان کی کایا پلٹ گئی اور کہا یہ تو بڑی دلآویز چیز ہے۔ بتاؤ مسلمان کس طرح ہوتے ہیں ؟ اب استاد حضرت خبابؓ بھی بازو کے کمرے سے نکلے اور کہا : اے عمر ! کل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ ! ابو جہل یا عمر سے اسلام کو تقویت دے۔ خوشخبری ہو کہ یہ سعادت تمہارے حصے میں آئی ہے۔ پھر وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لے کر بیت الارقم آئے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر حضرت عمرؓ کو دیکھ کر اندر والوں کو ہچکچاہٹ ہوئی ، مگر آنحضرتؐ نے فرمایا : دروازہ کھول دو۔ جب حضرت عمرؓ اندر آئے تو آنحضرتؐ نے کپڑے سے پکڑ کر جھنجوڑا اور فرمایا : عمر تم کس ارادے سے آئے ہو؟ حضرت عمرؓ نے فوراً کلمۂ شہادت پڑھا۔ یہ اتنا اچانک اور غیر متوقع امر تھا کہ موجود صحابہؓ کے بے ساختہ نعرۂ تکبیر سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی اچانک غیر متوقع معاملہ پیش آتا تو اس پر تکبیر (اللہ اکبر) فرماتے۔ آپ کا یہ معمول خالصۃً اللہ کی توحید اور عظمت خداوندی کے اظہار کے لیے تھا۔ ایسا ہی حضرت عمرؓ کے اسلام لانے پر ہوا]۔ پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ! کفر تو اپنا مظاہرہ علانیہ کرتا ہے ، مگر ہم دین حق کے باوجود اس کا اخفا کیوں کریں ؟ اس پر وہاں موجود تیس چالیس آدمی قطار باندھ کر نکلے۔ سب لوگ حرم کعبہ میں

پہنچے اور با جماعت نماز ادا کی ۔ کسی کافر کو ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو دعوت مبارزت دے (ابن ہشام ، سیرۃ ، ۱ : ۳۶۶ تا ۳۷۵) ۔ ایک دوسری روایت (حوالۂ مذکور) میں ہے کہ انہوں نے چھپ کر آنحضرتؐ کو تلاوت قرآن کریم کرتے سنا جس سے ان کے دل پر اثر ہوا اور وہ مسلمان ہوگئے ۔ البخاری (مناقب الانصار، ۶۳ : ۴۵ : ۱۸) میں بھی حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بارے میں ایک روایت ہے ۔ ان میں پہلی روایت ہی مشہور و مقبول ہے [نیز رک بہ عمرؓ ؛ السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۲۷۲ ببعد].

ہجرت حبشہ اولیٰ ۵ نبوی : مکے میں مسلمانوں پر مظالم روز افزوں دیکھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک دن ان سے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم لوگ حبشہ چلے جاؤ ؛ وہاں ایک نیک دل حکمران ہے جس کے ہاں حق کا پاس ہوتا ہے اور کسی پر ظلم نہیں ہوتا ؛ وہاں رہو تا آنکہ خدا تمہارے لیے چھٹکارے کی کوئی صورت پیدا کر دے (ابن ہشام، ۱ : ۳۴۴) ۔ گیارہ [یا بارہ مسلمان مردوں اور چار یا پانچ مسلمان عورتوں] کی پہلی جماعت نے ، جس میں حضرت عثمانؓ اور ان کی بیوی، آنحضرتؐ کی دختر، حضرت رقیہؓ بھی شامل تھے وہاں پہنچ کر خیر و عافیت کی اطلاع دی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۳ ببعد) ۔ اس پر مزید کچھ لوگ روانہ ہوے؛ [یہ جماعت ایک افواہ کی بنا پر کچھ عرصہ بعد واپس آ گئی، مگر پھر جب اذیت رسانی شدت اختیار کرگئی تو مکرر آپؐ کی اجازت سے ۸۳ مسلمانوں نے ، جن میں ۱۱ قریشی خواتین بھی تھیں، حبشہ کو ہجرت کی (ابن سعد، ۱ : ۲۰۷)] ۔ اس میں حضرت جعفر طیارؓ بن ابی طالب بھی تھے ان کو آنحضرتؐ نے ایک خط بنام نجاشی دیا (دیکھیے الوثائق السیاسیۃ ، عدد ۲۱)؛ غالباً یہ خط ان کو بطور تعارف و سفارش نامہ دیا گیا تھا .

کفار قریش نے مہاجرین حبش کو ، حبشہ سے واپس لانے کے لیے دو افراد عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص پر مشتمل ایک سفارت شاہ حبشہ کے پاس مع تحائف بھیجی ۔ انھوں نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کو اپنے گرانقدر تحائف اور اپنی چرب زبانی سے متأثر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور بادشاہ کو کہا کہ یہ ہمارے لونڈی غلام بد دین ہوکر یہاں پناہ گزین ہوگئے ہیں ، مگر نیک دل بادشاہ نے کہا کہ مناسب ہے کہ ان کی بات بھی سن لی جائے ؛ چنانچہ ان صحابہ کرامؓ کو بلایا گیا ۔ [اس موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر فرمائی اس نے نہ صرف شاہ حبشہ کو متاثر کیا، بلکہ صحابہ کرامؓ کی حق گوئی اور طلاقت لسانی کا ایک اعلی معیار بھی پیش کیا (دیکھیے ابن الجوزی)] ۔ اس پر شاہ حبشہ نے صحابہ کرامؓ کو واپس کرنے سے انکار کر دیا (احمد بن حنبل : مسند، ج ۱، مسند اہل بیت ؛ الحاکم : مستدرک ج ۲، کتاب التفسیر) ۔ دوبارہ اگلے روز مشرکین کی سفارت کی طرف سے نجاشی کے دربار میں مکرر یہ الزام تراشی کی گئی کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے منکر ہیں ۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفرؓ نے جواب دیا کہ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے پاکدامن حضرت مریمؓ کو عنایت فرمایا تھا ۔ اس جواب سے نجاشی مطمئن ہوگیا ۔ اس طرح مشرکین کی یہ سفارت مکمل طور پر ناکام ہوگئی .

جلد ہی حضرت ابوبکرؓ بھی ترک وطن کرکے حبشہ کی طرف عازم سفر ہوگئے۔ راستے میں برک الغماد کے مقام پر قبیلۂ قارہ کے سردار ابن الدَّغِنَۃ نے ، جو حضرت ابوبکرؓ کا رشتہ دار بھی تھا ، ان کے سفر کا سن کر افسوس ظاہر کیا ۔ وہ قریش کا فوجی حلیف اور با اثر شخص تھا ۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کو مکہ مکرمہ ساتھ لایا اور اعلان کیا : میں ابوبکرؓ کو اپنی پناہ میں

لیتا ہوں ؛ کوئی انھیں تکلیف نہ دے ۔ ابن الدّغنہ کی پناہ دھی کے دوران میں انھوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بنا لی ۔ وہ بڑے رقیق القلب تھے ۔ بھرائی آواز سے قرآن پڑھتے تو محلے کے غیرمسلم مرد عورتیں ، حتّٰی کہ لونڈی غلام بھی ان کی تلاوت قرآن کریم کو سننے آنے لگے۔ قریش مکہ کی شکایات پر نے ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس سے روکنا چاہا ، مگر حضرت ابوبکرؓ نے ابن الدغنہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں ، اللہ کی حفاظت کافی ہے (البخاری : الصحیح ، باب ہجرۃ المدینہ ؛ ابن ہشام : سیرۃ ، ۲:۱۱ تا ۱۳).

حیرت نہ ہو کہ حبشہ میں مسلمان پناہ گزین نجاشی کے دل سے شکر گزار تھے ؛ چنانچہ جب ایک بار ملک میں خانہ جنگی ہوئی تو ان مسلمانوں نے نجاشی کی فوج میں رضاکارانہ شرکت کر کے بڑی جانبازی دکھائی تھی (ابن ہشام ، ۱ : ۳۶۵) ۔ [ان مہاجرین میں سے کچھ (تقریباً تینتیس مرد اور آٹھ عورتیں) تو اس وقت واپس آئے جب انھیں آپؐ کی ہجرتِ مدینہ کی خبر ملی ۔ ان میں سے دو آدمی مکہ میں وفات پا گئے، سات وہاں محبوس کر لیے گئے اور بقیہ آپ کی خدمت میں پہنچ گئے ؛ ان میں سے چوبیس افراد نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت کی ۔ ۷ھ میں باقی ماندہ مہاجرین حبش اس وقت آپؐ کی خدمت میں باریاب ہوئے جب آپؐ خیبر فتح کر چکے تھے (دیکھیے ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۷ ؛ نیز رک بہ ہجرت)].

مقاطعۂ قریش (۷ نبوی) : مشرکین کو جب حبشہ سے ناکامی ہوئی تو انھوں نے شہر کے بے کس مسلمانوں کی ایذا رسانی میں اور اضافہ کر دیا اور پھر مشورۂ عام کے بعد ایک قرارداد لکھی اور اس پر حلف لیا گیا کہ کوئی شخص بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھے ، خرید و فروخت نہ کرے ، بلکہ ان سے بات چیت تک بھی نہ کرے (ابن ہشام ، ۱:۳۷۵ ببعد)۔ اہمیت دینے کے لیے اسے کعبے کے اندر لٹکا دیا گیا تھا ۔ [دیگر قبائل (بنو) کنانہ نے بھی اس معاہدے میں شرکت کر کے اس کو تقویت پہنچائی ۔ جناب ابو طالب اپنے خاندان والوں سمیت شِعب ابی طالب میں محصور ہو گئے] ۔ یہ بڑا سخت معاملہ تھا ۔ بنو ہاشم کے تین سال بڑی مصیبت میں گزرے ؛ صرف حج کے زمانے میں اجنبی تاجروں سے کچھ لین دین کیا جا سکتا تھا اور اسی موسم میں آپؐ وعظ و تبلیغ فرما سکتے تھے ، لیکن مکے میں تجارتی مقاطعے کی باعث اندوختہ جلدی ہی ختم ہو گیا اور سال بسال کی اس خرید و فروخت کے کے امکان سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو سکا ۔ حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار کبھی کبھار مخفی طور پر کچھ اشیا بھیج دیتے، مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا؟ ایک دو آدمی نہیں ، یہاں دو قبیلوں کے افراد تھے۔ اس دوران میں بھوک مٹانے کے لیے بنو ہاشم نے جڑی بوٹیاں تک کھائیں اور سوکھے اور بدمزہ چمڑے ابال کر تناول کیے۔ اس خاندان کے مسلمان اور غیر مسلم رشتہ دار سبھی اس کا ہدف بنے (بجز ابو لہب کے کہ اس نے قبیلے کا ساتھ چھوڑ کر شہر ہی میں سکونت رکھی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۸ تا ۲۱۰ ؛ السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۲۲۰ و ببعد ؛ ابن ہشام ، ۱:۳۷۵ تا ۳۷۸).

مکہ مکرمہ میں کچھ نیک دل لوگ بھی تھے ، مگر ابوجہل ان کی پیش نہ چلنے دیتا تھا ۔ آخر ہشام بن عمرو بن ربیعہ العامری کی کوششوں سے زہیر بن ابی امیہ ، حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار مطعم بن عدی، نیز زمعہ بن الاسود اور ابوالبختری بن ہاشم، مختلف قبائل کے لوگوں نے رات کو ایک مخفی جلسے میں اس معاہدے کی منسوخی کا طریقۂ کار مرتب کیا ۔ پھر صبح کو کعبۃاللہ کے پاس اپنے اپنے حلقے میں جمع ہوئے ۔ طواف کے بعد اولاً زہیر نے اعلان کیا کہ جب تک اس خلاف انسانیت مقاطعہ

کو ختم نہ کیا جائے گا، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ ابوجہل نے مخالفت کی تو باقی چار نیک دل اصحاب نے بھی اپنے اپنے قبیلے کی طرف سے یکے بعد دیگرے مقاطعے کی منسوخی کا اعلان کیا۔ [۱۰ نبوی میں یہ مقاطعہ ختم ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے رفقا شعب ابی طالب سے باہر تشریف لائے] (ابن ہشام: سیرۃ، ۲: ۱۴ تا ۲۱؛ [انساب الاشراف، ۱: ۲۳۳ تا ۲۳۶؛ جوامع السیرۃ، ص ۶۴؛ الوفا، ۱: ۱۹۷ تا ۱۹۹]).

عام الحزن (۱۰ نبوی): آپؐ کو اور آپ کے رفقا کو اس مصیبت سے نجات تو مل گئی، لیکن قریش کے سہ سالہ مقاطعے نے بہت سے افراد کی صحتیں برباد کر دیں۔ آنحضرتؐ شہر میں تشریف لائے تو جلد ہی ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ اور چچا ابو طالب وفات پا گئے۔ یہ واقعہ ۱۰ نبوی کا ہے۔ آنحضرتؐ نے کوشش تو بہت کی کہ ابوؔ طالب کو کلمۂ شہادت پڑھنے پر آمادہ کریں، مگر ابو جہل وغیرہ مشرکین مکہ کی طعن و تشنیع کے باعث کہا تو آخر دم صرف یہ کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں (ابن ہشام، ۲: ۵۸ تا ۶۰؛ السہیلی، ۱: ۲۵۸).

سفر طائف: ابو طالب کی وفات پر ابولہب بنو ہاشم کا سردار بنا۔ شروع میں تو اس نے اعلان کر دیا کہ آنحضرتؐ اپنے اقوال و اعمال کے خود ذمہ دار ہیں، خود وہ اس سے بری ہے۔ [یہ اعلان گویا آپؐ کو برادری سے خارج کر دینے کے مترادف تھا] کہ جو چاہے آپ کو (معاذ اللہ) قتل کر دے، قبیلہ آپؐ کی حمایت نہ کرے گا۔ [اس محاصرے سے نکلنے کے بعد دوسرا انقلاب یہ آیا تھا کہ سرداران قریش نے آپؐ کے خلاف گھیرا تنگ کر دیا؛ چنانچہ کچھ لوگ ہر وقت آپؐ کا تعاقب جاری رکھتے اور جہاں آپؐ وعظ فرمانا چاہتے آپؐ کو روک دیا جاتا، یا شور و غل مچا دیا جاتا۔ علاوہ ازیں بیت اللہ شریف میں نماز پڑھنے کے دوران آپؐ پر گندگی اور غلیظ اوجھڑی رکھ دینے کے واقعے سے بھی پتا چلتا ہے کہ آپؐ کے لیے اس علاقے میں رہنا مشکل کر دیا گیا تھا]۔ بے بسی کے عالم میں آپؐ ۲۰ شوال ۱۰ نبوی کو اپنے خادم حضرت زیدؓ بن حارثہ کے ہمراہ طائف تشریف لے گئے، جہاں آپؐ کی والدہ کے کچھ رشتہ دار تھے۔ یہاں ان دنوں عمرو بن عمیر کے تین بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب برسراقتدار تھے۔ آپؐ یہاں دس روز ٹھیرے؛ ان لوگوں کو سرمایہ داران قریش کی مخالفت کی کہاں ہمت ہوسکتی تھی۔ ان کا [جواب اور رویہ حوصلہ شکن تھا]۔ تینوں بھائیوں نے آپؐ کی نہ صرف یہ کہ بات نہ سنی بلکہ شہر کے لونڈوں اور اوباشوں کو بھی "شہر بدر" کرنے کے لیے آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ انھوں نے پتھر مار مار کر آپؐ کو زخمی کیا۔ [کثرت سے خون نکلنے کی وجہ سے جوتے پاؤں کے ساتھ چپک گئے]۔ پھر ایک باغ کے پاس [جو عتبہ و شیبہ، فرزندان ربیعہ، کی ملکیت تھا آپؐ] پہنچے تو ان کے نیک دل عیسائی [غلام عدّاس نے اپنے آقاؤں کے کہنے کے مطابق] کچھ میووں سے آپؐ کی ضیافت کی۔ [وہ غلام آپؐ سے اس قدر متاثر ہوا کہ بے ساختہ آپؐ کے سر، ہاتھ اور قدم چوم لیے]۔ اس بے بسی کے عالم میں آپؐ نے جو دعا کی وہ یہ تھی: اے اللہ! میں تیرے پاس اپنے ضعف، اپنے وسائل کی کمی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بےقدری کی شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الرّاحمین! کمزوروں اور عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ کسی ایسے بیگانے کے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے یا کسی ایسے دشمن کے جسے تو میرے معاملے پر قابو دے دیتا ہے؟ لیکن اگر تو مجھ سے خفا نہیں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ تیری عافیت

ھی میں میرے لیے بڑی وسعت ھے ۔ میں تیرے بزرگ چہرے کے نور کے واسطے سے ، جس نے تاریکیوں کو روشن کیا ھے اور جس کے سبب ھی سے دنیا و آخرت کے امور ٹھیک حالت میں ھیں ، اس بات سے پناہ طلب کرتا ھوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ھو، یا مجھ پر تیری خفگی اترے ۔ عتاب کا حق تجھی کو ھے یہاں تک کہ تو راضی ھو جائے ۔ کوئی طاقت اور کوئی قوت نہیں بجز اس کے کہ تیرے ھی ذریعے سے ھو ۔ [طائف سے واپس تشریف لاتے ھوے مزید یہ بھی فرمایا کہ میں ان لوگوں کی تباھی کے لیے کیوں بد دعا کروں ؟ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو امید ہے کہ آئندہ ان کی نسلیں ضرور ایمان لائیں گی (الوفا ، ۱ : ۲۱۱ تا ۲۱۴)].

آزمائش کی گھڑی ختم ھو گئی تھی اور اس دعا کی مقبولیت کے آثار فوراً ظاھر ھونے شروع ھوگئے ۔ رات ھوئی تو آنحضرتؐ وھاں سے پیدل مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ھوے ۔ نخلہ پہنچ کر منزل کی اور جب نماز پڑھنے لگے تو کچھ جن جب ادھر سے گزرے تو قرآن کی آواز سن کر آپؐ کے دست حق پرست پر مسلمان ھو گئے اور پھر اپنی قوم میں بھی جا کر تبلیغ کرنے لگے (۴۶ [الاحقاف] : ۲۹ تا ۳۲).

چونکہ آپؐ کی برادری نے آپ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے آپؐ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر رک گئے اور ایک خزاعی کے ذریعے ایک ممتاز سردار اور حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار مطعم بن عدی کے پاس بھیجا کہ مجھے اپنی حمایت میں لے لو ۔ اس نے فوراً درخواست قبول کر لی اور اپنے بیٹوں کو لے کر مسلح حالت میں جبل حرا کے پاس پہنچا اور وھاں سے آنحضرتؐ کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ لایا اور اپنی اور اپنے بیٹوں کی تلواروں کے سائے میں طواف کعبہ کروایا اور اپنی حمایت کا برملا اعلان کیا ۔ پھر آپؐ اپنے گھر جا سکے (الطبری : تاریخ ، ۱ : ۱۲۰۳ تا ۱۲۰۴؛ ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۲۱۰ تا ۲۱۳).

[اسراء و معراج : اس امر میں کسی قدر اختلاف ھے کہ واقعۂ معراج کب اور کس تاریخ کو پیش آیا ، نیز یہ کہ یہ واقعہ ایک دفعہ پیش آیا یا متعدد مرتبہ ؟ مستند اور محقق روایات کے مطابق اس واقعے کا وقوع ایک ھی مرتبہ ھوا ۔ تعدد کے قائلین کا استشہاد تعدد و اختلاف روایات سے ھے جب کہ یہ اختلاف جزئیات کے بیان میں ھے نہ کہ اصل واقعہ کے بیان میں ۔ پھر باقاعدہ نظام کتابت نہ ھونے کی وجہ سے ایسے واقعات کے راویوں میں اختلاف کا پایا جانا غیر متوقع بھی نہیں ۔

عام طور پر اس واقعے کے ضمن میں اسراء اور معراج کے دو عنوان قائم کیے جاتے ھیں اور ان میں کسی قدر فرق ھے ۔ اول الذکر سے مراد مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا زمینی سفر ھے ، جس کا ذکر قرآن مجید کی ایک مستقل سورۃ (۱۷ [بنی اسرائیل]) میں کیا گیا ھے ۔ ثانی الذکر سے مراد عروج آسمانی ھے ، جس میں رؤیت ملائکہ سے لے کر جنت و دوزخ کی سیر اور مناجات باری تک کے مقاصد شامل ھیں ۔

اس واقعہ کے وقوع میں پانچ اقوال مروی ھیں، مگر ان میں سے مستند اور محقق یہی ھے کہ یہ واقعہ ۲۷ رجب ۱۰ نبوی کو بوقت شب بعد از نماز عشاء و قبل از صلوٰۃ الفجر پیش آیا (دیکھیے الزرقانی : شرح المواھب ، ۱ : ۳۰۶ تا ۳۰۹ ؛ ابن ھشام ۳: سیرۃ، ۲:۳۷ تا ۴۹؛ ابن سعد : الطبقات، ۱:۲۱۳ تا ۲۱۵ ؛ سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی ، ۳: ۳۹۳ تا ۴۸۳؛ سلیمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین ، ۱: ۷۰، مطبوعہ لاھور؛ W. Muir: *Life of Muhammad*، ص ۱۲۱ ، مطبوعہ ۱۹۲۳ء).

واقعۂ معراج کا خلاصہ یہ ھے کہ ایک شب آپؐ حطیم یا حجر کعبہ میں استراحت فرما تھے

(البخاری : الصحیح ، ۳ : ۶۳/۴۲/۱) ؛ بیداری اور نیند کی درمیانی حالت تھی کہ آپؐ نے حضرت جبریلؑ کی معیت میں متعدد فرشتوں کو اپنے پاس آتے ہوے دیکھا۔ انھوں نے آپؐ کے سینۂ اطہر کو چاک کیا اور آب زمزم سے دھوکر علم و حکمت اور حلم و ایقان سے بھر دیا۔ پھر آپؐ کے سامنے سواری کے لیے گھوڑے سے کسی قدر چھوٹا سفید رنگ کا جانور پیش کیا جسے تیز رفتاری کی وجہ سے براق [رک بآں] کا نام دیا گیا ہے۔ حد نگاہ پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ اسی پر سوار ہو کر آپؐ بیت‌المقدس تشریف لے گئے۔ جب آپؐ دو رکعت نماز نفل سے فارغ ہوے تو آپؐ کو دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کیے گئے کہ آپؐ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ آپؐ نے دودھ کے پیالے کو ترجیح دی۔ اس پر حضرت جبریلؑ نے فرمایا کہ اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو امت گمراہ ہو جاتی۔ امام بخاری (کتاب مذکور) کی روایت کے مطابق یہ پیالے آپؐ کو عالم بالا میں پیش کیے گئے۔ پھر آپؐ حضرت جبریلؑ کی معیت میں آسمان کے دروازے پر پہنچے تو دربانوں نے پوچھا : کون ہے ؟ جواب ملا : جبریلؑ پوچھا گیا : ساتھ کون ہے؟ جواب دیا گیا : محمدؐ۔ پوچھا گیا : کیا ان کو بلایا گیا ہے ؟ جواب ملا : ہاں۔ اس پر دروازہ کھلا اور آپؐ کو مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ نے فرزند صالح و نبی صالح کہہ کر آپؐ کو خوش آمدید کہا ؛ دوسرے اور اس کے بعد کے آسمانوں کے دروازوں پر بھی یہی سوال جواب دہرائے گئے۔ دوسرے آسمان پر فرشتوں کے علاوہ آپؐ کی ملاقات حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ سے، تیسرے آسمان پر حضرت یوسفؑ سے، چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ سے ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ سے، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ سے، ساتویں پر حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی اور ہر ایک نے آپؐ کو خوش آمدید و مرحبا کہا۔ آگے بڑھ کر آپؐ عالم بالا کے مقام سدرۃ‌المنتہیٰ پر پہنچے۔ وہاں آپؐ نے بیت اللہ شریف کی طرز پر بیت‌المعمور دیکھا، جہاں ہر روز ستر ہزار فرشتے عبادت کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالی نے اپنے محبوب نبی سے گفتگو کی، جس کی کیفیت و کمیت کے بیان کرنے سے بحر الفاظ و معانی قاصر ہے۔ واپسی پر تین تحائف ملے : (۱) سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں ؛ (۲) یہ بشارت کہ جو شرک کا مرتکب نہ ہوگا عفو و مغفرت کا سزاوار ہوگا ؛ (۳) پانچ وقت کی فرض نمازیں۔ واپسی ہی میں آپؐ کو جنت و دوزخ اور ملأ اعلیٰ کے دوسرے مناظر دکھلائے گئے (البخاری : الصحیح، کتاب الصّلوۃ ، باب ۱ ؛ کتاب الحج ، باب ۷۶ و کتاب مناقب الانصار ، باب ۴۲ ، ۴۳ وغیرہ ؛ مسلم : الصحیح، باب المعراج؛ ابن جریر : تفسیر ؛ الزمخشری: الکشاف ؛ محمود آلوسی : روح المعانی ، بذیل ۱۷ [بنی اسرائیل] و ۵۳ [النجم] ؛ احمد بن حنبل : مسند ، ۱ : ۲۵۷ ؛ ۲ : ۳۵۲ ؛ ۳ : ۱۸۲ ، ۲۲۴ ، ۲۳۱ ، ۲۳۹ ؛ ۴ : ۶۶ ، ۱۴۳ ، ۲۰۷ ؛ ۵ : ۱۴۳ ، ۳۸۷ ؛ الطبری : تاریخ ، ۱ : ۱۱۵۷ ببعد ؛ [نیز رک بہ اسراء ؛ معراج ؛ بنی اسرائیل].

معراج کی خبر سے مکے میں چہ میگوئیاں ضرور ہوئیں ، لیکن ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اس خبر سے حلاوت ایمان سے شاد کام ہونے والا کوئی بھی مسلم فرد مرتد ہو گیا ہو .

پناہ گاہ کی تلاش اور شب مصائب کی طلوع سحر : [معراج سے واپسی پر آپؐ نے تبلیغ و دعوت کی مہم کو مزید تیز کر دیا۔ اب آپؐ مکہ مکرمہ کے پاس آباد دیگر قبائل کے پاس تشریف لے جاتے۔ اس طرح آپؐ] بنو کلب ، بنو فزارہ ، بنو عامر بن صعصعۃ ، بنو حنیفہ ، بنو شیبان ، بنو حارث ، بنو کعب ، بنو کندہ ، بنو مرہ ، وغیرہ [قبائل کے علاوہ اہم مقامات اجتماع، مثلاً ذوالمجاز، مَجَنّہ اور عکاظ وغیرہ

(میلون) اور موسم حج کے اجتماع میں دعوت اسلام دیتے رہے] (المقریزی، امتاع، ۱: ۳۰ تا ۳۱، جہاں چودہ قبیلوں بشمول غسان کا ذکر ہے)؛ السہیلی (روض الانف) اور ابن ہشام (سیرۃ) وغیرہ نے چند مزید ناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپؐ کی دعوت کے جواب میں کسی نے اخلاق و نرمی سے، کسی نے اجڈ پن اور سختی سے انکار کیا، مگر کوئی بھی اس سعادت دارین کے حصول کا خواہشمند نہ ہوا۔

عَقَبۂ اُولٰی: بالآخر ایک روز آپؐ نے میدان مِنٰی کے باہر، عقبہ کے موڑ پر چھے آدمیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت دیکھی، جو رسوم حج ادا کرنے مدینہ منوّرہ [رک بآں] سے مکہ معظمہ آئی ہوئی تھی۔ یہ سب خزرجی تھے۔ [ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: اسعد بن زُرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، قُطبہ بن عامر، عُقبہ بن عامر، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم]. آنحضرتؐ کی تبلیغ پر انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا اور وعدہ کیا کہ گھر جا کر مزید کوشش کریں گے۔ یہ بیعت عقبۂ اولٰی کہلاتی ہے (المقریزی: امتاع، ۱: ۳۰)۔ [اہل یثرب میں اسلام کی فوری اشاعت کے مختلف اسباب ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان پیشینگوئیوں سے واقف تھے جو سابقہ کتب مقدسہ میں نبی آخرالزمان کی آمد سے متعلق تھیں اور دوسرا یہ کہ] یثرب کے دو بڑے قبائل اوس اور خزرج، ایک عرصۂ دراز سے باہمی قتل و خونریزی سے اکتا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی غیر جانبدار اور انصاف پسند ثالث کے گرد باہم متحد ہو جائیں۔ یہ اولیں مسلمان قبیلۂ خزرج کی شاخ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے، جس سے خود آنحضرتؐ کی ننھیالی رشتہ داری تھی۔ [یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارباب سیر نے عقبات کی تعداد اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے لکھی ہے۔ جس نے پہلی بیعت کو خارج کر کے بقیہ عقبات کو عقبات تصور کیا اس نے تعداد دو بیان کی اور جس نے اول کو بھی شمار کیا اس نے اس کی تعداد تین بیان کی۔ فرق واقعات کا نہیں، طرز بیان کا ہے۔ ہم نے مؤخرالذکر طریقے کو اس بنا پر پسند کیا ہے کہ اس سے منطقی طور پر واقعات کے فہم میں آسانی ہو جاتی ہے].

عقبۂ ثانیہ: عقبۂ اولٰی میں شریک افراد نے وعدہ پورا کیا اور پورے سال اسلام کی اشاعت میں لگے رہے اور [اسلام کی تبلیغ اس تندہی سے کی کہ اوس و خزرج کے ہر گھر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چرچے ہونے لگے]۔ دوسرے سال ۱۱ نبوی میں حج کے زمانے ہی میں پانچ پرانے اور سات نئے افراد آنحضرتؐ سے ملنے کے لیے آئے اور آپؐ کے ہاتھ پر مکرر بیعت کی (ابن ہشام، ۲: ۷۳ تا ۷۶)۔ [بعض نے] اسی کو عقبۂ اولی بھی کہا ہے۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ایک قابل شخص کو ان کا معلم اور مبلغ بنا کر مدینہ منورہ بھیجا جائے۔ اس کے لیے حضرت مُصعبؓ بن عُمیر [رک بآں] کو منتخب کیا گیا۔ اس سے پہلے نماز کی امامت کے سلسلے میں بنو اوس و خزرج کے مابین جو جھگڑے تھے وہ اس اقدام کی وجہ سے ختم ہو گئے (کتاب مذکور، ص ۷۶ تا ۸۴)۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر نے اس خوش اسلوبی سے تبلیغی کام انجام دیا کہ مدینہ منورہ میں بہت سرعت سے اسلام کی اشاعت ہونے لگی اور بعض اوقات تو پورے کا پورا خاندان بیک وقت اسلام قبول کر لیتا تھا (ابن ہشام، ۲: ۷۶ تا ۸۴) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصعبؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس اثنا میں رابطہ قائم رکھا کیونکہ جب آنحضرتؐ کو مدینہ منورہ میں اسلام کی اشاعت کی خوشخبری ملی تو آپؐ نے حضرت مصعبؓ کو ایک خط ارسال فرمایا تھا (الوثائق السیاسیۃ و بحوالۂ السہیلی: روض الانف، ۱: ۲۷۰ تا ۲۷۲)، جس میں درج تھا کہ دن ڈھلے جمعے کی نماز پڑھا کرو۔ اس حکم کی تعمیل میں جب

جمعے کی نماز کا مدینہ منورہ میں اہتمام کیا گیا تو بیان کیا گیا ہے کہ پہلی نماز جمعہ میں بارہ آدمی جمع ہوئے۔ (ابن سعد، ۳/۱ : ۱۱۸).

عقبۂ ثالثہ : [اسی کو بعض نے عقبۂ ثانیہ لکھا ہے] - تیسرے سال، یعنی ۱۲ نبوی کے موسم حج میں یثرب سے آنے والے پانچ سو حاجیوں میں سے تہتر مسلمان مرد اور دو خواتین تھیں۔ یہ لوگ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے پہاڑ کی گھاٹی (عقبہ) میں رات کے وقت ملے۔ ان لوگوں نے بیعت کے موقع پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپؐ اور دیگر مسلمان مکے سے مدینہ منورہ آ جائیں تو ہم آپؐ کی ویسی ہی حفاظت کریں گے جیسے کوئی اپنے اہل خاندان کی کرتا ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اگر اس کے لیے ساری دنیا سے بھی جنگ کرنا پڑے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہوں گے اور ہر امر میں آنحضرتؐ ہی کی اطاعت کریں گے۔ آنحضرتؐ نے ان کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے فرمایا : آج سے تمہاری خون طلبی ہی میری خون طلبی ہوگی، اور تمہاری معافی میری معافی ہو گی؛ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے۔ تعداد کی کثرت کے باعث آنحضرتؐ نے ان کے لیے بارہ نقیب نامزد فرمائے، جو بارہ خاندانوں کے لیے تھے اور ان میں سے اسعدؓ بن زرارہ کو، جو بنی النجار سے تعلق رکھتے تھے، نقیب النقباء بنایا (البلاذری : انساب الاشراف، ۱:۲۴۳)۔ اس تنظیم کو تاسیس مملکت اور معاہدۂ اجتماعی کی ایک شکل قرار دیا جا سکتا ہے (ابن سعد: طبقات، ۱ : ۲۲۱ تا ۳۲۲).

ہجرت مدینہ : بیعت عقبۂ ثالثہ کے بعد، جو ذوالحجہ ۱۲ نبوی کا واقعہ ہے، آنحضرتؐ کی ہدایت پر مکہ مکرمہ کے مسلمان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے لگے۔ ان میں سے متعدد کو جسمانی اور مالی تکالیف سے سابقہ پڑا۔ ان کی جائدادیں، خاص طور پر مکان ضبط کر لیے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں مکہ مکرمہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور وہاں آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکرؓ کا خاندان یا کچھ کمزور لوگ باقی رہ گئے، یا وہ نوجوان جن کو ان کے اہل خاندان نے ایذا دہی کے لیے قید کر رکھا تھا۔

مسلمانان مکہ کے ترک وطن پر کفار قریش گھبرائے کہ اہل اسلام کسی دوسرے علاقے میں قوت حاصل کر کے کہیں مکے پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ دارالندوہ میں اس مسئلے پر عمومی مشورہ ہوا۔ بڑے غور و بحث کے بعد ایک تجویز قرار پائی کہ مکہ مکرمہ کے ہر قبیلے سے ایک کڑیل جوان کو چنا جائے اور یہ لوگ مشترکہ طور پر (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کو قتل کر ڈالیں تاکہ بنو ہاشم اور مسلمانوں کو سارے قبائل سے جنگ کرنے کی ہمت نہ ہو سکے اور اس طرح وہ خون بہا لینے پر آمادہ ہو جائیں۔ ابن سعد [۸ : ۵۱، بیروت ۱۹۵۸ء] کے مطابق آنحضرتؐ کی ایک معمر رشتہ دار خاتون [رُقیقہ بنت ابی صیفی بن ہاشم نے] جو غالباً اپنے شوہر کے خاندان میں اس تجویز سے واقف ہوئی ہوں گی آ کر آنحضرتؐ کو آگاہ کیا کہ قریش یکبارگی آپؐ پر ٹوٹ پڑنے والے ہیں۔ آنحضرتؐ فوراً حضرت ابوبکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور طے ہوا کہ رات کو آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں آ جائیں گے؛ پھر دونوں شہر کے جنوب میں واقع ایک پہاڑ کے غار، غار ثور میں جا رہیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ اطلاع ملتے یہ بندوبست کر لیا کہ روزانہ انہیں مکہ مکرمہ سے کھانا جاتا رہے اور انہیں شہر کے تازہ بتازہ حالات بھی معلوم ہوتے رہیں اور پھر چوتھے روز غار پر دو اونٹ اور ایک ماہر رہنما موجود ہو تاکہ وہ دونوں مدینہ منورہ روانہ ہو سکیں۔ آنحضرتؐ نے

مختلف لوگوں کی جو امانتیں پاس تھیں وہ اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کے سپرد کیں تاکہ وہ مالکوں کو واپس کرنے کے بعد مدینہ منورہ آ جائیں۔ [جان لینے کے درپے دشمنوں کی امانتوں کو ان کے ارادۂ قتل کے بعد بھی واپس کرنا، یہی شان نبوت ہے]۔ مشرکین قریش رات کو حسب پروگرام آئے اور آ کر آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور صبح تک انتظار کرتے رہے۔ یہ لوگ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھڑکی سے جھانک کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے کہ اندر کوئی شخص سو رہا ہے، لیکن اندر جانے کا حوصلہ کسی کو نہ ہوا۔ [جب رات زیادہ گزر گئی تو خدائے قادر و قیوم نے آپؐ کے دشمنوں کو غافل کر دیا۔ آپؐ ان کو بے خبر چھوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر پہنچے، جہاں سے "غار ثور" میں تین روز کے قیام کے لیے روانہ ہو گئے]۔ صبح ہوئی تو دشمنوں کو آنحضرتؐ کی جگہ حضرت علیؓ مکان میں ملے تو انھوں نے برہمی کا اظہار کیا، لیکن ان کا خون نہ بہایا۔ پھر آپؐ کی اور حضرت ابوبکرؓ کی ہر جگہ تلاش شروع ہوئی۔ گرفتاری کے لیے انعام بھی مقرر کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کھوجی تلاش کرتے غار ثور تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ دشمنوں کو اس قدر قریب دیکھ کر گھبرا گئے تو آپؐ نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹ [التوبة]: ۴۰)، یعنی غم نہ کرو؛ اللہ ہمارے ساتھ ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قریب پہنچنے کے باوجود ان کو ناکام اور نامراد لوٹا دیا (البخاری: الصحیح، ۳، کتاب ۶۳، باب الهجرة)۔ اس دوران حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ صبح و شام آپؐ کے لیے کھانا اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ تازہ بتازہ خبریں پہنچاتے رہے۔ [علاوہ ازیں حضرت ابوبکرؓ کے مولیٰ عامر بن فہیرہ بکریاں چرانے ادھر آ نکلتے۔ اس سے ایک تو آنے والوں کے نشان قدم مٹ جاتے، دوسرے وہ دودھ وغیرہ دے جاتے]، چوتھے روز [طے شدہ لائحۂ عمل کے مطابق] عبداللہ بن اُرَیْقط (رہنما) دو اونٹنیاں لے کر غار کے باہر آ پہنچا۔ [عبداللہ بن اُرَیْقط الدِّیلی بنو بکر بن عبدمنات میں سے تھا اور عاص بن وائل السہمی کا حلیف؛ وہ راستوں کے ایچ پیچ سے بڑا باخبر اور ماہر و تجربہ کار راہبر اور راہ دان تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی مہارت راہ دانی اور امانت داری پر اعتماد کرتے ہوئے ہجرت کی غرض سے مدینے جانے کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں (انساب الاشراف، ۱: ۲۶۰؛ جوامع السیرة، ص ۹۱)]۔ اب ساحل کے ساتھ ساتھ نامانوس راستوں سے ہو کر مدینے کا سفر شروع ہوا۔ [ایک اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سوار ہوئے اور دوسرے پر حضرت ابوبکرؓ اور ان کے مولیٰ عامر بن فہیرہ۔ بنو مُدلِج کے سردار سُراقہ بن مالک بن جُعْشُم نے آپؐ کو دیکھا تو سو اونٹوں کے لالچ میں آپؐ کا تعاقب شروع کر دیا۔ جب سُراقہ کا گھوڑا اس مقدس کارواں کے پاس پہنچا تو حضرت ابوبکرؓ بڑے پریشان ہوئے اور آنحضرتؐ کے بارے میں خطرہ محسوس کرنے لگے۔ آپؐ نے اپنے یار غار کو تسلی دیتے ہوئے اللہ کے حضور میں دعا کی: اَللّٰهُمَّ اكْفِنَاهُ بِمَا شِئْتَ، یعنی اے اللہ تو جس طرح چاہے اس سے خود نپٹ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو اس کا گھوڑا گرتے گرتے بچا؛ پھر جب وہ آگے بڑھنے لگا تو گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ اس پر سراقہ نے معافی مانگتے ہوئے آپؐ سے امان طلب کی؛ چنانچہ آپؐ نے اسے امان دے دی]۔ راستے میں [اُم مَعْبَد کے خیمے میں معجزانہ طور پر بکریوں کو دوہ کر] دودھ حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔ ادھر انصار مدینہ منورہ کے جنوب میں (قُبا کے پاس) آپؐ کا روزانہ انتظار کرتے تھے۔ جب آپؐ خیر و عافیت سے قبا پہنچ گئے تو مردوں نے ہتھیاروں سے مسلح

ہو کر، بچوں اور بچیوں نے ڈھولک اور دف بجاتے ہوئے، اور یہ کہتے ہوئے آپؐ کا استقبال کیا:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَى لِلّٰهِ دَاعٍ
اَيُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

[یعنی ثنیۃ الوداع کی طرف سے ہم پر چاند نکل آیا۔ ہم پر شکر اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ کوئی پکارنے والا اللہ کو پکارتا رہے گا۔ اے وہ جو پیغمبرؐ کے طور پر ہم میں بھیجا گیا ہے، تو وہ چیز لایا ہے جس کی اطاعت کی جائے گی]۔ اس موقع پر انتہائی جوش و خروش اور خلوص و نیاز مندی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ یہ دو شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱ھ/ ۳۱ مئی ۶۲۲ء کا واقعہ ہے [انساب الاشراف، ۱: ۲۶۳؛ جوامع السیرۃ، ص ۹۳؛ الوفا باحوال المصطفی، ص ۲۴۹]۔ ملاقات کے لیے حاضر ہونے والوں کی کثرت کے باعث آپؐ ایک درخت کے سائے میں ایک باغ میں بیٹھ گئے۔ پھر قباء اور بنی عمرو بن عوف کے رئیس حضرت کلثومؓ بن الھدم الاوسی کے مکان میں قیام پذیر ہوئے؛ البتہ دن میں سعد بن خیثمہ الاوسی کے مکان میں بیٹھنے لگے، جو بڑا بھی تھا اور خالی بھی، کیونکہ سعد غیر شادی شدہ تھے (ابن ہشام: سیرۃ النبویۃ، ۲: ۱۱۲ تا ۱۳۸؛ ابن سعد: الطبقات، ۱: ۲۲۷ تا ۲۳۷؛ البخاری: الصحیح، مطبوعہ لائیڈن، کتاب فضائل النبی؛ ۲: ۴۱۷ ببعد و باب ھجرۃ النبی، ۳: ۳۴ تا ۴۵)۔

مسجد قباء کی تعمیر: یہاں آپؐ نے اپنے مختصر قیام کے دوران میں ایک مسجد تعمیر کی جس کا قبلہ بھی آنحضرتؐ نے متعین فرمایا۔ تیرہ چودہ دن قیام کے بعد قباء سے روانگی عمل میں آئی اور وہاں اترے جہاں آپؐ کی اونٹنی ٹھیری تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ اسی جگہ اب مسجد نبوی ہے۔ آس پاس آنحضرتؐ کے ننھیالی رشتہ دار بنو خزرج کی شاخ بنو النجار بستے تھے۔ جس جگہ آپؐ کی اونٹنی خود بخود رک کر بیٹھ گئی تھی وہ ایک کھلا میدان تھا، مگر وہاں سے قریب ترین مکان حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ آنحضرتؐ کا سامان اپنے دو منزلہ مکان میں لے گئے (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۲۳۲ تا ۲۳۴)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے پہلا کام یہ کیا کہ خالی میدان کو، جو دو یتیم بچوں کی ملکیت تھا، قیمتاً حاصل کیا اور وہاں مسجد نبوی اور اپنے کنبے کے لیے چند حجروں کی تعمیر کا آغاز فرما دیا۔ جب کام مکمل ہوگیا تو آنحضرتؐ وہاں منتقل ہوگئے۔ پھر مکہ مکرمہ سے آپؐ کے اور حضرت ابوبکرؓ کے بیوی بچوں کو لانے کے لیے چھے آدمی روانہ فرمائے۔ دس سالہ حضرت انسؓ بن مالک الخزرجی کو ان کی عقیدت مند والدہ نے آپؐ کی خدمت میں لا کر پیش کرتے ہوئے عرض کی یا رسول اللہ! میرے اس بچے کو اپنے خادم کی حیثیت سے قبول فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں؛ وہ کمسنی کے باوجود لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ حضرت انسؓ دس سال، یعنی وفات نبوی تک حضورؐ کے مکان میں بطور خادم کے رہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دوران میں آپؐ نے کبھی ایک مرتبہ بھی مجھے گھرکا تک نہیں (الترمذی شمائل النبی)۔

اجتماعی اور سیاسی تنظیم: مدینہ منورہ آنے پر آپؐ کو نظر آیا کہ مکے کے برعکس اس شہر میں کوئی شہری نظام نہیں، بلکہ بکثرت قبیلے الگ الگ مقاموں پر رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے بالکل آزاد۔ ان میں باہمی رشتہ داری کے باوجود آپس میں خون خرابہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان کی اکثریت میں اسلام پھیل گیا تھا، البتہ بعض خاندان، مثلاً خطمہ، واقف، وائل اور امیہ ابھی تک شرک پر ہی مصر تھے۔ شہر میں یہودی بھی تھے جن میں سے بنو النضیر خزرج کے

حلیف تھے جبکہ بنو قینقاع اور بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ قینقاع میں سات سو جنگجو اور قریظہ میں چھے سو جنگجو سپاہیوں کا ہونا مقریزی (امتاع، ۱ : ۱۰۵، ۴۲۹) نے صراحت سے بیان کیا ہے اور یہ کہ جب بنو النضیر مدینہ منورہ سے نکالے گئے تو چھے سو اونٹوں پر عورتوں بچوں اور سامان کو لاد کر لے گئے تھے (کتاب مذکور، ص ۱۸۱)۔ اس مخلوط آبادی میں مکے سے آئے ہوے کئی سو بیروزگار اور بے وسائل مہاجرین بھی تھے، جن میں سے چھے حضرت بلالؓ وغیرہ کی طرح کے غیر عرب بھی تھے۔ ان میں سے بہت سے نئی آب و ہوا کے باعث بیمار بھی ہو گئے۔ ان کی آباد کاری کا کٹھن کام بھی انجام دینا تھا۔ اسی [زمانے میں مکہ مکرمہ سے ابوسفیان اور ابی بن خلف نے] عبداللہ بن ابی بن ابی سلول اور اہل مدینہ کے نام ایک دھمکی آمیز خط (الثی میثم) لکھ بھیجا کہ آنحضرتؐ کو ان کے سپرد کر دیا جائے، ورنہ مجبوراً جنگ کرنی ہوگی (کتاب المحبر، ص ۳۷۱؛ الوثائق السیاسیة)۔

مؤاخات: آپؐ نے سب سے پہلے مہاجرین پر توجہ فرمائی؛ کیونکہ ان کی خود داری کی حفاظت کے لیے کسی مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ اسی لیے آپؐ نے انصار کو جمع کرکے فرمایا: ہر شخص ایک مہاجر خاندان کو لے لے، دونوں مل کر کام کریں اور کمائی مل کر کھائیں۔ انصار نے ایثار کیا۔ قرآن مجید (۵۹ [الحشر] : ۹) میں ان کی تعریف یونہیں بے وجہ نہیں آئی۔ انھوں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! ہماری آدھی زمینیں مہاجرین کو مستقل طور پر دے دیجیے؛ لیکن خود دار مہاجرین نے اسے قبول نہ کیا اور کہا: غیر مزروعہ زمینیں انھیں تقاوی پر دے دیں اور پیداوار کا ایک حصہ بطور اجرت لے لیا کریں (بخاری: الصحیح، ۲ : ۶۸، کتاب الحرث والمزارعة وکتاب الھبة وغیرہ)۔ انھوں نے ایک مہاجر کو ایک انصاری کے بھائی بنائے جانے (مؤاخات) کے فرمان نبوی کو انتہائی خوشدلی سے قبول کیا اور اس طرح سیکڑوں بے روزگاروں کا مسئلہ ایک ہی دن میں حل ہو گیا۔ اس مواخات میں کافی عرصے تک باہمی وراثت بھی چلتی رہی۔ پھر اس کو وحی (۸ [الانفال] : ۷۵) سے منسوخ کر دیا گیا [تفصیل کے لیے دیکھیے البخاری: الصحیح، ۳ : ۱ تا ۶ بعد، کتاب مناقب الانصار]۔ فراخ دلی، خود داری اور عمدہ ایثار کی ایک مثال حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کی ہے کہ ان کے انصاری بھائی نے ان کو گھر لا کر کہا: "یہ میری جائداد ہے؛ میں اس کا نصف تمھیں دیتا ہوں۔ یہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے چاہو چن لو؛ میں اسے طلاق دیتا ہوں۔ عدت کے بعد اس سے نکاح کر لینا"۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے جواب دیا: "خدا تمھیں تمھارے مال و عیال میں برکت دے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو صرف بازار کا راستہ دکھا دو"۔ انھوں نے بازار میں کام شروع کر دیا اور چند ہی روز میں اللہ تعالی نے ان کو خوشحالی عطا فرما دی (البخاری: الصحیح، ۳ : ۲)۔

بعض انصار نے اپنے باغوں میں سے ایک ایک درخت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے مختص کر دیا اور موسم میں اس کا پھل آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کرنے لگے [مسلم، ۳ : ۱۳۹۲، عدد ۱۷۷۱، کتاب الجهاد، باب ۲۴]؛ اس طرح کسی ایک پر بار نہ پڑا۔ [ن درختوں کو آپؐ نے بنو قریظہ اور بنو النضیر کے انخلا کے بعد ان کے مالکان کو واپس کر دیا]۔ آنحضرتؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کھانا کھاتے تو آٹھ دس حاضرین کو اس میں ضرور شریک فرما لیتے۔ آپؐ نے کچھ بکریاں اور اونٹنیاں خریدیں، جن کا دودھ کنبے میں خرچ ہونے لگا۔

میثاق مدینہ: مہاجرین و انصار کی مؤاخات کے بعد شہر کی بقیہ آبادی کی تنظیم پر توجہ دی گئی۔

حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ ان کے باپ کے مکان میں سارے مسلم و غیر مسلم قبائل کے نمائندوں کا اجتماع ہوا اور آنحضرتؐ کی تجویز پر سب متفق ہو گئے کہ بیرونی حملوں کے دفاع اور اندرونی بین القبائل جھگڑوں میں تصفیے وغیرہ کے لیے شہر میں ایک تنظیم عمل میں لائی جائے اور ایک شخص کو بطور حاکم اعلی متعین کیا جائے۔ حقوق و فرائض تحریری طور پر مرتب کیے گئے ۔ یہ دستاویز جو کسی مملکت کے لیے تحریری طور پر مدون کیے ہوئے دستور کی بظاہر دنیا میں پہلی مثال ہے اور سنہ ۱ھ سے متعلق ہے، ہم تک ابن ہشام، ابو عبید وغیرہ کی روایت سے کاملاً پہنچی ہے، (تفصیل کے لیے دیکھیے حمید اللہ: *The first written constitution in the world*، لاہور ۱۹۷۵ء؛ [رک بہ میثاق مدینہ])۔ یہ دستاویز آنحضرتؐ کی تلوار کی میان پر ہمیشہ بندھی رہتی تھی۔

اس میثاق باہمی کے نتیجے کی رو سے آنحضرتؐ کو، جو مسلمانوں کے لیے تو آقا اور سردار تھے ہی، اب غیرمسلموں نے بھی اس حیثیت سے تسلیم کرلیا۔ درحقیقت یہ آپؐ کی مدینہ منورہ میں پہلی سیاسی فتح تھی، جو عظیم نتائج پر منتج ہوئی ۔ [اس کے علاوہ میثاق مدینہ کی دفعات کامل رواداری، مذہبی آزادی اور حسن تعاون پر مبنی تھیں؛ اس لیے یہودیوں اور دیگر غیر مسلموں کے پاس بے اعتمادی کی کوئی وجہ نہ تھی]۔

البخاری (کتاب ۵۶، باب ۱۸۱، حدیث ۱ [۲: ۲۶۳]) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ نے حکم دیا: میرے لیے سارے کلمہ گویوں [من یلفظ بالاسلام] کے نام لکھو ۔ اس طرح پندرہ سو نام درج ہوئے ۔ چونکہ مؤاخات میں ۱۸۶ مکی خاندانوں کو اتنے ہی مدنی خاندانوں میں ضم کیا گیا تھا اور ہر خاندان میں بیوی بچوں کا اوسط چار ہی رکھا جائے تو پندرہ سو کی تعداد ہو جاتی ہے ۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ مردم شماری بھی انہیں ابتدائی تنظیمات کے زمانے، یعنی تقریباً ۱ھ میں ہوئی ہوگی۔

بیرونی تعلقات: مسلمانوں کا قریش مکہ کے سوا کسی اور سے کوئی جھگڑا نہ تھا ۔ اس بیرونی دشمن سے نپٹنے کے لیے اندرونی تنظیم اور استحکام لازمی تھا ۔ اس کے لیے ایک طرف تبلیغ دین کا سلسلہ جاری ہوا تو دوسری طرف وقتاً فوقتاً نئے احکام نازل ہوکر اسلامی قانون و شریعت کو بتدریج مکمل کرتے گئے؛ چنانچہ اذان [رک بآں]، تحویل قبلہ، روزہ، حج، زکوٰۃ، قانون وراثت و نکاح و طلاق، حجاب، حرمت خمر، قانون صلح و جنگ و غیر جانبداری، نیز قانون تعزیرات (حدود و ممانعات) اور عام اخلاق و احسان (تصوف) اسی دوران میں نازل ہوئے اور شریعت اسلامیہ کا حصہ بنے۔

اب آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو بیرونی تعلقات میں قریش کی دھمکی اور جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کرنا تھا ۔ جب شہری مملکت مدینہ کے قیام سے کسی قدر اندرونی استحکام و اطمینان حاصل ہوگیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے اطراف پر توجہ دی اور وہاں کے قبیلوں کو فوجی طور سے حلیف بنانا شروع کیا؛ چنانچہ بنو جُہینہ، بنو ضَمرہ وغیرہ کے ساتھ ایسے معاہدے ہونے کا پتا چلتا ہے ۔ بنو جہینہ مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں اور بنو ضمرہ وغیرہ جنوب مغرب میں آباد تھے اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں سے قریش کے تجارتی کاروان عراق، شام اور مصر جانے کے لیے گزرا کرتے تھے۔

غزوات: ہجرت کے وقت آنحضرتؐ کے قتل کی سازش قریش کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف گویا اعلان جنگ تھا؛ [اس پر کچھ نہ کچھ کارروائی لازمی تھی]۔ آنحضرتؐ کی اور دیگر سیکڑوں مہاجرین کی جائدادیں بھی قریش نے ضبط کر لی تھیں ۔ اس کے باوجود قریش مکہ کا غصہ فرو نہ ہوا تھا

اور وہ موقع کی تاک میں تھے ۔ [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نہ صرف مدینہ منورہ میں اندرونی استحکام پیدا کیا، بلکہ باہر کے حملہ آوروں کا پتا لگانے، نیز دشمنوں کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے مختلف دستے آس پاس کے علاقوں میں بھیجے ۔ یہ دستے مدینہ منورہ کے ارد گرد آپؐ کے حکم کے مطابق دشمنوں کی سرگرمیوں کا پتا چلاتے ۔ اس سلسلے کا پہلا دستہ، جو تیس افراد پر مشتمل تھا]، حضرت حمزہؓ کی قیادت میں رمضان ۱ھ میں بھیجا گیا۔ [یہ دستہ جب ساحل سمندر پر پہنچا تو اتفاقاً مشرکین کے ایک کاروان سے، جس میں ابوجہل بھی تھا، سامنا ہوگیا]، مگر مجدی بن عمرو الجہنی، جو دونوں فریقوں کا حلیف تھا، بیچ میں پڑا؛ اس طرح تصادم رک گیا [الواقدی: المغازی، ۱: ۹ اوکسفرڈ ۱۹۶۶ء]۔ اسی زمانے میں ساٹھ [اور بقول بعض اسی] افراد پر مشتمل ایک دوسرا دستہ مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں حضرت عبیدہؓ بن الحارث [بن عبدالمطلب] کے ماتحت بھیجا گیا [حوالۂ مذکور، ص ۱۰]۔ تیسرا دستہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی زیر کمان بھیجا گیا۔ ان میں سے کسی میں کوئی خونریزی نہ ہوئی [(جوامع السیرۃ، ص ۱۰۰ تا ۱۰۱؛ ابن کثیر: السیرۃ، ۲: ۳۳۸ تا ۳۳۹)؛ کیونکہ یہ سب امن پسندی کے جذبے کے امین تھے]، مگر قریشی رئیس کُرز بن جابر الفہری نے ربیع الاول ۲ھ میں مدینہ منورہ کے مضافات کی چراگاہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کے ریوڑ لوٹ لیے۔ اس کا تعاقب کیا گیا، مگر کامیابی نہ ہوئی ۔ جمادی الاولی ۲ھ میں آپؐ خود صحابہ کرامؓ کی معیت میں العُشَیرہ تک گئے [دیکھیے غزوات] ۔ رجب ۲ھ میں بارہ افراد پر مشتمل ایک دستہ نَخلہ بھیجا گیا ۔ آپؐ نے اس کی کمان حضرت عبداللہؓ بن جَحش کے سپرد کی اور فرمایا: دو دن تک مدینہ منورہ کے مشرقی سمت میں جاؤ، پھر بند لفافہ کھول کر اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ جب یہ دستہ بئر ابن ضمیرہ پہنچا تو وہاں پہنچ کر آپؐ کا نامۂ مبارک کھولا تو اس میں لکھا تھا: بطن نخلہ [مکہ مکرمہ کے مشرقی جانب اور طائف اور مکہ کے درمیان ایک مقام] پہنچ کر قریش مکہ کے قافلوں پر نگاہ رکھو اور ہمیں ان کے حالات سے مطلع کرو؛ چنانچہ حسب حکم یہ دستہ وہاں پہنچ گیا۔ انھیں دشمنوں کا ایک قافلہ ملا تو انھوں نے آپؐ کے حکم کے بغیر اس پر حملہ کر دیا ۔ جس کے نتیجے میں ایک کافر عمرو بن [عبداللہ] الحضرمی مارا گیا اور کچھ اسیر کیے گئے جنھیں رہا کرانے کے لیے قریش کو فدیہ دینا پڑا۔ اس طرح باہمی تعلقات پہلے سے زیادہ کشیدہ ہوگئے ۔ یہ لڑائی غلطی سے رجب کی یکم کو ہوئی تھی اس پر مشرکین کی طرف سے اشہر حرم کی حرمت کو پامال کرنے کا الزام لگایا گیا، [جس کا تفصیلی جواب قرآن مجید (۲ [البقرۃ]: ۲۱۷) میں دیا گیا] ۔ اس دستے کو آنحضرتؐ نے لڑنے کا نہیں بلکہ خبریں حاصل کرنے کا کام سپرد کیا تھا، اس لیے لڑائی کی اطلاع ملنے پر آنحضرتؐ ناراض ہوے، لیکن جلدی ہی صورت حال کو قبول فرما لیا، کیونکہ قریش مکہ کی معاندانہ سرگرمیاں پہلے سے بڑھتی جا رہی تھیں ۔

جمادی الآخرۃ ۲ھ میں قریشی کاروان خاص جنگی نقطۂ نظر سے تجارت کے لیے شام گیا ۔ تین ماہ بعد جب یہ قافلہ واپس آ رہا تھا [تو ایک مقام پر ابو سفیان کو مسلمانوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا ۔ اس کو مزید تقویت اس سے بھی ہوگئی کہ آنحضرتؐ نے اس علاقے میں جو دو افراد حالات معلوم کرنے کے لیے متعین فرمائے ہوے تھے، ابو سفیان کو ان کا نشان مل گیا؛ چنانچہ ابو سفیان نے نہ صرف راستہ تبدیل کر لیا بلکہ اس نے مکہ مکرمہ سے مدد حاصل کرنے کے لیے بھی ایک آدمی دوڑا دیا] ۔ اس طرح اس کی کمک کے لیے مکے سے ابو جہل [رک بآں] کی قیادت میں جو فوج نکلی اس سے ۱۷ رمضان ۲ھ کو بدر [رک بآں] میں مقابلہ ہوگیا ۔ مسلمان صرف ۳۱۳ اور دشمن ۹۵۰،

یعنی تگنے سے بھی زائد تھے، مگر انہیں بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی ۔ قیدیوں کو قتل کی جگہ چار چار ہزار درہم کا فدیہ لے کر رہا کیا گیا ، لیکن جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کا فدیہ صرف یہ مقرر کیا گیا کہ ہر قیدی دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے (ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۱۱ تا ۲۶ ؛ السہیلی : روض الانف، ۲ : ۶۱ تا ۷۸ ؛ ابن حنبل : مسند ، ۱ : ۲۴۷، عدد ۲۲۱۶).

غزوۂ اُحد : قریش نے اگلے سال بڑی تیاریوں کے بعد تین ہزار کی فوج لے کر شوال ۳ھ میں مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور احد [رک بآں] میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا ۔ [مسلمانوں کو آنحضرتؐ کے جنگی احکام کی خلاف ورزی کی وجہ سے وقتی طور پر کچھ نقصان اٹھانا پڑا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلد ہی انہیں دوبارہ صف آرا کر کے دشمنوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ۔ جاتے ہوئے قریش مکہ نے یہ اعلان کیا کہ] ایک سال بعد بدر ہی میں دوبارہ مقابلہ ہوگا ۔ شوال ۴ھ میں آنحضرتؐ اپنے جانثاروں سمیت بدر گئے اور انتظار کرتے رہے، مگر دشمن نہ آئے ۔ ذوالقعدہ میں بدر کے مقام پر سالانہ میلہ لگتا تھا ۔ اس سے تجارتی استفادہ کرنے کے بعد مسلمان مدینہ منورہ واپس ہوگئے .

غزوۂ خندق : اس کے کچھ عرصے بعد شوال ۵ھ میں غزوۂ خندق پیش آیا ۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ مدینہ منورہ کے بنو نضیر [رک بآں] نے غزوۂ احد کے [چھے ماہ] بعد مسلمانوں سے لڑائی مول لی تھی اور شکست کھانے کے بعد [البخاری ، ۳ : ۷۲] شہر چھوڑ کر خیبر جا بسے تھے۔ انھوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے قبائل عرب میں اسلام دشمنی کی آگ بھڑکا دی ۔ یہود نے اپنی دولت اور چرب زبانی سے کام لے کر بنو غطفان و فزارہ کو مدینہ منورہ کے مشرق سے ، بنو المصطلق کو جنوب مغرب سے، اہل طائف ، بنو کنانہ اور اہل مکہ کو جنوب سے اس پر آمادہ کیا کہ وہ بیک وقت اپنی متحدہ قوت سے مدینہ منورہ پر ٹوٹ پڑیں ۔ وہ خود خیبر میں امن چین سے بیٹھ کر انتظامات کی کمان کرتے رہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر صحابہؓ کے مشورے سے خندق [رک بآں] کھدوانے کا فیصلہ کیا ۔ یہود کی تجویز بظاہر یہ تھی کہ مدینے سے بہت دور لے جا کر آنحضرتؐ اور آپؐ کی چھوٹی سی فوج کو خیبر اور دُومۃ الجندل کے درمیان گھیر کر [معاذ اللہ] قتل کر دیا جائے ، پھر مدینہ منورہ کو لوٹ لیا جائے ۔ بنوالمصطلق مدینہ منورہ سے قریب تر تھے۔ ممکن ہے آنحضرتؐ کو ان کے شریک سازش ہونے کی اطلاع مل چکی ہو؛ بہرحال آنحضرتؐ نے ان کے بعض مسلمان رشتہ داروں کو ان کے علاقے میں بھیج کر مزید اطمینان کرلیا ۔ پھر آپؐ نے اچانک ان پر اس وقت حملہ کر دیا جب کہ وہ چشمہ مُریسیع پر قیام پذیر تھے ۔ اس موقع پر مرد بھاگ گئے اور عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے گئے۔ پھر آنحضرتؐ کے حسن سلوک کے باعث سب مسلمان ہوگئے ۔ بقیہ دشمن فوج نے شوال ۵ھ میں دس ہزار [بقول الیعقوبی بیس ہزار] کے جم غفیر کے ساتھ مدینہ منورہ کا محاصرہ کرلیا ۔ اسلام کے جانثاروں کی تعداد [تین ہزار اور بقول بعض] صرف پندرہ سو [یا آٹھ نو سو] تھی ، لیکن انھوں نے خندق [رک بآں] کھود کر دشمن کو تھکانے اور تاخیر پیدا کرنے کا انتظام کر لیا تھا ۔ آخر اندوختہ ختم ہو جانے ، موسم کے سرد اور طوفانی ہو جانے ، حرمت کے مہینے آ جانے اور سب سے بڑھ کر نصرت خداوندی کے باعث ابو سفیان نے محاصرہ اٹھا کر واپس چلے جانے کا فیصلہ کرلیا تا کہ مکہ مکرمہ آنے والے حاجیوں کی سربراہی اور تجارت و سیاحت میں مشغول ہو سکیں.

جب وہ چلے گئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا : اب ان کو مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوگی کیونکہ جب اتنی کثیر فوج کے باوجود وہ کچھ

نہ کر سکے تو آئندہ مکرر کوشش کی جرأت نہیں کر سکتے۔ [اس کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آبائی شہر پر، جس میں خدا کا گھر بھی تھا، حملہ کرنے سے پہلے مفاہمت اور صلح جوئی میں پہل کو مقدم سمجھا اور کوشش کی کہ قریش مکہ کی مزید دلجوئی کریں کہ شاید اسی طرح ان کے دل نرم ہو جائیں]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس قدر رحیم وشفیق تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۶ھ میں جب مکے میں سخت قحط پڑا تو آپؐ نے پانچ سو اشرفیاں مکہ مکرمہ کے غربا میں تقسیم کے لیے بھیجیں۔ ابو سفیان بے بسی کے عالم میں جھنجھلا کر کہنے لگا: محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مکے کے نوجوانوں کو بہکانا چاہتے ہیں (السرخسی: شرح السیر الکبیر، ۱: ۶۹)۔ کاروانی راستے بند ہونے کی وجہ سے ابو سفیان کے ہاں جانوروں کی کھالیں پڑی پڑی خراب ہو رہی تھیں۔ آنحضرتؐ نے اس کو مدینہ سے کھجوریں بھیجیں اور اس کے ہاں کی کھالیں خرید لینی چاہیں (حوالۂ مذکور، ۱: ۷۰)۔ اسی زمانے میں یمامہ (نجد) کے سردار ثُمامہ بن اثال نے بھی مسلمانوں کی اس کوشش میں مدد دی۔ ایک بظاہر تنبیہی مہم میں مسلمانوں کا ایک دستہ اسے گرفتار کر کے مدینہ منورہ لایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے صحابہؓ کو فرمایا: یہ بنی حنیفہ کا سردار ثمامہ ہے۔ اس سے اچھا برتاؤ کرو۔ اسے مسجد میں رکھا گیا اور خوراک بھی اچھی دی گئی۔ آنحضرتؐ جب بھی ادھر سے گزرتے، اسے تبلیغ دین کرتے، لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا: اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کا قتل ہوگا؛ اگر فدیہ چاہتے ہو تو جو چاہو مانگو۔ کچھ دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے رہا کر دیا۔ آپؐ کے حسن سلوک، رحم و کرم اور کچھ ایام کے ذوق صحبت نے حساس بدوی کی کایا پلٹ دی۔ باہر نکلا، غسل کیا، پھر مسجد میں آ کر کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد کہا: اب تک آپؐ کا چہرا میرے لیے سب سے زیادہ قابل نفرت تھا، اب وہ سب سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ وطن واپس جاتے ہوئے وہ مکے سے گزرا۔ اسلام کے علی الاعلان اظہار پر قریش نے اسے قتل کر دینا چاہا، پھر کسی نے یاد دلایا کہ اس کے ملک کے غلے کے تم محتاج ہو۔ رہائی پر اس نے کہا: خدا کی قسم! میرے ملک کے غلے کا ایک دانہ بھی اب تمہیں نہ ملے گا جب تک کہ رسول اللہ صلی علیہ و آلہ وسلم اجازت نہ دیں گے۔ قحط کے باعث اہل مکہ ابتر حالت میں تھے۔ ایک خط لکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عاجزانہ التجا کی کہ ثمامہؓ کے غلے کی برآمد کی بندش اٹھا دی جائے۔ آپؐ نے فوراً ثمامہؓ کو خط لکھا کہ غلے کی برآمد کو نہ روکو (ابن ہشام، ۴: ۲۸۷ تا ۲۸۸)۔

صلح حدیبیہ: ذوالقعدہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پندرہ سو صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، مگر قریش مزاحمت کے لیے مکے سے نکل کر حدیبیہ [رک بآں] آ گئے، جو فوجی نقطۂ نظر سے مکے کا دروازہ ہے۔ انہوں نے اپنے حلیف احابیش [رک بآں] کو بھی بلا لیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یکے بعد دیگرے متعدد سفیر بھیجے [تاکہ قریش مکہ کو یقین دہانی کرائیں کہ آپؐ صرف عمرہ کرنا چاہتے ہیں، مگر قریش نے اصرار کیا اور کہا] کہ واپس چلے جاؤ، تمہیں مکہ آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ آنحضرتؐ نے قریش کے سفیروں کو اپنے قربانی کے جانور دکھائے اور اطمینان دلایا کہ مقصد صرف عمرہ ہے (ابن ہشام، ۲: ۳۲۱ تا ۳۲۹)، لیکن ان سفیروں کو معاہدے کا اختیار نہ دیا گیا تھا، اس لیے آنحضرتؐ نے خراش الخزاعی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ مکہ مکرمہ میں اس کی اونٹنی مار ڈالی گئی اور خود اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑی مشکل سے وہ جان بچا کر واپس آئے (حوالۂ مذکور)۔ اب آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ

کو، جو ابو سفیان کے قریبی رشتہ دار بھی تھے، مقصد کی وضاحت کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا۔ انھیں قید کر لیا گیا۔ ادھر اسلامی لشکر میں افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر تمام صحابہؓ سے موت کی بیعت لی کہ جان کی پروا کیے بغیر لڑیں گے اور راہ فرار اختیار نہ کریں گے۔ نازک صورت حال کے پیش نظر قریش مکہ نے سہیل بن عمرو جیسے سنجیدہ اور صلح پسند شخص کو بھیجا کہ مصالحت کی کوشش کرے۔ طویل گفت و شنید کے بعد طے ہوا کہ: (۱) مسلمانوں اور قریش مکہ میں دس سال تک باہم صلح رہے گی؛ طائف جانے کے لیے مسلمان مکے سے اور شام جانے کے لیے اہل مکہ مدینہ منورہ سے گزر سکیں گے؛ (۲) امسال آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ عمرہ کیے بغیر واپس چلے جائیں گے؛ (۳) اگلے سال مسلمان عمرہ کرنے کے لیے صرف تین دن کے لیے مکہ مکرمہ آ سکیں گے؛ (۴) مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکہ مکرمہ میں آ کر پناہ گزین ہو تو اسے واپس نہ کیا جائے گا، لیکن اہل مکہ میں سے اگر کوئی آنحضرتؐ کے پاس آئے تو اس کو اس کے سرپرستوں کے مطالبے پر ان کے سپرد کر دیا جائے گا؛ (۵) ہر فریق خلوص سے شرائط صلح پر عمل کرے گا۔ وہ نہ تو چھپ کر کسی تیسرے شخص کو مدد دے گا، نہ خود خیانت کرے گا (بلکہ غیر جانبدار رہے گا)؛ (۶) دیگر قبائل بھی حسب منشا فریقین میں سے کسی کے ساتھ ملحق ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں ان کے بھی وہی حقوق و فرائض ہونگے جو اصل فریقین کے ہیں؛ (چنانچہ بنو خُزاعہ نے مسلمانوں کی طرف سے اور احابیش نے اہل مکہ کی طرف سے معاہدے میں شمولیت اختیار کر لی)۔

دوسری، تیسری اور خاص کر چوتھی شرط پر مسلمانوں کو بڑی تشویش ہوئی اور حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی عمیق مقصد کو فوراً نہ سمجھ سکی اور برملا رسول اللہؐ کے سامنے اظہار ناپسندیدگی کیا، لیکن مسلمانوں میں انتہا درجے کا نظم و ضبط تھا؛ آنحضرتؐ کی رضامندی کو دیکھ کر ہر شخص راضی برضا ہوگیا (نیز رک بہ حدیبیہ؛ غزوات)۔

قرآن مجید میں اس صلح حدیبیہ کو فتح مبین کہا گیا ہے، جو آگے چل کر واقعی ایسا ہی ثابت ہوئی۔

خیبر کے یہودیوں کی شرارتیں بدستور جاری رہیں؛ اس لیے آپؐ نے اس فتنے کی سرکوبی کا عزم مصمم کر لیا؛ چنانچہ ایک مہینے کی تیاری کے بعد محرم ۷ھ میں خیبر [رک بآں] پر قبضہ کر کے اسے اسلامی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔

[صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرا کام یہ کیا کہ شاہان عالم کے نام تبلیغی خطوط ارسال کیے]۔

حسب معاہدہ ایک سال بعد آنحضرتؐ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ آئے اور قریش کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا، بلکہ ہر طرح ان کا دل موہ لینے کی کوشش کی۔ اسی سال وہاں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا۔ اسی زمانے میں حضرت خالدؓ بن الولید اور حضرت عمروؓ بن العاص جیسے باصلاحیت لوگ مسلمان ہوے ابو سفیان کی اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہؓ، جو مسلمان تھیں، حبشہ میں بیوہ ہو گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ عقد کا اعزاز بخشا۔ [ان کے شوہر نے مرتد ہو کر انھیں بھی نصرانی بننے پر مجبور کیا تھا، لیکن وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں تالیف قلب کے لیے آپؐ نے ان سے نکاح فرما لیا]۔ اس ازدواج سے ابو سفیان کا متأثر ہونا ناگزیر تھا۔ اسی زمانے میں حبشہ سے مسلمان مہاجرین اور بعض نو مسلم حبشی بھی عرب آئے۔ ان کی خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔

فتح مکہ: شعبان ۸ھ میں بنوخزاعہ اور بنو بکر کے جھگڑے میں کچھ خونریزی ہوئی تو بعض اہل مکہ نے چھپ کر بنو بکر کی فوج میں شرکت کی اور انھیں ہتیار مہیا کیے۔ یہ صلح حدیبیہ کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ بنو خزاعہ نے، جو مسلمانوں کے حلیف تھے، آنحضرت ؐ سے شکایت کی تو آپ ؐ نے مدد کا وعدہ فرمایا؛ [چنانچہ آپ ؐ نے قاصد کے ذریعے قریش مکہ کے سامنے تین شرائط پیش کیں: (۱) مقتولین کی دیت ادا کی جائے؛ (۲) بنو بکر سے قریش معاہدہ توڑ لیں؛ (۳) صلح حدیبیہ کو ختم کر دیا جائے۔ قُرط بن عمر نے قریش کی طرف سے جواب دیا کہ ہم کو تیسری شرط قبول ہے (الزرقانی: شرح المواہب، ۱۲: ۳۳۶)]، مگر پھر قریش مکہ کو ندامت ہوئی اور ابو سفیان کو صلح کی تجدید اور اس کی مدت میں اضافے کے لیے مدینہ منورہ بھیجا (المقریزی، ۱: ۳۵۸)۔ ابو سفیان تجدید معاہدہ میں ناکام ہو کر واپس چلا گیا اور اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ آنحضرت ؐ کیا کرنے والے ہیں۔ دوسری طرف آپ ؐ نے مدینے کے لوگوں کو ایک مہم کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا، [مگر اس کی وضاحت نہیں فرمائی]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک طرف تو یہ انتظام کیا کہ مدینہ منورہ سے کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔ [ایک شخص حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ کو اطلاع پہنچانی چاہی، مگر اس کا خط پکڑا گیا۔ آپ ؐ نے اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اسے معاف فرما دیا (ابن ہشام، ۴: ۴۰)]۔ دوسری طرف ملک کے تمام حلیف قبائل کو مخفی احکام بھیجے کہ ایک بڑی مہم پر جانے کے لیے تیار رہیں، لیکن مدینہ منورہ نہ آئیں، ہم خود تمھارے علاقے میں سے گزرتے وقت تم کو ساتھ لیں گے۔ الواقدی نے المغازی میں صراحت کی ہے کہ آنحضرت ؐ نے بنو سُلیم وغیرہ کو رمضان المبارک میں مدینہ منورہ آنے کا حکم دیا، لیکن الیعقوبی (۲: ۱۵۸-۵۹) کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کہ ان بیرونی قبائل کے صرف سرداروں کو مدینہ منورہ بلایا گیا اور آنے پر ہر ایک کو رازدارانہ طور پر حکم دیا کہ رضاکاروں کے ساتھ تیار رہیں اور اس امر کو راز میں رکھیں۔ آنحضرت ؐ نے ان کے علاقے میں گزرتے وقت انھیں فوج میں شریک کر لیا۔ جب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو آپ ؐ آڑے ترچھے، اور نامانوس راستوں سے روانہ ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ ؐ نے ایک مہم بطن اضم بھیجی، جو مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں کوئی تین دن کی مسافت پر ہے۔ مؤرخین نے صراحت کی ہے کہ اس کا مقصد محض دشمنوں کی توجہ ہٹانا تھا۔ اس طرف سے آپ ؐ جلد ہی دوسری سمت روانہ ہوگئے حتی کہ مرالظہران پہنچنے تک (جو مکے سے ایک ہی منزل پر ہے) اکابر صحابہ ؓ بھی نہ جان سکے کہ کدھر کا قصد ہے (المقریزی: امتاع، ۱: ۳۶۵؛ الطبری: تاریخ، ۱: ۱۶۲۰)۔ بہرحال قبائلی دستوں کو لینے کے بعد دس ہزار کے لشکر جرار سمیت آپ ؐ نے رمضان المبارک ۸ھ میں مکہ کے اطراف میں واقع پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا اور حکم دیا کہ رات کو ہر سپاہی ایک علٰحدہ آگ روشن کرے۔ ابو سفیان نے مکے کی ایک بلندی پر سے آگ جلنے کا نظارہ کیا تو ایک بہت بڑے میدان میں آگ جلتی دکھائی دی۔ اس نے خیال کیا کہ کم از کم پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ کوئی دشمن حملہ آور ہوا ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے اور پتا چلانے کے لیے آگے بڑھا۔ لشکر اسلام کے ایک گشتی دستے نے اسے گرفتار کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ آپ ؐ نے حکم دیا کہ اسے حفاظت سے رکھو اور واپس نہ جانے دو۔ صبح کو حکم دیا کہ فوج چار مختلف جہتوں سے مکے میں داخل ہو، لیکن بجز مدافعت کے ہرگز کوئی

خونریزی اور لوٹ مار نہ کی جائے۔ تمام دستوں کو ابو سفیان کی آنکھوں کے سامنے سے گزارا گیا۔ جب ساری فوج روانہ ہوگئی تو ابو سفیان کو رہا کر دیا گیا۔ وہ اس وقت شہر میں پہنچا جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہونا شروع ہو چکی تھی اور فوجی نقیب ہر طرف چلا چلا کر کہ رہے تھے: جو کوئی ہتیار ڈال دے گا، اسے امن ہے؛ جو اپنے گھر میں بند بیٹھا رہے گا اسے امن ہے؛ جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا، اسے امن ہے۔ خود آنحضرتؐ بڑے راستے سے شہر میں داخل ہوے [اور اس شان سے کہ آپ کا سر مبارک، بموجب ارشاد خداوندی: وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (ع [الاعراف]: ۶۱)، فرط تواضع سے سواری کے پالان کو چھو رہا تھا]۔ آپ کا یہ داخلہ فاتحانہ، مگر پیغمبرانہ تھا۔

حضرت خالدؓ بن الولید کا رسالہ اس راستے سے داخل ہوا جہاں خود ان کا قبیلہ سکونت پذیر تھا۔ ان کے رشتہ دار عکرمہ بن ابی جہل نے انھیں روکنے کی کوشش کی، جس پر معمولی خونریزی ہوئی۔ آنحضرتؐ کو اطلاع ہوئی تو فوراً حضرت خالدؓ کو تنبیہ کی کہ ہاتھ کو روک لو (الواقدی: المغازی، ۲: ۷۸ ببعد؛ ابن سعد: الطبقات، ۲: ۱۳۴ تا ۱۴۴)۔

پر امن داخلے کے بعد آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ مسلمانوں کی سابقہ ضبط شدہ جائدادیں واپس نہیں لی جائیں گی، بلکہ غیر مسلم قابضین کے قبضے ہی میں رہنے دی جائیں گی، حتّٰی کہ خود اپنے مکان کو بھی آپؐ نے واپس نہ لیا (البلاذری: الانساب، ۱: ۳۵۶؛ البخاری، ۳: ۱۴۰)، کتاب المغازی، باب ۴۸، یہ ایک اہم قانونی حکم تھا۔ پھر اعلان ہوا کہ تمام لوگ بیت اللہ شریف میں جمع ہوں، آپؐ ان کو خطاب کرنا چاہتے ہیں؛ چنانچہ تمام لوگ جمع ہو گئے۔ آنحضرتؐ جب بیت اللہ شریف میں تشریف لائے تو کعبے کے اطراف کے تمام بت توڑ دیے گیے۔ کعبے کے اندر کی رنگین تصویریں بھی دھو کر مٹا دی گئیں۔ پھر حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبے کی چھت یا جبل ابی قبیس پر چڑھ کر اذان دیں (الازرقی: اخبار مکہ، ص ۱۱۳)۔ اس پر بعض غیر مسلم ناراض بھی ہوے؛ نماز با جماعت کے بعد آنحضرتؐ نے غیر مسلم اہل مکہ کو مخاطب کرکے ان کی گزشتہ بیس سالہ اسلام دشمنی کی سرگرمیاں یاد دلاتے ہوے پوچھا: اب تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو؟ وہ شرم سے صرف یہ کہ سکے: تم ایک شریف بھائی اور ایک شریف بھتیجے ہو۔ اس پر آنحضرتؐ نے یہ تاریخی جواب دیا: [لاتثریب علیکم الیوم انتم الطلقاء، یعنی] آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عتاب بن اسید اس غیر متوقع اعلان پر آپے سے باہر ہو گیا، جھپٹ کر حضورؐ کے سامنے آیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ آپؐ کے حسن سلوک اور عمدہ اخلاق سے متأثر ہو کر تقریباً سارے کا سارا شہر مسلمان ہوگیا اور اس اخلاص کے ساتھ کہ دو سال بعد جب آنحضرتؐ کی وفات ہوئی اور عرب میں ارتداد کی لہر اٹھی تو اہل مکہ خلوص کے ساتھ اسلام پر قائم رہے۔

اس عام معافی کے اعلان پر مختلف دلچسپ چیزیں پیش آئیں، مثلاً اس موقع پر آپؐ کے قدیمی دشمن عکرمہ بن ابی جہل کو اپنی جان کا خوف ہوا اور چاہا کہ بھاگ کر کسی اجنبی ملک میں پناہ گزین ہو جائے۔ اس کی بیوی ام حکیم آ کر مسلمان ہو گئی اور شوہر کی جان بخشی چاہی تو آنحضرتؐ نے فوراً قبول فرما لیا اور اسے امان دے دی۔ وہ جا کر شوہر کو واپس لائی اور وہ اس خلوص سے مسلمان ہوے کہ اس کی نظیر کم ملتی ہے۔ انھوں نے کہا: اسلام کے خلاف میں نے جتنا مال صرف کیا اور جتنی جنگیں کیں، اب اس کا دگنا بطور کفارہ اسلام کے لیے کروں

گا؛ چنانچہ اپنے اس عہد کو پورا کیا ۔ (عکرمہؓ نے جنگ یرموک میں شہادت پائی) ۔

ایک اور شخص صفوان ابن امیہ آیا جس نے فتح مکہ کے موقع پر عسکر اسلام کی شہر میں داخلہ کے وقت بھرپور مخالفت کی تھی اور کہنے لگا : میں ابھی اسلام قبول نہیں کرنا چاہتا ، مجھے دو مہینے کی مہلت دی جائے ۔ آپ ؐ نے فرمایا : تمھیں چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے (ابن ہشام ، ۴ : ۶۰) ۔ چند روز بعد وہ بھی خلوص دل سے مسلمان ہوگیا ۔

ابو سفیان کی بیوی ہند، جس نے جنگ احد میں آنحضرت ؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کا مُثلہ کیا تھا ، اس نے فتح مکہ کے بعد ایک ہتوڑا لے کر گھر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا اور کہا : تم نے ہم کو بہت دن دھوکے میں رکھا ؛ آج معلوم ہوگیا کہ تمھیں کتنی قدرت ہے ! پھر نقاب ڈال کر چند دیگر عورتوں کے ساتھ چھپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آئی اور اسلام قبول کر لیا (السہیلی ، ۲ : ۲۷۷ ، وغیرہ) ۔

وحشی بھی جو حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا ، آکر مسلمان ہوا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے معاف فرما دیا اور صرف یہ کہا : بہتر ہے کہ تو آئندہ میرے سامنے نہ آئے تاکہ مجھے حضرت حمزہؓ کی یاد سے دکھ نہ ہو (البلاذری، ۱: ۳۶۳).

فتح مکہ کے بعد آپ ؐ نے آس پاس کے تمام بت اور بڑے بتخانے مسمار کروا دیے ۔ حضرت خالدؓ بن ولید کو عزّٰی کے خلاف نخلہ (طائف اور مکے کے مابین) ، حضرت عمروؓ بن العاص کو سواع کے خلاف رہاط (بلاد ہذیل میں)، حضرت سعدؓ بن زید الاشہلی کو منات کے خلاف مُشَلّل (مدینہ منورہ کے جنوب میں ساحل پر) بھیجا اور اس طرح تطہیر حرم کعبہ کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ۔ پھر حضرت خالدؓ [illegible] کو یَلَمْلَم بھیجا گیا کہ بنو جذیمہ بن عامر میں تبلیغ دین کریں ۔ غلط فہمی کی بنا پر وہاں حضرت خالدؓ نے خونریزی کی، جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ناراض ہوے اور [حضرت علیؓ کو بھیج کر] اہل خاندان کو خونبہا اور ہرجانہ دیا حتی کہ کتے کے پانی پینے کا برتن بھی اگر ٹوٹا تھا تو اس کا بھی معاوضہ دیا (البلاذری، ۱ : ۳۸۱؛ ابن ہشام، ۴ : ۷۰ تا ۷۸) ۔

غزوۂ حنین : اسی زمانے میں خبر آئی کہ بنو ہوازن اور اہل طائف مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے آ رہے ہیں ۔ طائف میں لات کا مشہور بت خانہ تھا ۔ تحقیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے جملہ جان نثاروں اور کچھ مکی رضاکاروں کے ساتھ یکم شوال المکرم ۸ھ کو دفاع کے لیے نکلے ۔ آپ ؐ ابھی حنین کی گھاٹی میں سے گزر رہے تھے کہ رات کے اندھیرے میں اچانک دشمن نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی ۔ اس حملے سے مسلمان منتشر ہو گئے ، لیکن آنحضرت ؐ کی بہادری اور ثابت قدمی سے بھاگتے ہوے مسلمان پلٹ آئے اور دشمن بدحواس ہو کر بھاگ گئے ۔ مسلمانوں نے ان کے پڑاؤ پر قبضہ کرلیا اور بے شمار جانور اور تقریباً چھے ہزار عورتیں بچے قید کیے (المقریزی، ۱ : ۴۲۳) ۔ ان میں آپ ؐ کی رضاعی بہن الشیماء بھی تھیں ۔ جب آپ ؐ کو پتہ چلا تو آپ ؐ نے ان سے بڑی محبت کا برتاؤ کیا اور انعام و اکرام کے بعد رہا کر دیا اور ان کی سفارش پر بجاد نامی اس کے ایک رشتہ دار کو بھی رہا کر دیا ، جس نے ایک مسلمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آگ میں جلایا تھا (المقریزی، ۱:۴۱۳) ۔ عام قیدیوں کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑ کر آنحضرت ؐ دشمن کے تعاقب میں بڑھے اور جا کر طائف شہر کا محاصرہ کر لیا ۔ وہاں ایرانی ماہرین تعمیرات کی بنائی ہوئی فصیل اور قلعہ تھا اور شہر میں پانی اور غذا کی کافی مقدار موجود تھی ۔ اسی لیے منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے باوجود شہر زیر نہ ہو سکا ۔

کچھ دن کی کوشش کے بعد رفقا کے مشورے سے آپؐ محاصرہ اٹھا کر واپس ہو گئے ۔ چونکہ طائف کے اطراف میں اسلام پھیل گیا تھا ، اس لیے اس کو مطیع کرنے کے لیے معاشی دباؤ کافی سمجھا گیا ؛ چنانچہ ایک سال کے اندر ان کے وفد نے مدینہ منورہ آ کر اسلام قبول کر لیا (تفصیل آگے آئے گی) .

طائف سے واپسی کے وقت جعرانہ کے مقام پر میں بنو ہوازن کے مال غنیمت اور قیدیوں کو حسب قانون اہل فوج میں بانٹ دیا ۔ یہ آنحضرتؐ کی دودھ پلائی کے خاندان کے لوگ تھے ۔ اس کے چند دن بعد ان کا وفد آیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور مال اور عورتوں بچوں کی واپسی کی التجا کی ۔ آنحضرتؐ نے کہا : تم نے بہت تاخیر کی ہے ۔ اب تو ہر چیز تقسیم ہو چکی ہے ؛ تاہم آپؐ نے فرمایا کہ تمھیں ایک ہی چیز واپس مل سکتی ہے، مال یا قیدی ۔ انھوں نے قیدیوں کی واپسی کا تقاضا کیا تو آپؐ نے قیدی رہا کر دیے ۔ (۱ : ۴۲۹) ۔ پھر آپؐ مدینہ منورہ واپس لوٹ گئے ؛ [نیز رک بہ حنین ؛ طائف] .

دو ماہ بعد حج کا موسم آیا تو اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں لوگ جمع تھے اور ہر کسی نے اپنے اپنے انداز سے حج کیا ۔ ۹ھ میں حج کے موقع پر سورۃ التوبۃ کا نزول ہوا، جس میں آئندہ سال سے مشرکین کے حج بیت اللہ پر پابندی لگائے جانے کا حکم نازل ہوا تو آپؐ کی طرف سے اس کا موسم حج میں اعلان کیا گیا .

طائف کا قبول اسلام : طائف کے ایک سردار عروہؓ ابن مسعود کو اسلام کی ترغیب ہوئی ۔ وہ مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہو گئے اور درخواست کی کہ انھیں طائف میں تبلیغ اسلام کی اجازت دے دی جائے ۔ اس کی جان کے خطرے سے آنحضرتؐ کو تردد تھا ، مگر اس کے بار بار کے اصرار پر آنحضرتؐ نے اسے اجازت دے دی، مگر انھیں ان کے ہمسایوں نے شہید کر دیا ۔ اس پر اس کے کچھ رشتہ دار مدینہ منورہ آ کر مسلمان ہو گئے ۔ اس سے طائف میں اشاعت اسلام کی تحریک مزید بڑھی اور ان کا ایک وفد مدینہ منورہ آیا اور کہا : "ہم اسلام لانے کے لیے آمادہ ہیں ، البتہ نماز نہیں پڑھیں گے ، زکوٰۃ نہیں دیں گے ، جہاد نہیں کریں گے ، زنا اور شراب سے باز نہیں رہیں گے ۔ علاوہ ازیں ہمارا بت خانہ لات نہ توڑا جائے ؛ سود بھی ہمارے لیے ممنوع نہ رہے اور ہمارے علاقے کو بھی مکے کی طرح حرم قرار دیا جائے ، جہاں کے نہ درخت کاٹے جائیں اور نہ شکار کیا جائے . . . . [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منظور نہ کیا] ۔ بالآخر کافی مشورے اور غور و خوض کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ لات کے بت اور بت خانے کو منہدم کرنے کے لیے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور ابو سفیانؓ کو بھیجا گیا ۔ حضرت مغیرہؓ نے طائف کی ساری آبادی کے سامنے دو چار وار کر کے بت اور بت خانے کا خاتمہ کر دیا ۔ اس سے اہل طائف کا ایمان مزید راسخ ہوگیا ۔ اس طرح اہل طائف کی عظیم ذہنی اور انتظامی صلاحیتوں سے عہد نبوی سے ہی استفادہ شروع ہو گیا اور خلافت راشدہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا .

مکہ اور طائف [دونوں شہر سیاسی ، اجتماعی اور دینی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں] ۔ جب یہ دونوں شہر برضا و رغبت اسلامی نظام سے منسلک ہو گئے تو باقی عرب کے لیے معمولی سی بات بھی کافی تھی ؛ چنانچہ ایک ہی سال کے اندر بمصداق آیۂ کریمہ: یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (۱۱۰ [النصر] : ۱ - ۲) اسلام لانے کے لیے وفد پر وفد مدینہ منورہ آنے لگے اور اس طرح اسلام کی بیرون عرب کامیابیوں کا گویا راستہ کھل گیا ؛ لیکن بیرون عرب کے تعلقات نبوی سے قبل کچھ یہودیوں کا ذکر مناسب ہوگا .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور یہودی : یہود کے تعلقات عرب (سبا ، یمن) کے ساتھ حضرت

سلیمان[۴] کے زمانے سے تھے۔ مختصر تعداد میں یہ لوگ ہر جگہ آباد تھے ۔ شمال میں مقنا ، تیما ، خیبر ، وسط میں مدینہ اور طائف ، جنوب میں یمن اور عمان وغیرہ میں ان کی قابل لحاظ آبادیاں اور بستیاں تھیں۔ وہ مکہ مکرمہ میں تجارت کے لیے آیا تو کرتے تھے، لیکن وہاں متوطن نہ تھے .

اسلام کا ان سے سابقہ سب سے پہلے مدینہ منورہ میں پڑا ۔ ان کی آبادی وہاں نصف کے قریب تھی ۔ وہ تین بڑے قبیلوں میں منقسم تھے: بنو قینقاع، بنوالنضیر، اور بنو قریظہ ۔ بنو قینقاع زرگر اور تاجر تھے اور مدینے میں سوق بنی قینقاع گویا بین الممالک تجارت کی منڈی تھا ۔ [وہ تمام یہودی قبائل سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے۔ اسلحہ کے اعتبار سے بھی ان کو تفوق حاصل تھا]۔ بنو النضیر بڑی ذات والے اور بنو قریظہ نیچ ذات والے سمجھے جاتے تھے؛ کیونکہ بنو النضیر کے قاتل قریظہ کے مقتولوں کی صرف نصف دیت (خونبہا) دیا کرتے تھے ۔ مقاتل (تفسیر ، بذیل ۵ [المآئدۃ] ۴۴) وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ آنے پر جب اس نا انصافی کو منسوخ کر کے بنو قریظہ کو بھی دوسروں کے ساتھ مساویانہ حقوق عطا فرمائے تو بڑی ذات والے یہودی اس سے ناراض ہو گئے ۔ آپ ؐ نے نرمی اور شفقت سے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ، مگر بے سود ۔ عبداللہ بن سلام وغیرہ گنتی کے چند لوگ تو خلوص سے مسلمان ہوے ، لیکن باقی اکثر آپ ؐ کی مخالفت پر کمر بستہ رہے۔ بعد میں کچھ لوگ دنیوی مصلحتوں سے ظاہر داری کے لیے نفاق کے ساتھ اسلام کا اظہار بھی کرنے لگے (ابن ہشام ؛ ص ۳۵۵) .

[یثرب میں آباد عرب قبائل میں ان یہودیوں نے علمی اور معاشی اعتبار سے اپنی جڑیں خاصی مضبوط کی ہوئی تھیں ۔ تجارتی اور خاص کر سودی لین دین کی وجہ سے عرب قبائل کو انھوں نے اپنا دست نگر بنایا ہوا تھا ۔ یہ لوگ نہایت بیدردی اور شقاوت قلبی سے سود در سود کی رقوم وصول کرتے رہتے ، یہاں تک کہ مجبوری اور بیکسی کی صورت میں معصوم بچوں اور عفیفہ عورتوں کو رہن رکھوا لیتے (دیکھیے البخاری ، ۳ : ۷۵، کتاب المغازی ، باب ۱۵) اور دو چار روپے کے زیور کے بدلے معصوم جانیں تلف کر دیتے (البخاری، ۴ : ۳۱۷ تا ۳۱۸، کتاب الدیات ، باب ۷) ۔ دولت کی بہتات سے اور باتوں کے علاوہ ان میں بدکاری عام ہو گئی تھی ، تاہم شرفا کے لیے یہ لوگ رجم کے بجاے صرف منہ کالا کرنے پر اکتفا کر لیتے تھے (مسلم ، الصحیح ، ۳ : ۱۳۲۶، شمارہ ۱۶۹۹ کتاب الحدود)؛ چند کوڑیوں کے بدلے وہ احکام الٰہی میں ترمیم و تنسیخ کر ڈالتے (۲ [البقرۃ] ۷۹) ، ایک دوسرے کا گلا کاٹتے (۲ [البقرۃ] : ۸۵) ، شرک و کفر کی حمایت کرتے اور مشرکین کو مسلمانوں سے بہتر بتاتے (۲ [النساء] : ۲۱ تا ۲۲) ، خدا کی شان میں گستاخی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے (۳ [آل عمران] : ۱۸۱)؛ اپنے بعض بزرگوں کو خدا کا بیٹا کہتے یا وہ درجہ دیتے (۹ [التوبۃ] : ۳۰ تا ۳۱)؛ خدا کے احکام کو لوگوں سے چھپاتے (۲ [البقرۃ] : ۱۵۹ ، ۱۷۴ ببعد) ؛ حضرت سلیمان[۴] کو جادو گر اور حضرت جبریل[۴] کو اپنا ازلی دشمن بتاتے (۲ [البقرۃ] : ۹۷ تا ۹۸، ۱۰۲) ؛ اعلانیہ جھوٹ بولتے اور حرام کھاتے (۵ [المائدۃ] : ۴۲) ؛ کوئی امانت سونپتا تو اس میں خیانت کرتے اور کہتے کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر کوئی حق نہیں (۳ [آل عمران] : ۷۵) ۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بتلاتے (۵ [المائدۃ] : ۱۸) ، وغیرہ .

اس پر مستزاد یہ کہ ان یہودیوں کو قبائل عرب کا اتحاد ایک آنکھ نہ بھاتا تھا ؛ چنانچہ انھوں نے ان قبائل عرب کے ساتھ اتحاد کے پردے میں ان کو باہم لڑانے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا ؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ لوگ لڑتے

رہیں گے تو ہمارا تجارتی اور سودی کاروبار چلتا رہے گا، ورنہ یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا۔ اس بنا پر بلا شبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یہودی عرب معاشرے میں ایک ناسور کی حیثیت رکھتے تھے۔

جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینۂ منورہ میں تشریف لائے تو یہودیوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب اس سچے مذہب کی روشنی میں ہمارا کاروبار ختم ہو جائے گا؛ چنانچہ انھوں نے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف قرآن مجید میں ان کے عیوب و نقائص کو ہدف تنقید بنایا گیا اور انھیں دعوت دی گئی کہ دین اسلام کی روشنی میں وہ اپنے عقیدہ و فکر کی اصلاح کر لیں (دیکھیے ۲ [البقرۃ] : ۳۱ تا ۱۲۳ ؛ ۲ [آل عمران] : ۶۴ تا ۹۱ ، ۱۱۰ تا ۱۲۰ وغیرہ)۔ اس کے علاوہ اسلام کی آمد سے یہود یثرب کا سودی کاروبار مکمل طور سے ختم ہوگیا تھا ، کیونکہ اسلام نے روز اول ہی سے سود اور سودی کاروبار کی مذمت شروع کر دی تھی۔ پھر چونکہ ان کے عیوب و نقائص بھی بیان کیے جارہے تھے ، اس بنا پر ان کی ناراضگی اور زیادہ بڑھ گئی؛ تاہم آپؐ نے ان کے بارے میں ہمیشہ تحمل اور بردباری سے کام لیا۔ وہ آپؐ کو سلام کی بجائے سام (موت آئے) کہتے تھے (البخاری وغیرہ)۔ ایک یہودی کا آپؐ پر قرض تھا؛ اس نے ایک بھری مجلس میں (جب کہ اس کی ادائیگی کا بھی وقت نہ آیا تھا) آپؐ کے گلے میں چادر ڈالی اور زور سے کھینچ کر کہا : اے محمد! تم میرا قرض کیوں نہیں دیتے ؟ بخدا تم بڑے نادہندہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اس گستاخی کا مزا چکھانے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا : اے عمر! تمھیں چاہیے تھا کہ تم اسے حسن طلب کی تلقین کرتے اور مجھے حسن ادا کی۔ پھر آپؐ نے اس کو کھجوریں دینے کا حکم دیا (ابن الجوزی : الوفا)]

جب مدینہ منورہ میں شہری مملکت قائم ہوئی تو یہودیوں کی اکثریت انصار سے اپنی ماتحتانہ حلیفی کی وجہ سے اس میں خود بخود شریک ہو گئی (ابن ہشام، ۲ : ۱۴۹) [بلکہ الزرقانی (شرح المواہب، ۱: ۵۵۱) اور ابن سعد (الطبقات ، ۲ : ۲۹) کے بیانات میں اس بات کی صراحت ہے کہ ان یہودیوں نے خود آپؐ سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ نہ تو آپ کے خلاف لڑیں گے اور نہ کسی دشمن کو مدد دیں گے]، لیکن سماجی تعلقات مسلمانوں کے ساتھ درست نہ رہ سکے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو ان میں حسد پیدا ہوا اور مکہ مکرمہ جا کر قریش مکہ کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے لگے (ابن ہشام، ۳ : ۵۰، ببعد)۔ اسی زمانے (شوال ۲ھ) میں ایک مسلمان عورت بنی قینقاع کے ایک زرگر کی دکان پر گئی، جس نے اس مسلم خاتون سے توہین آمیز سلوک کیا۔ ایک انصاری مسلمان، جو وہاں سے گزر رہا تھا ، برداشت نہ کر سکا اور زرگر کا سر قلم کر دیا۔ دوسرے یہودی آئے اور اس مسلمان کو جان سے مار ڈالا۔ آپؐ ان کی فہمائش کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا : بدر والوں کے انجام سے عبرت پکڑو۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا : ہم قریش نہیں ؛ ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے (ابن ہشام ، ۳ : ۵۰)۔ اس طرح جنگ چھڑ گئی۔ پندرہ دن کے محاصرے کے بعد چار سو زرہ پوش اور تین سو دیگر جنگجو مقاتلین کی موجودگی کے باوجود یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ آنحضرتؐ نے ان کی جان بخشی کر دی اور ان کو اسلحہ لے کر شہر سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ اَذرعات (فلسطین) چلے گئے۔ اس حادثے کے بعد باقی یہودیوں کی عداوت بڑھ گئی (البلاذری : انساب، ۱ : ۳۰۸ تا ۳۱۰ ؛ [نیز رک بہ قینقاع]) .

غزوۂ بنی نضیر (ربیع الاول ۴ھ) : بنو نضیر اور نجد کے بنو عامر میں معاہدۂ حلیفی تھا (ابن ہشام ، ۳ : ۱۹۹)۔ بنو عامر نے مسلمانوں کی ایک تبلیغی

جماعت کو بلا کر غدّاری سے قتل کر دیا ۔ پوری جماعت میں سے صرف حضرت عمروؓ بن امیہ الضمری کسی طرح جان بچا کر مدینہ واپس پہنچے ۔ انھوں نے راستے میں بنو عامر کے دو آدمیوں کو سوتے پایا اور ان کے مسلمان ہونے سے ناواقفیت کی بنا پر موقع ملنے پر انھیں قتل کر دیا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپؐ نے سخت خفگی اور افسوس کا اظہار کیا اور ان کی دیت ان کے رشتہ داروں کو بھیجی۔ حلیف ہونے کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بنو نضیر کے پاس بھی گئے اور دیت میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی ۔ بنونضیر نے [بظاہرتو] مطالبے کو قبول کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو انتظار کرنے کے لیے کہا، [مگر دوسری طرف ایک یہودی عمرو بن جحاش بن کعب ایک پتھر اوپر سے گرانے کے لیے چڑھا۔یہ] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی ناپاک سازش تھی اور اس طریقۂ قتل کی اس زمانے میں کئی اور مثالیں پیش آ چکی تھیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سمجھا دیا ۔ آپؐ چپکے سے واپس چلے آئے ۔ آپؐ نے ان کو تجدید معاہدہ کی دعوت دی ، جو انھوں نے رد کر دی ۔ اس طرح بنو نضیر سے بھی جنگ چھڑ گئی ۔ بجائے عفو طلبی کے وہ مقابلے پر آمادہ ہوگئے ۔ دو ہفتوں کے محاصرے کے بعد صلح پر آمادہ ہوئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان سے بڑی رعایت کی ۔ انھیں کل مال و متاع سمیت چلے جانے کی اجازت دی ؛ صرف اسلحہ اور اراضی کو ضبط کیا ؛ حتّٰی کہ ان کے جو قرض مسلمانوں پر تھے ان کی بازیابی کا بھی انھیں حق دیا (السرخسی : شرح السیر الکبیر ، ۳ : ۱۸۰ ، ۲۲۹) ۔ انھیں یہ رعایت بھی دی کہ وہ بوقت ضرورت تجارت وغیرہ کے لیے مدینہ منورہ آ سکتے ہیں ۔ ان کے برے برتاؤ کی وجہ سے جنگ کے زمانے میں بنو قریظہ کا کوئی یہودی ان کی مدد کو نہ آیا (المقریزی ، ۱ : ۱۷۹) ۔ ان کا بڑا حصہ خیبر میں جا بسا اور کچھ فلسطین چلے گئے ۔ چند ایک مسلمان بھی ہوگئے ۔ ان میں سے جو خیبر میں آباد ہوئے انھوں نے جنگ خندق ۵ھ برپا کرائی، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ۔

بنو قریظہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بڑی مہربانیاں تھیں ۔ آپؐ نے انھیں بنو نضیر کے چھوت چھات سے نجات دلائی تھی ، مگر انھیں بھی شکرگزاری میسر نہ آئی ۔ غزوہ احزاب (خندق) میں، جب مسلمان سخت کرب کی حالت میں تھے، تو بنو نضیر کے ورغلانے پر بنو قریظہ بھی آمادۂ فساد ہوگئے کہ مسلمانوں کی صفوں پر اندر سے حملہ کریں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سیاسی اور عسکری دونوں محاذوں پر شدید سرگرمی دکھانے پر جب محاصرہ کرنے والے ناکام واپس ہوگئے تو بنو قریظہ کو اپنے اعمال کا ذمہ دار بننا ناگزیر تھا ۔ وینسنک (رسالہ *Der Islam* ، ۲ : ۲۸۹) نے غیر جانبداری سے معقول بات لکھی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنو نضیر کے ساتھ بڑی نرمی کا برتاؤ کیا تھا، مگر جواباً انھوں نے خندق کا دہشت ناک محاصرہ کرایا ۔ بنی قریظہ کو بھی اس دفعہ معاف کرنے میں ضرورت سے زیادہ خطرات مول لینا تھے ۔ بہرحال [مختلف روایات کے مطابق] پندرہ، پچیس یا تیس دن کے محاصرے کے بعد انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قبول کیا کہ ان کے حلیف انصار [بنو اوس] ان کی تحکیم کریں ۔ بنو اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ نے جو زخمی تھے ، فیصلہ دیا کہ یہود پر یہودی قانون (تورات کا حکم) ہی نافذ کیا جائے (جو کتاب استثنا ، ۲۰ : ۱۰ تا ۲۰ میں ہے) ۔ تورات کا حکم یہ تھا کہ مقاتلین قتل کیے جائیں؛ عورتیں بچے غلام بنائے جائیں ۔ یہ فیصلہ سخت تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مجبور تھے کہ حَکَم کے فیصلے کا احترام

کریں۔ کچھ قریظی یہودی مسلمان ہوگئے تھے، انھیں اس حکم سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ اس طرح یہود سے برتاؤ کی ایک منفرد نظیر قائم ہو گئی۔ یہودی افراد کی موجودگی مدینہ منورہ میں کم ہوئی، مگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ بنو عُریض وغیرہ کے چند قبائل پھر بھی باقی رہے۔ ان میں سے بعض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عطیات بھی دیے (الوثائق السیاسیة، عدد ۲۰)۔ اس کے علاوہ بعض یہودی تجارت سے مرفّہ الحال ہوتے رہے۔ آپؐ نے ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن رکھوا کر، وصال سے کچھ روز قبل، کچھ غلہ قرض لیا تھا۔ آپؐ کے وصال تک وہ زرہ اسی یہودی کے پاس رہی (البخاری، کتاب البیوع (۳۴)، باب ۸۷؛ ابن سعد، ۲۱ : ۳۱۷)۔

غزوۂ خیبر: جیسا کہ دیکھا گیا مدینہ منورہ کے باہر اسلام سے سب سے زیادہ عداوت، خیبر کے یہودیوں کو تھی۔ جنگ خندق کے وہ براہ راست ذمہ دار تھے اور بنو قریظہ کی جنگ کے بھی بالواسطہ وہی باعث ہوے تھے، لیکن ان کی ساری جانی و مالی قوت ہنوز خیبر میں محفوظ تھی۔ صلح حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قریش کو اہل خیبر سے الگ کر دیا؛ پھر چند ہفتے بعد محرم سنہ ۷ھ میں پندرہ سو مسلمانوں نے خیبر کے، بروایت یعقوبی (۲ : ۵۶) بیس ہزار اور بروایت مقریزی (۱ : ۳۱۰) دس ہزار مقاتلین کو کچھ اس طرح زیر کیا کہ پھر آئندہ انھیں کبھی اسلامی حکومت کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اسی مہم خیبر کے دوران میں تیماء اور فَدک کے یہودی بھی لڑے بغیر مطیع ہو گئے اور اہل خیبر کی شرائط پر معاہدۂ اطاعت کرنا منظور کیا، یعنی وہاں کی زمینیں سرکاری سمجھی جائیں گی اور وہ زمینوں پر زراعت کر کے سالانہ نصف پیداوار لگان میں دیا کریں۔ (نصف پیداوار کا دینا خود مدینہ منورہ کے مسلمانوں میں بھی بروایت بخاری رائج تھا، یہ اس زمانے کا علمدرآمد تھا؛ کوئی خصوصی سختی نہیں)۔

غیر مسلم رعایا پُر امن اور آئین پسند رہے تو اسلامی حکومت سے زیادہ روادار تاریخ میں کوئی اور قوم نہیں ملتی۔ [اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ بحث اپنی جگہ آئے گی۔ مختصراً یہی کافی ہے کہ (اسلامی تعلیمات کے مطابق) غیر مسلم اپنے مقدمات اپنی عدالتوں میں لے جا سکتے ہیں اور اپنے ہی قانون کے تحت]۔

آنحضرتؐ اور عرب قبائل: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقصد عقائد و اخلاق کی اصلاح تھا؛ حکومت اور فتوحات نہیں۔ اسی لیے آپؐ کی طرف سے جھگڑے مول لینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اسی بنا پر قریش اور ہوازن اور ان کے حلیف قبائل کے سوا دیگر اور قبائل عرب سے شاذ ہی کوئی جھگڑا ہوا۔ خود دین بھی چونکہ جبر و اکراہ کا مخالف تھا؛ اس لیے امن پسند بت پرستوں سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ مدینہ منورہ میں بھی ایسے لوگ آخر تک موجود رہے اور اسلامی ثقافت کے عالمگیر سمندر میں فاسد عقیدے خود بخود ختم ہوتے رہے۔ ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ کے شمال اور جنوب میں بسنے والے قبائل (بنو جُہینہ، بنو ضمرہ، بنو غِفار، بنو اسلم وغیرہ) سے حلیفی کے معاہدے کیے گئے اور ان غیر مسلم قبائل کو نہ آپؐ کی طرف سے کبھی بد عہدی کی شکایت ہوئی اور نہ خود ان کی طرف سے غداری ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ بغیر جبر کے خود بخود مسلمان ہو گئے، جن میں سے بعض فتح مکہ سے بھی بعد میں مسلمان ہوے۔

بنو ہوازن اور بنو سُلَیم، جن سے قریش کے علاوہ مخاصمت ہوئی، نہ صرف ہم جد قبائل تھے، بلکہ ان میں باہمی حلیفی کے معاہدے بھی موجود تھے۔ بنو سلیم پر تمام عرب پر حکومت کرنے کا خبط سوار تھا اور بنو ہوازن کو اپنے بت خانہ لات کے باعث مکہ مکرمہ

اور بیت اللہ شریف سے ہمسری کا دعوٰی تھا ۔ توحید کی دعوت سے اہل مکہ کی طرح ان کی مخالفت شرک دوستی کا نتیجہ تھی ۔ نجد کے بنو عامر بن صعصعہ انھیں کی ایک شاخ تھے ۔ اگر یہ خود اسلام اور اسلامی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائیاں نہ کرتے تو ان سے جو مختصر جھڑپیں ہوئیں، وہ بھی شائد نہ ہوتیں ۔ بنو غطفان اور بنو فزارہ عرب کے دو طاقتور قبیلے تھے ان سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا سامنا ہوا ۔ یہ اپنے سردار عُیینہ بن الحِصن الفزاری کی کج طبعی کے باعث اسلام اور اسلامی حکومت کے مخالف رہے ۔ اسی طرح قریش اور اہل خیبر انھیں گمراہ کرتے رہے ، مگر بعد ازاں جب حالات سازگار ہو گئے تو یہ بھی مسلمان ہو گئے ۔ اور خلافت راشدہ کی فتوحات میں شریک ہو کر اسلامی سلطنت کی توسیع کا سبب بنے ۔

جزیرہ نمائے عرب کا زرخیز ترین علاقہ جنوب میں یمن اور مشرق میں بحرین و عمان ایرانی نو آبادی پر مشتمل تھا ۔ شمالی سرحد میں رومی اثرات روز افزوں تھے ۔ عرب میں شمالی قبائل زیادہ تر عدنانی تھے ؛ بجز مدینہ منورہ کے، جہاں کے انصار یمنی الاصل تھے اور جنوب (یمن) میں قحطانی ؛ ان میں دشمنی اور مناقشت قدیم زمانے سے ہی موجود تھی ۔ بنو عدنان میں اہل مکہ اور اہل طائف وغیرہ مضر شاخ سے تعلق رکھتے تھے تو نجد اور مشرقی عرب میں جہاں ایرانی نفوذ تھا، ربیعہ شاخ تھی ۔ کسرائے ایران کے عطا کردہ تاج اور ماتحتی پر نجد کے بنو حنیفہ اپنے چھوٹے سے علاقے میں اپنے آپ کو بہت اونچا سمجھتے ۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ہوذہ بن علی نے کہا : مجھے اپنے ساتھ سارے عرب کا شریک حکمران بنا لو تو اسلام قبول کرتا ہوں ۔ ہوذہ کی وفات پر مسیلمہ کذاب [رک بآں] کو بھی یہی خبط سمایا ؛ چنانچہ اس نے جھوٹی نبوت کا دعوٰی کر کے مخالف اسلام قوتوں کو اپنے ماتحت جمع کر کے اسلام کے خلاف محاذ قائم کر لیا، مگر اس کی کوشش پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی جو ہلکی سی ضرب سے ختم بھی ہوگئی [رک بہ ابوبکرؓ] ۔

عرب کے انتہائی مشرق بحرین اور عمان میں اسلام برضا و رغبت قبول کیا گیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں علاقے پہلے ایرانی نو آبادی تھے ۔ اسلامی حکومت کی وجہ سے انھوں نے ایرانی استبداد سے نجات پائی تھی ۔ ایران کی موجودگی کے باوجود یہاں مجوسیت [رک بہ مجوس] زیادہ پھیلی ہوئی نہ تھی ۔ عمان میں تو معمولی بتوں کی جگہ اسبذ یعنی گھوڑے [ابو عبید : کتاب الاموال ، ۲۱) کی پوجا کرنے والے بھی کافی با اثر تھے (الوثائق السیاسیة ، عدد ۶۶) ۔ بہر حال الاحساء کے حکمران المنذر بن ساوٰی نے اور عمان کے مشترک حکام جیفر بن الجلندی اور عبد بن الجلندی نے تبلیغی مکتوبات نبوی پر فوراً اسلام قبول کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سارے مشرقی عرب میں حکمرانی کرنے لگا [نیز رک بہ عمان] ۔

یمن سے کوئی جھگڑا ہوا ہی نہیں ۔ نجران وغیرہ کے بنو حارث جو بت پرست تھے، حضرت خالدؓ بن الولید اور حضرت علیؓ کی پر امن تبلیغی کوششوں سے بہت جلد اور بآسانی مسلمان ہو گئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے ۔ وہاں جو نصرانی آباد تھے انھوں نے اولاً علمی بحث کے لیے ایک وفد مدینہ منورہ بھیجا تا کہ نصرانی عقائد کا اثبات کرے [رک بہ مباہلہ] ۔ عقائد کے معاملات میں ریاضیاتی دلیلیں تو پیش نہیں کی جا سکتیں ؛ [چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے پہلے تو براہین قاطعہ پیش فرمائے، مگر پھر باذن خداوندی (۳ [آل عمران] : ۶) مباہلے کی دعوت پیش کی جس سے اہل نجران گھبرا گئے ۔ بالآخر ایک باہمی معاہدہ ترتیب پا گیا] ، جس میں آپؐ کی طرف سے مذہبی

آزادی وغیرہ کا اطمینان دلایا گیا ؛ پھر خود انھوں نے درخواست کی کہ ایک مسلمان کو ان پر حاکم عدالت بنا کر ان کے ہاں بھیجا جائے (ابن ہشام ، ۲ : ۲۲۲ تا ۲۳۳؛ نیز [رک بہ نجران]) .

گمان ہوتا ہے کہ قبیلہ عنس اور قبیلہ بلحارث (بنو حارث) میں بھی رقابت تھی ۔ بلحارث مسلمان ہو گئے تو عنس کو اسلام سے کد پیدا ہو گئی ؛ چنانچہ اسود عنسی [رک بآں] نے جھوٹی نبوت کا دعوی کر کے نام نہاد صوبائی عصبیت کا علم بلند کیا ، لیکن مقامی نو مسلموں نے چند ہی ہفتوں میں اس تحریک کو ختم کر دیا تھا .

شمال مشرق میں بنو تمیم اور شمال میں بنو طیّئ اور بنو کلب سے بھی برائے نام جھڑپیں ہوئیں اور ان میں بھی اسلام ، خاص کر فتح مکہ کے بعد، تیزی سے پھیل گیا اور اس طرح سارا عرب اسلام کے زیر نگین ہو گیا ۔ سنہ ۹ھ کو عام الوفود کہا جاتا ہے۔ بیسیوں قبائل عرب کے وفد مدینہ منورہ خود بخود حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوے ۔ (دیکھیے ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۲۹۱ تا ۳۵۹ ، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء) .

بیرون عرب تبلیغ : جیسا کہ اوپر اشارۃً ذکر ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حدیبیہ میں قریش سے مصالحت کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے ہی روم ، ایران ، مصر اور حبشہ کے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے ۔ یہ سنہ ۷ھ کا آغاز تھا ۔ حبشہ [رک بآں] سے روابط اس تاریخ سے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے ۔ اس موقع پر نجاشی [رک بآں] کے نام آپؐ نے جو تبلیغی خط ارسال کیا وہ ہرقل کو آپؐ کے لکھے ہوے خط سے مشابہ ہے (الوثائق السیاسیة ، عدد ۲۲) ۔ یہ مکتوب سنہ ۷ھ کا ہونا چاہیے اس کا ایک جواب بھی (حوالۂ مذکور ، عدد ۲۳) ملتا ہے ، جس میں حبشہ کے حکمران نجاشی کی طرف سے اسلام اس سے بھی ہوتی ہے کہ البخاری (۲۳ : ۵۴ ، ۶۱ [۱ : ۳۳۱ ، ۳۳۳ تا ۳۳۴]) نے روایت کی ہے کہ نجاشی کی وفات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی ۔ امام مسلم کے مطابق نئے نجاشی کو بھی آپؐ نے تبلیغی خط بھیجا ، مگر بظاہر وہ بے سود رہا (دیکھیے الوثائق السیاسیة، عدد ۲۵) ۔ نجاشی کے نام کا ۷ھ والا اصل خط اب دستیاب ہو گیا ہے (الوثائق السیاسیة ، ص ۴۵، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۵۶ء) .

ہرقل شہنشاہ روم کو ۷ھ میں ایک تبلیغی خط بھیجا گیا (الوثائق السیاسیة، عدد ۲۶)۔ ہرقل سے آپؐ کے سفیر کی ملاقات بیت المقدس میں ہوئی جہاں ہرقل ایران کی فتح پر نماز شکرانہ کے لیے گیا ہوا تھا ۔ سفیر کا اعزاز تو ہوا، لیکن یونانی عوام کے شدید دینی تعصب کو دیکھ کر ہرقل نے معذرتی جواب بھیجا (عدد ۲۸)۔ ادھر سے مایوس ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مختلف بوزنطی افسروں کو جو عربی النسل تھے براہ راست تبلیغی خطوط بھیجے ؛ ان میں سے ایک خط (حوالۂ مذکور ، عدد ۳۷) کے قاصد کو قبیلۂ غسان کے ایک افسر نے دمشق کے قریب قتل کر دیا ۔ یہ قانون بین الممالک کی کھلی خلاف ورزی تھی ۔ اس پر ہرقل کو مکرر خط لکھا گیا (حوالۂ مذکور ، عدد ۲۷) کہ وہ اسلام لائے ، یا جزیہ دے، یا کم از کم اپنی رعایا میں سے مسلمان یا ذمی بننے کے خواہشمندوں کو نہ روکے ۔ ہرقل نے اسے اپنے خلاف دھمکی سمجھ کر ، ایران سے جنگ کے لیے جمع کی ہوئی فوج میں سے ایک لاکھ آدمی سرحد پر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیج دیے۔ مؤتہ (اردن) [رک بآں] میں ان کی (تین ہزار) مسلمان فوج سے مڈھ بھیڑ ہوئی (۸ھ) ۔ معان کا گورنر فروہ بن عمرو الجُذامی بھی ، غالباً ایک تبلیغی خط پر مسلمان ہوگیا

اطلاع بھیجی (حوالۂ مذکور، عدد ۳۵) - ابن ہشام کے مطابق ہرقل نے اسے قتل اور سولی کی سزا دی - سفیر کے قتل کی تلافی سے انکار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک بڑی فوج لے کر تبوک گئے (۹ھ)۔ اس پر ہرقل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا کرنے سے گھبرایا - تبوک کی مہم کے دوران میں آپؐ نے بوزنطینی علاقوں میں سے دُومۃ الجندل، مَقنا، اَیلہ، جرباء اور اَذرُح پر قبضہ کر لیا اور ان سے معاہدات فرمائے (حوالۂ مذکور، عدد ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴) - آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک خط ضغاطر اسقف روم کے نام بھی ملتا ہے (الوثائق السیاسیۃ، عدد ۲۹) - اسی طرح ایلہ کے اسقف کے نام بھی آپ نے ایک مکتوب ارسال کیا (عدد ۳۰)، جس میں آپ نے ان کو اسلام لانے ورنہ جزیہ دے کر ذمی بننے کی دعوت دی، اور بصورت دیگر فوجی کارروائی کی اطلاع دی تھی - تبوک کی کامیاب مہم کے باوجود سفیر کے قتل کا مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں حضرت اسامہؓ بن زیدؓ، جن کے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ غزوہ مؤتہ میں شہید ہوگئے تھے، کی سرکردگی میں ان کی تادیب کے لیے ایک فوج تیار کی - اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اپنی خلافت کے دوران میں روانہ کیا، مگر سامنا پھر بھی نہ ہوا .

مصر پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا تھا، لیکن جب نینوٰی میں ہرقل نے ان کو شکست فاش دی، تو مصر، شام اور دیگر مفتوحہ علاقے دوبارہ بوزنطی مملکت میں آ گئے۔ فتح کے بعد قیصر روم کی فوج ابھی مصر آئی نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسکندریہ کے قبطی سربراہ اور صدر پادری مقوقس کو ایک تبلیغی خط بھیجا - جواب میں سفارتی اخلاق تو برتے گئے اور کچھ تحفے تحائف بھی بھیجے گئے، لیکن قبول اسلام کے سلسلے میں اس نے شائستہ طور پر معذرت کر دی (عدد ۵۰) - مکتوب نبوی بنام مقوقس کی اصل بھی دستیاب ہو چکی ہے (دیکھیے الوثائق السیاسیہ، عدد ۷۲) .

ایران نے کئی صدیوں سے مشرق عرب پر اور تقریباً نصف صدی سے جنوبی عرب (یمن) پر قبضہ کر رکھا تھا - پایۂ تخت ایران کے اخلاق انحطاط کے باعث اس کے زیر نگین علاقوں میں استبداد اور بے اصولی پیدا ہو گئی تھی - اس سیاسی اور نفسیاتی کشمکش کے ماحول میں سنہ ۷ھ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے "کسریٰ شاہ فارس" کو ایک تبلیغی خط لکھا (حوالۂ مذکور، عدد ۵۳) اور مشرق عرب کے ایرانی افسروں کے توسط سے مدائن بھجوایا - مضمون سن کر بادشاہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے پورا خط سنے بغیر ہی چاک کر دیا اور [تمام سفارتی آداب واخلاق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے] سفیر کو ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکال دیا گیا - اس کے بعد حسب عادت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایران کے ماتحت افسروں اور حکمرانوں کو براہ راست خطوط لکھے۔ ایک خط سماوہ کے حکمران کے نام بھی ہے، جو جنوبی عراق میں ہے (حوالۂ مذکور، عدد ۵۵)؛ وہ غالباً عربی النسل تھا، مگر اس کا جواب معلوم نہیں - بحرین اور عمان کے گورنر اور حکمران بھی آپ کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئے۔ عمان میں مدینہ منورہ سے حضرت عمروؓ بن العاص کو بھیجا گیا کہ اسلامی تعلیم و تربیت اور زکوٰۃ وغیرہ کے وہ ذمہ دار رہیں - جبکہ غیر مسلموں کا جزیہ اور دیگر انتظام مقامی حکمرانوں : جَیفَر بن الجُلَندی اور عبد [یا: عِیاذ] بن الجلندی، سے متعلق رہے - عمان میں دبا کی بندرگاہ بڑی اہم تھی اور وہاں کے سالانہ میلے میں ہندوستان اور چین وغیرہ کے تاجر بھی آتے تھے۔ وہاں کے لیے [حضرت حذیفہؓ کو بطور] خصوصی والی مدینہ منورہ سے بھیجا گیا [(انساب الاشراف، ۱: ۵۳۹)]۔ ایران سے نفرت بحرین اور عمان سے کہیں زیادہ یمن

میں تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باذان (یا: باذام) بن ساسان نامی یمن پر ایرانی گورنر نے خلوص کے ساتھ اسلام قبول کرلیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسے اس عہدے پر بحال رکھا اور کچھ عرصہ بعد سنہ ۱۰ھ میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے بیٹے شہر بن باذان کو وہی منصب عطا فرمایا اور عامر بن شہر (مؤخرالذکر کے بیٹے) کو علاقے کی گورنری مرحمت فرما دی۔ ایرانی مقبوضات میں اسلام کے روز افزوں پھیلنے سے گھبرا کر چند سال بعد ملکہ پوران دخت نے بروایت ترمذی و طبری ایک سفیر مدینہ منورہ بھیجا اور تحفے تحائف بھیج کر سابقہ غلطی کی تلافی کی کوشش کی، مگر وہ خود زیادہ دن تخت پر نہ رہ سکی۔

حِجَّۃ الوَداع: فتح مکہ کے سوا سال بعد ذوالحجہ ۹ھ میں حج کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے مِنٰی وغیرہ میں اعلان کیا گیا کہ غیر مسلم قبائل کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ نئے انتظامات کر لیں اور یہ کہ آئندہ سے بیت اللہ شریف صرف اہل اسلام کے لیے مختص ہوگا؛ غیر مسلم اس کے حج کے لیے نہ آئیں۔ یہ اعلان سیاسی و دینی اہمیت رکھتا تھا، لیکن اس سے قطعاً کوئی دشواری پیش نہ آئی؛ کیونکہ رفتہ رفتہ جملہ اہل عرب حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ ۹ھ کے اس اعلان کے بعد سے حاجیوں کی تعداد روز افزوں رہی اور سنہ ۱۰ھ میں جب آپ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لائے تو ایک لاکھ چالیس ہزار کا غیر معمولی اور عظیم الشان اجتماع تھا۔ یہ حج آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالتی زندگی کا اکمال اور اسلام کی تعلیمات کا اتمام تھا۔ فریضۂ نبوت کے حسن تکمیل پر خداوند تعالی نے فرمایا: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً (۵ [المائدۃ]: ۳)، یعنی آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے بطور دین کے اسلام پسند کر لیا۔ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کو کس چیز سے خوشی ہو سکتی تھی۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہجرت کے بعد پہلا اور آخری حج تھا۔ آپؐ کے حج کو جانے کی خبر پھیلی تو تمام مسلم علاقوں سے مسلمان حج کو آئے۔ اس حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حج کے مناسک ادا فرما کر امت کے سامنے عمدہ مثال پیش کی۔ اس کے علاوہ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیا اور وقوف عرفات کے موقع پر جبل الرحمۃ پر چڑھ کر اپنا شہرۂ آفاق خطبہ حجۃ الوداع دیا۔ آپؐ کے چاروں طرف ایسے افراد مقرر کیے گئے جو آپؐ کے ہر ہر جملے کو مکبّروں کی طرح باآواز بلند دہراتے تھے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ لاکھ حاضرین اس کو بخوبی سن رہے تھے۔ اس میں حمد و صلوٰۃ کے بعد آپ نے فرمایا: لوگو میری باتوں کو غور سے سنو۔ ممکن ہے کہ اس سال کے بعد میں تم سے اس مقام پر نہ مل سکوں؛ اے لوگو! حقیقت میں تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں تمہارے لیے تمہارے رب سے ملنے تک (ہمیشہ کے لیے) محترم ہیں، اتنے ہی محترم جتنا کہ آج کا دن اور یہ مہینا اور یہ مقام ہے۔ ہاں! کیا میں نے خدائی پیغام پہنچا دیا؟ اے اللہ! گواہ رہنا؛ کسی کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو وہ صاحب امانت کو واپس کر دے؛ بے شک زمانۂ جاہلیت کا سود (ربٰو) ختم کر دیا گیا ہے؛ البتہ تمہیں قرض کے اصل سرمائے کی بازیابی کا حق ہے؛ نہ ظلم کرو، نہ ظلم سہو؛ اللہ نے حکم دیا ہے کہ سود نہ رہنے پائے؛ سب سے پہلا سود جس (کی منسوخی) سے میں آغاز کرتا ہوں، وہ میرے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا سابقہ واجب الادا سود ہے؛ بے شک زمانۂ جاہلیت کے خون ختم کر دیے گئے ہیں

اور سب سے پہلا خون جس (کی منسوخی) سے میں آغاز کرتا ہوں وہ (میرے چچا زاد بھتیجے) ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے بیٹے کا خون ہے ۔ [ربیعہ بن الحارث کے بیٹے آدم کو شرفاے مکہ کے دستور کے مطابق دودھ پلانے کے لیے قبیلہ ھذیل کے سپرد کیا گیا تھا ۔ لنھا منھا آدم بن ربیعہ ایک دن گھر کے سامنے بیٹھا تھا کہ بنو لیث کے ایک آدمی نے پتھر مارا جس سے بچہ وھیں جاں بحق ھوگیا ۔ یہی پہلا خون تھا ۔ جس کا قصاص یا بدلہ نبی کریم علیہ و آلہ وسلم نے اس مبارک تقریب میں معاف فرما دیا (ابن حزم : جمھرۃ انساب العرب ، ص ۷۰ ؛ الروض الانف ، ۲ : ۳۵۱ تا ۳۵۲ ؛ انساب الاشراف ، ۱ : ۳۶۴)] ؛ بے شک زمانۂ جاھلیت کے جملہ امتیازات ختم کر دیے گئے ھیں ، بجز کعبے کی رکھوالی اور حاجیوں کو پانی پلانے کے کام کے ؛ قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا ؛ قتل خطأ وہ ھے کہ جب کسی کو لاٹھی یا پتھر مارنے سے قتل کیا جائے اور اس میں سو اونٹ (بطور خونبہا) ھیں ۔ جو اس سے زیادہ (مانگے) تو وہ زمانۂ جاھلیت والوں میں سے ھوگا ؛ اے لوگو ! شیطان اس سے تو مایوس ھو چکا ھے کہ تمھاری اس سر زمین میں اس کی عبادت کی جائے ، لیکن وہ اس پر راضی ھے کہ اس (بت پرستی) کے سوا دوسرے ایسے کاموں میں اس کی بات مانی جائے جن کو تم حقارت سے دیکھتے ھو ۔ اپنے دین کے متعلق شیطان کی چالوں سے بچتے رھو ؛ اے لوگو ! نسیٔ (قمری سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لیے اس میں وقتاً فوقتاً مہینوں کا اضافہ کرنا) کفر میں زیادتی ھے ۔ اس سے جو لوگ کافر ھیں وہ گمراہ ھوتے ھیں ، ایک سال تو وہ (ایک مہینے کو) حلال قرار دیتے ھیں اور دوسرے سال اسے حرام مہینہ ، تا کہ (مہینوں کی) اس تعداد کو (ظاھری طور پر) برابر رکھیں جو اللہ نے حرام قرار دیا ھے ، اس طرح اس مہینے کو حلال کر دیں جو اللہ نے حرام کیا ھے اور حرام کر دیں اس کو جو اللہ نے حلال کیا ھے ۔ حقیقت میں (کبیسہ والی اور غیر کبیسہ والی تقویموں میں) زمانہ گھوم کر اب دوبارہ اسی شکل پر آ گیا ھے جیسا اس دن تھا جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا ۔ حقیقت میں اللہ کے نزدیک ، اس کی تقدیر میں سال کے ، اس دن سے بارہ مہینے ھی تھے جب کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا ۔ ان میں چار حرمت کے مہینے ھیں ، تین پے در پے اور ایک منفرد : ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور قبائل مضر کا رجب ، جو جمادی الآخرۃ اور شعبان کے بیچ میں آتا ھے ۔ ھاں ! کیا میں نے (خدائی پیغام) پہنچا دیا ؟ اے اللہ ! گواہ رھنا ؛ اے لوگو ! بے شک تمھاری بیویوں کا تم پر حق ھے اور تمھارا ان پر حق ھے ۔ تمھارا حق ان پر تو یہ ھے کہ وہ تمھارے بستر تمھارے سوا کسی اور کو (بدکاری کے لیے) روندنے نہ دیں ، اور تمھارے گھروں میں کسی ایسے شخص کو داخل نہ ھونے دیں، جس کو تم پسند نہ کرتے ھو ، بجز تمھاری اجازت کے اور یہ کہ بیویاں کوئی فحش کام نہ کریں ، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو بے شک اللہ نے تمھیں پورا حق دیا ھے کہ ان کو (اس سے) منع کرو اور ان کو بستروں میں سزا کے طور پر تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو، لیکن ایسی مار جو سخت نہ ھو ۔ اگر وہ (فحش کاری سے) رک جائیں اور تمھاری بات مانیں تو تم پر واجب ھے کہ ان کو رسم و رواج کے مطابق مناسب غذا اور لباس مہیا کرو ۔ اور بیویوں سے اچھے برتاؤ کے متعلق تاکید کو سنو ؛ کیونکہ حقیقت میں وہ تمھارے ماتحت سی ھوتی ھیں ۔ ھاں ! کیا میں نے پہنچا دیا ؟ اے اللہ ! گواہ رھنا ؛ اے لوگو ! تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ھیں اور کسی مومن کے لیے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں بجز اس کی رضامندی کے ۔ ھاں ، کیا میں نے پہنچا دیا ؟ اے اللہ ! گواہ رھنا ؛ میرے بعد کافر بن

کر ایک دوسرے کی گردنیں ہرگز نہ مارنا ؛ میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم ان کو تھامے رہوگے تو کبھی بھٹکنے نہ پاؤگے : اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت ۔ ہاں ، کیا میں نے پہنچا دیا ؟ اے اللہ گواہ رہنا ۔ اے لوگو ! بے شک تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم آدم سے (نکلے ہو اور آدم مٹی سے بنے) ۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو ۔ اور کسی عربی کو کسی عجمی [کسی عجمی کو عربی پر ، کسی سرخ کو کالے پر اور کسی کالے کو سرخ پر (مسند احمد بن حنبل] بجز تقوی کے کوئی فضیلت نہیں ۔ ہاں ، کیا میں نے خدائی پیغام پہنچا دیا ؟ لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا : ہاں ، بے شک ۔ تو آپ نے فرمایا : اے اللہ ! گواہ رہنا ۔ آپ نے کلام جاری رکھتے ہوے مزید فرمایا : تو پھر حاضر شخص (یہ باتیں) غیر حاضر تک پہنچا دے ۔

اے لوگو ! بے شک اللہ تعالی نے ہر وارث کے لیے (مرنے والے کی) میراث میں اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور کسی وارث کے لیے کوئی (مزید) وصیت جائز نہیں اور وصیت (ترکے کے) ایک تہائی سے زیادہ کے لیے درست نہیں اور بچہ بستر کے مالک (عورت کے شوہر) کا سمجھا جائے گا ، اور زنا کار کو پتھراؤ کیا جائے گا اور جو اپنے باپ کے سوا کسی اور سے نسب کا ، یا اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور کے مولی ہونے کا دعویٰ کرے تو اس پر اللہ ، فرشتوں اور سارے لوگوں کی لعنت ہو ؛ ایسے شخص سے (قیامت کے دن) نہ کوئی معاوضہ قبول ہوگا اور نہ (فعل کے) کوئی مماثل چیز؛ والسلام علیکم ۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے : الوثائق السیاسیة ، عدد ۲۸۷/الف ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۷۲ تا ۱۷۹؛ ابن ہشام : سیرة ، ۴ : ۲۴۸ تا ۳۵۳؛ الواقدی : المغازی ، ۳ : ۱۰۸۸ تا ۱۱۰۳ ؛ وغیرہ] .

الطبرانی کی روایت میں یہ جملہ بھی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں ۔ اس لیے اپنے رب کی عبادت کرو ؛ پانچ وقت کی نمازیں پڑھو ؛ رمضان کے روزے رکھو ؛ اپنے انتظامی افسروں کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہوگے .

یہ خطبہ بلاغت نبوی کے اعلی نمونہ کے حامل ہونے کے علاوہ اسلامی قانون و اخلاق کا بھی جامع ہے ۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت خطیب] .

خطبۂ خم غدیر : حضرت علیؓ کو تبلیغ اور وصولی زکوٰۃ وغیرہ کے لیے یمن بھیجا گیا تھا ۔ واپسی میں وہ حج کے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مکے میں ملے ۔ ان کے ہمراہیوں نے ، حق کے معاملے میں ان کی سختی کی ، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے شکایت کی تو آپؐ نے حج سے واپسی پر مقام خم غدیر [رک بآں] (رابغ) میں پڑاؤ ڈالا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوے حضرت علیؓ کے طرز عمل کی تائید کی اور ان سے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا اور آپ مدینہ منورہ تشریف لائے .

مرض الوفات : سفر حج سے واپسی پر دو مہینے گزرے تھے کہ ۱۸ یا ۱۹ صفر ۱۱ھ میں ایک روز آدھی رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یکایک بستر سے اٹھے اور ایک خادم ابو رافع یا ابو مُوَیْہِبَہ کو ساتھ لے کر جنة البقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے اور اپنے پرانے رفقا کے لیے دیر تک دعا و استغفار کرتے رہے؛ پھر خادم سے کہا: خدا نے مجھے اپنے ہاں آ جانے اور دنیا میں تاقیامت رہنے کا اختیار دیا تو میں نے اس کے ہاں جانے کو ترجیح دی ہے ۔ واپس لوٹے تو سر درد سے مرض کی ابتدا ہو چکی تھی (ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۲۰۳ تا ۲۰۵) ۔ طبیعت مضمحل ہوتی گئی اور ضعف روز بروز

بڑھتا گیا، [مگر اس کے باوجود آپؐ نے ازواج مطہرات کے گھروں میں باری کے مطابق جانے کا سلسلہ جاری رکھا] اور جب چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تو ازواج مطہرات سے کہا: ہر رات ایک بیوی کے ہاں جانے کی جگہ تیمار داری ایک ہی جگہ ہو تو اچھا ہے۔ سب نے قبول کیا۔ [یہ بھی آپؐ نے صراحۃً نہیں کہا، بلکہ کنایۃً ظاہر کیا؛ وہ یوں کہ یک شنبہ کی شام کو جب ازواج مطہرات جمع تھیں، آپؐ نے پوچھا کل کس کے گھر پر رہوں گا؛ اگلا دن حضرت عائشہؓ کی باری کا تھا۔ ازواج مطہراتؓ نے مرضی اقدس پا کر عرض کیا: جہاں آپؐ کا دل چاہے قیام فرمائیں]؛ چنانچہ آپؐ حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حجرے میں تشریف لائے، جس کا دروازہ مسجد کی صف اول سے عین مقابل کھلتا تھا۔ اس حالت میں بھی جب تک طاقت رہی نمازوں کی بدستور امامت فرماتے رہے۔ آخری نماز، جو آپؐ نے پڑھائی، مغرب کی تھی۔ سر میں درد ہونے کی وجہ سے آپؐ نے سر مبارک پر رومال باندھا ہوا تھا (مسلم: الصحیح، ۲: ۴۱؛ البخاری، کتاب الاذان، باب ۶۸).

وفات سے غالباً پانچ یوم قبل جمعرات کو ایک روز آپؐ نے غسل کی خواہش کا اظہار فرمایا؛ چنانچہ آپؐ کو ایک ٹب میں بٹھا کر سات چھاگلوں سے آپؐ پر پانی ڈالا گیا۔ اس سے کچھ فوری افاقہ ہوا تو سر پر پٹی باندھے ظہر کے وقت مسجد میں تشریف لائے۔ بعد از نماز منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک کا آخری خطبہ ہے۔ اس میں آپؐ سب سے پہلے غزوۂ احد کے شہیدوں کو یاد کر کے دیر تک دعائے مغفرت فرماتے رہے۔ پھر فرمایا: اللہ نے اپنے ایک بندے کو دنیا میں رہنے یا اس کے پاس آ جانے میں انتخاب کا اختیار دیا تو اس بندے نے خدا کے پاس جانے کو ترجیح دی۔ صحابہؓ آپؐ کے اس اشارے کو نہ سمجھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ سمجھ گئے اور بلا اختیار رو پڑے اور کہا: ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ان کی تعریف کی [اور فرمایا: میں ابوبکرؓ کی رفاقت اور فیاضی کا سب سے زیادہ ممنون ہوں اور یہ کہ] ان سے بہتر رفیق مجھے کوئی نہیں ملا۔ پھر فرمایا: مسجد میں کھلنے والے تمام مکانوں کے دروازے بند کر دیے جائیں، سوائے ابوبکرؓ کے خوخہ (یعنی چھوٹے دروازے) کے۔ [اس میں بھی حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کی طرف اشارہ ہے تاکہ نماز پڑھانے کے لیے آنے جانے میں سہولت رہے؛ نیز فرمایا: تم سے پہلے لوگوں نے انبیا اور صلحا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تھا؛ تم ہرگز قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، میں تمھیں سختی سے منع کرتا ہوں (مسلم، ۲۷: ۶۸)]۔ پھر ارشاد فرمایا: لا علمی میں مجھ پر کسی کے کوئی واجب الادا حقوق نہ رہ جائیں؛ اگر کسی کا میں نے مال لیا ہو تو یاد دلائے؛ کسی کو میں نے بیجا طور پر جسمانی ایذا پہنچائی ہو تو وہ ابھی مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے؛ خدا کے ہاں مؤاخذے کے لیے دل میں چھپا کر نہ رکھے۔ رحمت دو عالمؐ پر بھلا کسے دعوی ہو سکتا تھا؟ چنانچہ کسی نے اس پر کچھ نہ کہا تو فرمایا: یہ کافی نہ ہوگا اور مکرر اس جملے کو دہرایا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ اسے آپؐ سے تین درہم وصول کرنے ہیں۔ ان کی فوری ادائی کا حکم دیا گیا [ابن کثیر: السیرۃ النبویہ، ۴: ۴۵۳ تا ۴۵۸]۔ پھر عام خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنی چھوٹی سے چھوٹی ذمہ داری کو بھی حقیر نہ سمجھے، اس لیے آخرت کے مؤاخذے کی جگہ دنیا ہی میں گلو خلاصی کرا لے، چاہے فضیحت ہی کیوں نہ ہو۔ اس خطبے میں انصار [رک باں] کا آپؐ نے خاص طور پر ذکر کیا اور فرمایا: میرے بعد انصار کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے؛ نیز ارشاد ہوا: مدینہ

منورہ میں دوسرے گروہوں کے لوگ بڑھتے جائیں گے، لیکن انصار کم ہوتے جائیں گے ۔ یہ میرے پناہ دہندہ ہیں ؛ میں نے انہیں کے ہاں جگہ پائی ۔ [یہ اپنا فرض انجام دے چکے ہیں ۔ اب تمہیں ان کا فرض پورا کرنا ہے، تم میں سے جو بھی نفع و نقصان کا متولی (خلیفہ) ہو، اسے چاہیے کہ] ان میں جو اچھے کام کرنے والے ہیں ان کے ساتھ احسان کرے اور ان میں سے اگر کوئی برائی کرے تو اس سے درگزر کرے ۔ پھر تاکید فرمائی کہ بوزنطی حکومت کے خلاف تیار شدہ لشکرِ حضرت اسامہؓ ضرور بھیجا جائے ۔ حضرت اسامہؓ کی کم عمری اور نا تجربہ کاری کی بنا پر اعتراض کرنے والوں کا بھی آپؐ نے اس موقع پر جواب دیا ۔ اس فوج میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے اکابر بھی رضاکارانہ طور پر اپنے نام لکھوا چکے تھے ۔ [اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپؐ کا آخری خطبہ در حقیقت آپؐ کی طرف سے اپنے نامزد جانشین (حضرت ابوبکرؓ) کی جانشینی اور ان کے لیے وصیت نامہ تھا] ۔ آپؐ اس سے اس قدر تھک گئے تھے کہ مکان میں آئے تو بیہوش ہو گئے اور دانت بھنچ گئے ۔ اس پر آپؐ کی تمام ازواج مطہرات اور بعض دیگر مسلمان خواتین بھی آپؐ کے حجرے میں جمع ہو گئیں (ابن حنبل: مسند، ۱:۲۰۹، حدیث ۱۷۸۴)۔ ہوش میں لانے کے لیے دانتوں کی درزوں میں سے دوا ڈالی گئی ہے ۔ منہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہوئی ۔ یہ علاج کامیاب تو ہوا ، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند نہ آیا اور محبت آمیز ملامت کرتے ہوئے فرمایا : سب حاضرین کے منہ میں بھی وہی دوا ڈالی جائے، بجز (احتراماً) چچا حضرت عباسؓ کے۔ یہ واقعہ جمعرات کے دن پیش آیا ؛ [اسی دن جب عشا کی نماز کا وقت ہوا تو آپؐ نے تین مرتبہ غسل فرما کر نماز کے لیے اٹھنا چاہا تو ہر بار آپؐ پر غشی طاری ہو جاتی رہی ۔ چوتھی مرتبہ ہوش آیا تو فرمایا : مُرُوا اَبَابَکرٍ فَلْیُصَلِّ بِالنَّاسِ (البخاری، ۱ : ۱۷۵)، یعنی ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں ۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی : یا رسول اللہ ابوبکرؓ بہت نرم دل ہیں۔ وہ آپؐ کے مقام پر کھڑے نہ ہو سکیں گے ۔ آپؐ نے دوبارہ اس سابقہ حکم کا اعادہ فرمایا ۔ حضرت عائشہؓ نے مکرر عرض دہرائی تو آپؐ نے سختی سے فرمایا کہ ابوبکرؓ ہی سے کہو نماز پڑھائیں ؛ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کے حیات طیبہ میں آپؐ کے حکم سے کل سترہ نمازوں کی امامت فرمائی (از عشاء جمعرات تا فجر پیر)، (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۲۲۳ ببعد)۔ ابن سعد (حوالۂ مذکور) کے مطابق یہ بات پختہ طور پر ثابت ہے کہ آپؐ نے ایک دن فجر کی ایک رکعت حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں ادا فرمائی تھی] ۔ اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مزاج کسی قدر بہتر ہوا تو آپؐ مسجد میں تشریف لائے جبکہ ابوبکرؓ نماز شروع کرا چکے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اشارے کے باوجود کہ امامت جاری رکھو ، وہ آپؐ کو دیکھ کر محراب سے ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بیٹھے ہوئے امامت فرمائی اور حضرت ابوبکرؓ مکبر کا فریضہ انجام دیتے رہے [السیرۃ النبویۃ ، ۴ : ۴۶۲ تا ۴۶۶] ۔ [اس موقع پر ابن سعد (الطبقات، ۲ : ۲۱۵) کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نماز کے بعد بھی کچھ دیر تک تشریف فرما رہے ، پھر آپؐ نے کسی قدر اونچی آواز سے فرمایا : بخدا میں نے اسی کو حلال ٹھیرایا جسے خدا نے حلال کیا اور اسی کو حرام کیا جسے اللہ نے حرام کیا ۔ پھر فرمایا : اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ اور اے رسول اللہ کی پھپی صفیہ ! عمل صالح جاری رکھو، کیونکہ میں خدا کی طرف سے کسی چیز میں تمہیں کفایت نہیں کر سکتا] .

اس کے بعد پیر کی صبح تک آپؐ برآمد نہ

ہوے ۔ پیر کی فجر کے وقت حجرے کا پردہ اٹھا کر دیکھا کہ لوگ خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہے ہیں تو آپؐ نے خوشنودی سے تبسم [کیا اور فرمایا : خدا نے میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی ہے (ابن سعد ، ۲ : ۲۲۰] ۔ آپؐ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر لوگ وفور مسرت سے بے قرار ہوگئے ، مگر آپؐ نے [اشارہ کیا کہ نماز مکمل کر لو۔ پھر آپؐ نے] پردہ گرا دیا اور بستر پر لیٹ گئے۔ اس وقت تک حضرت ابوبکرؓ سترہ نمازیں پڑھا چکے تھے (الطبری ، ۱ : ۱۸۱۲) ۔ نماز کے بعد حضرت ابوبکرؓ اندر آئے اور آپؐ کی صحت بہتر دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ کئی روز سے رات دن یہیں ہوں ؛ اجازت ہو تو بیوی بچوں کو دیکھنے کے لیے کچھ دیر کے لیے گھر ہو آؤں (جو عوالی میں جبل احد کے قریب مقام سُنح میں تھا اور کئی میل کے فاصلے پر)، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ محض افاقۃ الموت تھا ۔

اس سے ایک دن قبل، اتوار کو حضرت اسامہؓ (لشکر کے سپہ سالار) اور ان کے ساتھ پڑاؤ سے کچھ مسلمان آپؐ کو دیکھنے کے لیے آئے ۔ حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ بات نہ کر سکتے تھے۔ مجھے دیکھ کر دست مبارک اٹھائے ؛ پھر مجھ پر رکھ دیے، گویا میرے لیے دعا فرما رہے ہیں (المقریزی ، ۱ : ۵۳۸ ؛ [ابن ہشام : سیرۃ، ۴ : ۳۰۱]) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم اور اس کے سپہ سالار کو آپؐ کتنی اہمیت دے رہے تھے ۔

دن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ آپؐ پر غشی کے دورے شدت اختیار کرتے جا رہے تھے، مگر پھر افاقہ ہو جاتا ۔ حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کی یہ حالت دیکھی نہ گئی تو فرمانے لگیں : واکرب اباہ (ہائے میرے باپ کی بیچینی) ! آپؐ نے فرمایا : آج کے بعد تمھارا باپ کبھی بے چین نہ ہوگا ۔ وفات سے کچھ دیر پہلے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بھائی حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ آپؐ کی عیادت کو آئے۔ ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک دیکھ کر آپؐ نے اس پر ایسی نظر ڈالی کہ رمز شناس زوجۂ مطہرہ جان گئیں کہ آپؐ مسواک کرنا چاہتے ہیں ؛ چنانچہ انھوں نے اس سے مسواک لیکر دانتوں میں چبائی؛ پھر آپؐ کا سر مبارک اپنے زانو پر رکھ کر آپؐ کے دانت اپنے ہاتھوں سے صاف کیے جس سے چہرۂ اطہر خوشی سے تمتمانے لگا ۔ مسواک ہاتھ سے رکھی ہی تھی کہ حضرت عائشہؓ کو [آپؐ کے سینے میں سانس کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی ۔ کان لگایا تو یہ الفاظ سنے : نماز اور غلام (ابن سعد ، ۲ : ۲۵۳) ۔ کچھ دیر بعد حضرت عائشہؓ کو آپؐ کے] سر مبارک کا بوجھ سا محسوس ہوا ، فرماتی ہیں جب میں نے چہرے پر نظر ڈالی تو یہ جملہ سنا : الرفیق الاعلی (رفیق اعلی کے پاس) ؛ تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا اور پھر روح سچ مچ اپنے رفیق اعلی ذات کبریا کے پاس جا پہنچی، مگر میں نہ سمجھ سکی؛ پھر جب دوسری ازواج رونے لگیں تو پھر مجھے معلوم ہوا کہ کیا پیش آ گیا ہے ؛ چنانچہ میں نے آہستہ سے آپؐ کے سر مبارک کو تکیے پر رکھ دیا اور کھڑے ہو کر میں بھی رونے لگی [ابن ہشام، ۴ : ۳۰۵] (اللھم صل علیہ و علی آلہٖ و صحبہٖ و بارک وسلم) ۔

وفات اقدس : [جمہور کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہجرت کے دس سال پورے ہونے کے بعد پیر کے دن ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو اس دنیا سے رحلت فرمائی (ابن سعد ، ۲ : ۲۷۲ ، ۲۷۳ ؛ انساب الاشراف، ۱ : ۵۶۸ ؛ ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲۶۵ ؛ ابن کثیر : السیرۃ النبویۃ ، ۴ : ۵۰۷ ؛ ابن الجوزی : الوفا ، ۷۸۹ ؛ اس ضمن میں بعض اور روایات بھی ہیں؛ ان کے لیے دیکھیے محولہ بالا کتب سیرت، الروض الانف، ۲ : ۲۷۲ ؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے آپؐ کا یوم وفات ۲ ربیع الاول ، ۲۵ مئی ۶۳۲ء قرار دیا ہے (دیکھیے: محمد حمید اللہ : مقالہ نسر ، در

اسلامک ریویو ، ووکنگ ، فروری ۱۹۶۹ء)] .

[وصال مبارک ہوتے ہی جسم مبارک سے ایسی خوشبو سے مہکنے لگا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس جیسی خوشبو آج تک کبھی نہ سونگھی تھی، یہ خوشبو میرے ہاتھوں میں کئی دنوں تک برقرار رہی (عبدالحق محدث دہلوی: مدارج النبوۃ، اردو ترجمہ، کراچی ۱۳۸۷ھ، ص ۶۴۲)] - حجرۂ اطہر کے بعد مسجد میں ، پھر جلد ہی سارے شہر میں اس خبر وحشت اثر سے صف ماتم بچھ گئی - اتنے میں حضرت ابوبکرؓ واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے، جہاں آپؐ کو چادر مبارک سے ڈھانپ دیا گیا تھا - حضرت ابوبکرؓ نے چادر اٹھا کر دیکھا اور احترام و ادب سے بوسہ دیا؛ پھر مسجد میں تشریف لائے - [تمام صحابہ کرامؓ اس سانحۂ ہائلہ پر سخت حیران اور ششدر کھڑے تھے - ان میں سے بعض کی فرط غم سے یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہوش و حواس ہی معطل ہو گئے ہیں؛ بعض یوں خاموش تھے گویا قوت گویائی باقی نہیں رہی، جبکہ بعض اس طرح آہ و زاری کر رہے تھے گویا حج کا تلبیہ پڑھ رہے ہوں ؛ ایک صحابی نے فرط غم سے یہ دعا مانگی کہ : الٰہی میری قوت بصارت ختم کر دے تا کہ میں جمال نبوی کے دیکھنے کے بعد کچھ اور نہ دیکھ سکوں - غرض تمام صحابہ پریشان تھے - اس موقع پر حضرت عمرؓ فرما رہے تھے کہ آپؐ کا وصال نہیں ہوا بلکہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو تشریف لے گئے ہیں - حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر یہ مختصر مگر اثر انگیز] خطبہ ارشاد فرمایا : "لوگو ! اگر کوئی حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو معبود سمجھتا تھا تو جان لے کہ حضرت محمدؐ کا وصال ہو گیا ہے ، لیکن جو اللہ کو معبود سمجھتا تھا تو جان لے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے ، کبھی مر نہیں سکتا - ارشاد ربانی ہے : اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (۳۹ [الزمر]: ۳۰)، یعنی آپؐ نے بھی وصال فرمانا ہے دوسرے بھی مرنے والے ہیں - یہ بھی ارشاد الٰہی ہے : وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ (۳ [آل عمران]: ۱۴۴)، [یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اللہ کے رسول ہی ہیں - آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں - اگر آپؐ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے ؟ جو کوئی ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا - عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزار بندوں کو بدلہ عطا فرمائیں گے] - ان آیات کو سن کر بعض صحابہؓ فرماتے ہیں کہ یوں معلوم ہوا گویا یہ آیات اسی وقت نازل ہوئی ہیں، حالانکہ یہ تقریباً سات برس قبل غزوۂ احد کے موقع پر نازل ہوئی تھیں - حضرت ابوبکرؓ نے مزید فرمایا] : آپؐ نے امت میں تنظیم پیدا کی ؛ اب اسے شخصی چیز سمجھ کر ختم کر دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس تنظیم کو جاری رکھنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جگہ کسی کو مقرر کرنا ضروری نظر آتا ہے - کفن دفن کے بعد آپؐ کی جانشینی کے لیے عام مشورہ ہوگا - اس سے سب نے اتفاق کیا ، مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ دفن سے پہلے ہی جانشینی کا فیصلہ ہو جائے (دیکھیے نیچے) - تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ کو شروع ہوا - آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو لباس اتارے بغیر اچھی طرح سے غسل دیا گیا - [آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ ، ان کے دو بیٹوں فضل اور قثم اور حضرت علیؓ نے آپؐ کو غسل دیا - حضرت اسامہؓ اور حضرت شُقران (آپؐ کے مولی) پانی ڈالتے رہے - حضرت اوسؓ بن خولہ انصاری بدری کو بھی بطور نمائندۂ انصار شامل غسل کر لیا گیا - سحول (یمن کا ایک گاؤں جہاں سفید سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا) کے بنے

ہوے] تین سفید سوتی کپڑوں میں آپؐ کو پورے ستر عورت کے ساتھ کفن دیا گیا ۔ اس ارشاد نبوی کے باعث کہ نبی اسی جگہ دفن ہوتے ہیں جہاں ان کا وصال ہوا ہو ، حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ، بستر نبوی ہی کی جگہ، قبر کھودی گئی]۔ حضرت ابو طلحہؓ انصاری نے لحد والی قبر تیار کی ۔ جب آپؐ کو کفنا کر چارپائی پر لٹا دیا گیا تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ داخل ہوے اور ان کے ساتھ انصار و مہاجرین بھی اندر آ گئے ۔ صف باندھ کر بغیر کسی امام کے فرداً فرداً نماز پڑھی ۔ جب سارے مرد نماز پڑھ چکے تو پھر عورتوں کی باری آئی ، پھر بچوں کی] ۔ ہزاروں آدمیوں نے فرداً فرداً نماز جنازہ پڑھی ۔ مدینہ منورہ کی زمین میں شور زیادہ ہونے کی وجہ سے قبر میں ایک سرخ قطیفہ (چادر) بچھا کر آپؐ کا جسم اطہر اس پر رکھا گیا ۔ [حضرت علیؓ ، حضرت فضلؓ ، حضرت قثمؓ ، حضرت شقرانؓ اور حضرت اوسؓ بن خولی انصاری نے جسم اطہر کو قبر میں اتارا] اور مکی رواج کے مطابق قبر کو مسقّف کیا گیا اور یہ کام حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے انجام دیا (انساب الاشراف ، ۱ : ۵۷۵ تا ۵۷۸) ۔ بہت سے صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے دردناک اور پر اثر مرثیے کہے، جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ ، حضرت علیؓ اور حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ اور حضرت حسان بن ثابتؓ ، [حضرت فاطمہؓ ، عاتکہؓ بنت عبدالمطلب ، عبداللہؓ بن مسلم ، ابوسفیانؓ الحارث ، ہندؓ بنت الحارث ، ام ایمنؓ، کعبؓ بن مالک] وغیرہ کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں (البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۵۹۲ تا ۵۹۴؛ [عبداللہ بن حامد : شعرالدعوۃ الاسلامیہ، ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء ، ص ۳۸۹ تا ۴۲۹]).

جانشینی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پر اہل بیت ، انصار اور عام مسلمان تینوں الگ الگ رجحانوں کے حامل نظر آتے ہیں ۔ پرانی قبائلی عادت کی بنا پر غیر شعوری طور پر بعض اہل بیت نبوی کی خواہش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رشتہ داروں میں سے کسی کو خلیفہ بنایا جائے ۔ انصار کے علاقے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکومت کی تاسیس کی اور وہیں مدینہ منورہ دارالحکومت بنا اور وہاں اکثریت انصار ہی کی تھی ؛ اس لیے وہ خلیفہ انصار میں دیکھنا چاہتے تھے ۔ عام مسلمانانِ مدینۂ منورہ شورائیت کی طرف مائل تھے اور چاہتے تھے کہ سارے مسلمانوں میں جو سب سے زیادہ موزوں ہو اسی کو چنا جائے۔ [اس بحث کے لیے دیکھیے شبلی : الفاروق، مطبوعہ اعظم گڑھ ؛ نیز رک بہ خلافت؛ حضرت ابوبکرؓ صدیق] .

[انھی حالات میں انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک ہنگامی جلسہ منعقد کیا اور اس بات کا فیصلہ کرنا چاہا کہ خلافت انصار کا حق ہے، لہٰذا انھیں کو ملنی چاہیے۔ اس کے لیے حضرت سعدؓ بن عُبادہ رئیس خزرج کا نام پیش کیا جا رہا تھا ۔ ان نازک حالات کی خبر جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ملی ، جو مسجد نبوی میں افسردہ و غمگین صحابہ کرامؓ کو حالات کا سامنا کرنے پر آمادہ کر رہے تھے ، تو وہ فوراً سقیفۂ بنی ساعدہ میں پہنچے۔ انھوں نے اس فتنے کا سدباب کرنے میں اس لیے تاخیر کرنا گوارا نہ کی کہ اگر وہاں صلاح مشورہ مکمل ہو جاتا تو واضح طور پر انصار اور مہاجرین میں تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی] ۔ اس وقت امین الامت حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح بھی ان کے ہمراہ تھے ۔ حضرت ابوبکرؓ نے انصار کا یہ دعوی سنا تو انھیں متوقع نتائج سے ، جو اس فیصلے کی صورت میں پیش آ سکتے تھے ، آگاہ کیا اور انھیں مشورہ دیا کہ اس موقع پر قومی اور علاقائی تعصب کو دلوں میں جگہ نہ دیں ۔ اس پر انصار نے "ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے" کا نظریہ پیش کیا ، مگر یہ صورت حال بھی دو متوازی حکومتوں

کے قیام کا موجب بن سکتی تھی ؛ اس لیے اس کو بھی رد کر دیا گیا]۔ اس موقع پر ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے [البلاذری : انساب، ۱:۵۸۴] اور دوسری روایت کے مطابق ایک انصاری نے (الواقدی : کتاب الردہ، مخطوطۂ بانکی پور) نے یہ حدیث نبویہ بیان کی کہ الائمۃ من قریش ، یعنی خلفا قریش میں سے ہوں گے ۔ [فرمان نبوی کے سامنے سب کی گردنیں جھک گئیں ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کے اسماے گرامی خلافت کے لیے پیش فرمائے ، مگر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ کو پکڑا اور چاہتے تھے کہ بیعت کریں] ۔ اس پر ایک انصاری نے کھڑے ہوکر کہا کہ آپ ذرا ٹھیریں اور سب سے پہلے مجھے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے دیں (حوالۂ مذکور)؛ [چنانچہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ یا ایک انصاری نے بیعت کی ۔ ان کا بیعت کرنا تھا کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں لوگ ان کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے (دیکھیے ابن سعد : الطبقات، ۳ : ۱۸۱ تا ۱۸۸)] ۔

بہر حال حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جانشین (خلیفہ) منتخب ہوگئے ، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنے سقیفہ بنی ساعدہ والے انتخاب کو قطعی نہ سمجھا اور شہر میں تین دن تک مسلسل منادی کرائی کہ لوگوں پر اس بیعت کی پابندی لازم نہیں ؛ وہ خلافت کے لیے کسی اور موزوں شخص کا پوری آزادی سے انتخاب کر سکتے ہیں (البلاذری : انساب ، ۱ : ۵۸۷ ؛ الجاحظ : الرسالۃ العثمانیہ ، ۲۳۵) ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین کے بعد مکرر ان کی بیعت عام ہوئی تاکہ جو لوگ سقیفۂ بنی ساعدہ میں موجود نہ تھے وہ بھی بیعت کر سکیں ۔ اس موقع پر یہ بھی یاد دلایا جا سکتا ہے کہ ایک سے زیادہ لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر مجھ سے ملاقات نہ ہو تو حضرت ابوبکرؓ کے ہاں جانا وہ میرے وعدے کا ایفا کریں گے (البخاری ، کتاب فضائل اصحاب النبیؐ ، باب ۵) .

[اس کے علاوہ آپؐ نے مرض الوفات میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا منشا ظاہر کیا تھا : (۱) وصال سے پانچ یوم قبل آپؐ نے خطبہ دیا، جس میں بطور خاص حضرت ابوبکرؓ کی تعریف کی اور فرمایا جس کا دروازہ مسجد میں کھلتا ہے وہ اپنا دروازہ بند کرے بجز حضرت ابوبکرؓ کے ؛ یہ بھی در حقیقت اسی بات کا اشارہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ ہی آپؐ کے جانشین ہوں گے، کیونکہ آپؐ کے خلیفہ ہی کو مسجد میں بلا تاخیر اور ہر وقت آنے جانے کی ضرورت پیش آسکتی تھی ؛ (۲) جمعرات کی عشا سے لے کر دو شنبہ کی فجر تک کی تقریباً سترہ نمازیں حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کے حکم سے پڑھائیں اور اس حکم کی تعمیل میں آپؐ نے سختی سے کام لیا ۔ اگرچہ امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ نے تین دفعہ اصرار کرکے اس حکم کو بدلانا چاہا، مگر آپؐ نے سختی سے ان کی درخواست کو رد کر دیا؛ البلاذری (انساب، ۱ : ۵۶۰ تا ۵۶۱) کے مطابق حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں حضرت ابوبکرؓ کی امامت سے ہم لوگ خلافت صدیقی کا استشہاد کیا کرتے تھے، وہ یوں کہ آپؐ نے جس ہستی کو اپنی مذہبی و دینی مسند پر کھڑا کر دیا تو دنیوی منصب، جو اس کا تابع ہے، از خود ہی ان سے متعلق ہوگیا اور وہ بخدا اس کے اہل بھی تھے ۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا : قدمک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصلاۃ فماذا یؤخرک (انساب ، ۱ : ۵۸۷)، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آپ (حضرت ابوبکرؓ) کو آگے کیا ہے پس تمھیں پیچھے کون کر سکتا ہے ؛ (۳) ابن الجوزی (الوفاء، ۲ : ۷۷۹) وغیرہ کے مطابق آپؐ

نے حضرت عبدالرّحمن بن ابی بکرؓ کو فرمایا تھا کہ میرے پاس ہڈی کا شانہ یا لکڑی (لوح) لے آؤ تا کہ میں ابوبکرؓ کے حق میں ایک دستاویز لکھ دوں تا کہ کوئی شخص اختلاف کی جرأت نہ کرے ؛ مگر جب حضرت عبدالرحمنؓ مطلوبہ چیز لینے کے لیے جانے لگے تو بلا لیا اور فرمایا : خدا اور اس کے اہل ایمان بندے ابوبکرؓ کے سوا کسی پر راضی نہ ہوں گے ؛ (۴) آپؐ نے وصال مبارک سے ایک دن یا اس سے قبل ایک نماز اس حال میں پڑھائی کہ آپؐ بیٹھے ہوئے نماز پڑھا رہے تھے، حضرت ابوبکرؓ بالکل آپؐ سے ملحق کھڑے ہوئے تھے اور عام مسلمان ان سے پیچھے صفوں میں اقتدا کر رہے تھے۔ یہ بھی اس بات کا اشارہ تھا کہ آپؐ کی نیابت کا فریضہ حضرت ابوبکرؓ ہی انجام دے سکتے ہیں] .

اسوۂ حسنہ : سرور کائنات حضرت محمّد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نبی تھے، لیکن نبی کا اسلامی تصور یہ نہیں کہ وہ عقائد ، عبادات اور احسان (تصوف) کی تعمیل تک خود کو محدود رکھے ، بلکہ اسلامی تصور میں نبی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کے حسنات کا عملی راستہ بتائے ۔ اسی لیے آپؐ نے دین بھی سکھایا اور ایک مملکت بھی چلا کر دکھائی ۔ شادی کر کے گھریلو زندگی کا ایک عمدہ نمونہ امت کے لیے چھوڑا ۔ آپؐ کی زندگی کے کثیر پہلوؤں میں سے ہر ایک پر بحث تو یہاں ممکن نہیں ، [البتہ آپؐ کی عظیم شخصیت کے چند پہلوؤں کے طرف اشارے کرنا مناسب ہوگا تا کہ آپؐ کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو سکے] .

دینی تعلیم : دین اسلام کی اساسیات مجملاً قرآن کریم میں موجود ہیں۔ اس کی تشریحات اور عملی صورتیں حدیث میں ہیں۔ ان کا خلاصہ حدیث جبریلؑ میں ملتا ہے [رکن بہ اسلام ؛ ایمان] ، جسے البخاری ، مسلم اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے کہ ایک دن مدینہ منورہ میں ایک غیر معروف شخص نے آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا : ایمان کیا ہے ؟ آپؐ نے فرمایا : اللہ ، ملائکہ ، کتب ، انبیا ، یوم آخرت کو اور خیر و شر سب ہی کی تقدیر اللہ کی طرف سے ہونے کو ماننا ؛ اجنبی نے کہا : ٹھیک ہے اور اسلام کیا ہے ؟ فرمایا: ہر روز پنج وقتہ نماز پڑھنا، رمضان میں مہینا بھر روزے رکھنا ، زکوٰۃ ادا کرنا اور استطاعت ہو تو عمر میں کم از کم ایک بار بیت اللہ شریف کا حج کرنا ؛ اس نے کہا: ٹھیک ہے؛ احسان کیا ہے ؟ فرمایا : خدا کی عبادت اس طرح کرنا گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھتا ہے ؛ اس نے کہا : ٹھیک ہے ، یہ بتائیے کہ قیامت کب آئے گی ؟ فرمایا : مجھے اس کا تم سے زیادہ علم نہیں ۔ اس پر وہ اجنبی اٹھ کر چلا گیا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کہا : دیکھو، وہ کہاں گیا ؟ مگر وہ بالکل غائب ہو چکا تھا ۔ آپؐ نے فرمایا : وہ جبریلؑ تھے ، جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے (البخاری : الصحیح ، کتاب الایمان ، باب ۳۷).

یہ حدیث جبریلؑ فی الواقع دین کا خلاصہ ہے۔ اس میں عقائد و عبادات بھی ہیں اور دین و دنیا کا اجتماع بھی اور ہر چیز کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی تدبیر بھی ۔ اس پر نظر ڈالیں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دین گویا ایک خوبصورت عمارت ہے ، عقائد اس کی چھت ہیں ، جسے عبادات کے چاروں ستون تھامے ہوئے ہیں اور اس عمارت کی آرائش و زیبائش احسان (تصوف) کے ذریعے سے ہوئی ہے ۔ [تفصیلات کے لیے رکن بہ اسلام ، ایمان ، عقائد ، اللہ ، وغیرہ].

معجزات : ایمان و عقائد سے قریبی تعلقات رکھنے والی ایک چیز معجزہ [رکن بآں] بھی ہے ، اس لیے حدیث جبریلؑ کے حصہ دوم یعنی عبادات سے

قبل اس کا مختصر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ خارق عادت چیزیں مختلف افراد سے صادر ہوتی ہیں: پیغمبرؑ سے ہوں تو اسے معجزہ کہتے ہیں، ولی سے ہوں تو کرامت اور کسی شیطانی تعلیم دینے والے سے ہوں تو اسے استدراج [یعنی آزمائش] کا نام دیتے ہیں۔ ظاہری شکل میں ان تینوں میں باہم کوئی فرق نہ ہونے سے ان میں امتیاز دشوار ہوتا ہے، [تاہم اگر دینی اور مذہبی تعلیم اور اس پر عمل کو معیار ٹھیرایا جائے تو مسئلہ سہل ہو جاتا ہے]۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ہر خارق عادت چیز خدا اور صرف خدا سے ہی صادر ہوتی ہے؛ پیغمبر تک بذات خود اس پر قادر نہیں ہوتا، بلکہ پیغمبرؑ کی شدید ضرورت کے وقت خدا اس کی تقویت کے لیے صادر کرتا ہے۔ [دراصل معجزہ تائید الٰہی کی ایک آخری صورت ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے قرآن مجید خود ایک معجزہ ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ معجزہ دیکھنے کے باوجود بری فطرتیں ایمان نہیں لاتیں۔ معجزہ ایک اتمام حجت ہے، موجب ایمان نہیں]۔ حضرت ابوبکرؓ [اور دوسرے السابقون الاولون] معجزے دیکھے بغیر ایمان لائے، لیکن پست کردار لوگ، مثلاً ابوجہل اور ابولہب، معجزات دیکھ کر بھی ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ [غرض معجزہ برحق ہے، لیکن] قرآن مجید ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتا ہے (۲ [البقرہ]: ۳)؛ پھر بھی اکثر پیغمبروں کے متعلق قرآن کریم نے معجزوں کا ذکر کیا ہے۔ نوحؑ کا طوفان، ابراہیمؑ کے لیے آگ کا ٹھنڈا ہو جانا، موسیٰؑ کا ید بیضا اور سانپ بننے والا عصا، عیسیٰؑ کے ہاتوں بیماروں کا تندرست ہونا، مٹی کے پرند نما کھلونوں کا واقعی زندہ پرندہ بن جانا اور مردے کا زندہ ہونا اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات اتنے ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں (دیکھیے سلیمان ندوی: سیرت النبیؐ، جلد سوم)، مثلاً: دوبار مردوں کا زندہ ہونا؛ کھجور کے تنے کا بآواز رونا؛ گونگے کا بات کرنے لگنا؛ شق صدر؛ شق قمر؛ درخت کا ایک جگہ سے چل کو دوسری جگہ تک چلا آنا؛ قلیل پانی اور قلیل غذا کا کثیر جماعت کے لیے کافی ہو جانا؛ ہاتھ کی انگلیوں سے کثیر مقدار میں نوشیدنی پانی نکلنا؛ آپ سے چرندوں کا باتیں کرنا، گھر کا محاصرہ کیے ہوئے لوگوں کے بیچ میں سے صاف بچ نکلنا اور ان کا خبردار نہ ہونا؛ غیب کی خبریں دینا کہ تم نے فلاں کام کیا ہے؛ فرشتوں کا آپؐ کی مدد کے لیے آنا؛ معراج [رک باں] میں آسمانوں سے بھی پرے حظیرۃ القدس اور قاب قوسین تک جانا؛ ایسا قرآن مجید پیش کرنا کہ اس جیسا تو کیا اس کی ایک تین آیتی سورۃ کی مثال لانا بھی جن و انس کی متحدہ زور و کوشش کے باوجود ممکن نہیں، وغیرہ۔ ہر قسم کے بکثرت معجزات آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صادر ہوئے، لیکن قرآن مجید میں بار بار وارد ہے کہ فکر و تدبر سے کام لو؛ عقل سے اور ٹھنڈے دل سے غور کرو تو اسلام کی حقانیت خود ہی تم کو قائل کر دے گی۔ [معجزے کا انکار ناجائز ہے، لیکن ایمان لانے کے لیے معجزات پر انحصار درست نہیں۔ اسلام نے معجزات سے زیادہ عقل و فکر اور غور و تدبر پر پر زور دیا اور ان سے کام لے کر دینی مسائل کو سمجھنے کی تلقین کی ہے]۔

عبادات: عقائد کے بعد نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ کی چار بنیادی عبادتیں فرض کی گئی ہیں کہ عبد کا فریضہ عبادت ہے۔ عبادت ہر مخلوق کے فطری حالات کے مطابق ہونی چاہیے۔

نماز کی حد تک یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس لیے اس کی عبادت اور نماز بھی سب کی عبادتوں سے فائق ہونی چاہیے۔ کائنات میں جمادات، حیوانات اور نباتات سبھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق عبادات کرتے ہیں (۱۷

[بنی اسرائیل] : ۴۴) ؛ جمادات بے حرکت ادب سے کھڑے ہیں (نماز کا پہلا رکن قیام ہے) ؛ حیوانات دائمی طور پر رکوع کی حالت میں رہتے ہیں (نماز کا دوسرا رکن رکوع ہے) ؛ نباتات کا منہ ان کی جڑیں ہیں اور دائمی طور پر وہ سر بسجود سے ہیں (نماز کا تیسرا رکن سجدہ ہے) ؛ چاند سورج اور ستارے اپنی گردش کو سدا جاری رکھنے پر مأمور ہیں (نماز کی رکعتوں میں بھی ایک ہی مجموعۂ اعمال کی تکرار ہوتی رہتی ہے)؛ پانی، رعد، سایہ وغیرہ ہر مخلوق کا ایک طرز عبادت ہے جو نماز میں سمو دیا گیا ہے ۔ غرض مسلمان کی نماز کائنات کی نمازوں کا متوازن خلاصہ اور مجموعہ ہے [رک بہ صلوٰۃ] ؛

(۲) روزہ : روزہ انسان کی طاقت کے مطابق خدا کی بعض صفات سے متصف ہونے [صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲ [البقرۃ] : ۱۳۸)] اور روحانی قوت کی نشو و نما کی کوشش کا نام ہے کہ کھانا پینا وغیرہ چھوڑ دیا جائے ۔ اسلامی روزہ صرف خانقاہ نشینوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ ہر مرد عورت اور ہر بالغ مسلمان پر فرض ہے ۔ یہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک رکھا جاتا ہے [نیز رک بہ صوم ؛ رمضان وغیرہ] ؛

(۳) حج بیت اللہ : خدا ہر جگہ ہے اور انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب تر ۔ اس لیے اسے کسی جگہ محدود نہیں کیا جا سکتا ہے ، [لیکن انسان چونکہ جہت کا تصور کیے بغیر خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کر سکتا ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ایک گھر (بیت اللہ شریف زادھا اللہ شرفاً و کرامۃً) [رک بہ کعبہ] کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لیا، تاکہ اللہ کے بندے اس کی جہت میں خدا تعالیٰ کی عبادت بجا لا سکیں ؛ چنانچہ اس مقام معظم کی طرف منہ کرکے نماز بھی ادا کی جاتی ہے اور صاحب توفیق افراد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس کا حج [رک بآں] ادا کریں] ؛

(۴) زکوٰۃ : اسلام کی چوتھی عبادت زکوٰۃ [رک بآں] ہے ۔ نماز، روزہ اور حج بدنی عبادات ہیں، مگر زکوٰۃ مالی عبادت ہے ۔ زکوٰۃ اندوختے (سونے، چاندی اور پیسوں)، زراعت ، معدنیات ، تجارت ، مویشیوں کے ریوڑوں وغیرہ میں سالانہ طور پر واجب الادا ہوتی ہے ۔ اسلام میں حسنات دارین کو جمع کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس کا بہترین مظاہرہ زکوٰۃ سے ہوتا ہے ۔ زکوٰۃ کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور قرآن میں بار بار ایک ہی جملے میں نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کا یکجا ذکر ہوا ہے ۔ اس لیے اگر نماز کے انکاری کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے ، تو زکوٰۃ کے انکاری کو اس سے کم گناہ کا مرتکب نہیں سمجھا جاتا ۔ اس تصور میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر حکومت کی نگرانی اور جبر کے بغیر کوئی نماز ، روزہ اور حج کے فریضے خود ہی کامل طور پر انجام دیتا ہے تو زکوٰۃ بھی اپنی خوشی سے ادا کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ زکوٰۃ دین سے باہر سیاسی اور دنیوی چیز سمجھی جائے ۔ حکومت جبر کرے تو دیں ، ورنہ بے پروائی سے کام لیں [تفصیل کے لیے رک بہ زکوٰۃ].

(۵) احسان : حدیث جبریلؑ کا تیسرا حصہ احسان کے متعلق ہے جسے تصوف ، طریقت ، سلوک جیسے مختلف ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے ۔ یہ روحانی تزکیہ ، اخلاق حسنہ کو طبیعت ثانیہ بنا لینا ، اور ہر وقت اور ہر مشغولیت میں خدا سے لو لگائے رکھنا ہے ۔ احسان کا اجمالی اور جامع و مانع خلاصہ وہ ہے جو حدیث جبریلؑ میں اوپر بیان ہوا ۔ اس سلسلے میں مسجد نبوی کے صُفّہ [رک بہ اہل صفّہ] کا ذکر کیا جا سکتا ہے ، جو مدرسہ اور اقامتی خانقاہ دونوں پر مشتمل تھا اور وہاں دین و دنیا دونوں کی تربیت ملتی تھی ۔ اس کے بڑے اصول اکل حلال اور صدق مقال ہیں ۔ فرض تو ہر شخص کے لیے ہے ، احسان میں ان کے حسن ادا اور نوافل اور ان پر مواظبت کی

تاکید ہوتی ہے ۔ [نیز رک بہ تصوف ؛ زہد ؛ تقوٰی].

(۹) وقوعِ قیامت : حدیث جبریل[۴] کا آخری حصہ قیامت کی تاریخ سے متعلق ہے ۔ عقائد کے علاوہ قیامت کا یہ مستقل ذکر اس کی اہمیت کے متعلق ہے کہ قیامت اور حساب و کتاب کا عقیدہ ہمیں برائی سے ہر وقت بچاتا ہے ۔ غرض حدیث جبریل[۴] میں وہ ناگزیر اقل بتایا گیا ہے جو ہر مسلمان کو کرنا چاہیے ۔

تعمیل و تنظیم : پیغمبر علیہ السّلام کا کام صرف تبلیغ احکام ہی نہیں تھا ، بلکہ حتی‌الوسع اس کا عملی نفاذ اور باقاعدہ اجرا بھی آپ[ص] کے فرائض میں داخل تھا ؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب اپنے ماحول کو اللہ اور یوم آخرت کے ماننے کی دعوت دی تو اس میں نہ آپ[ص] کی کوئی ذاتی منفعت تھی اور نہ کوئی جاہ طلبی ۔ آپ[ص] بار بار فرماتے تھے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (۴۲ [الشوریٰ]: ۲۳)، یعنی میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ۔ اس کے باوجود آپ[ص] کی مخالفت ہوئی اور مخالفوں کی ایذا رسانی سے آپ[ص] کی جان کو خطرہ پیدا ہوگیا ۔ ان حالات میں دو امکان ہی تھے : یا تو آپ[ص] اصلاح کی کوشش سے دستبردار ہو جائیں اور اس طرح اپنے مشن کو ادھورا چھوڑ جائیں ؛ یا پھر اللہ کی وسیع و عریض زمین میں ہجرت کرکے اس کے عملی نفاذ کی کوششیں جاری رکھیں ۔ تبلیغ سے دستبردار ہونا نہ صرف خدا کے عائد کردہ فرض کے خلاف ورزی ہوتا، بلکہ برائی کے عام ہو جانے کو روا رکھنا ہوتا ۔ بالآخر ناگزیر طور پر ہجرت کا فیصلہ کیا ۔ کام آسان نہ تھا، کیونکہ تبلیغ کے مخالفوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موافقوں اور حامیوں کی ضرورت تھی اور ان کے حصول کے لیے بھی تبلیغ ہی مؤثر ہو سکتی تھی ۔

تبلیغ پہلے دوستوں کے حلقوں میں محدود اور مخفی رہی ۔ جو شخص مسلمان ہوتا وہ تبلیغ کا ایک نیا مرکز بن جاتا ؛ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق دعوت و ارشاد میں دن رات کوشاں رہتا ۔ ان مخلصوں کو نہ صرف صبر و تحمل رکھنا ہوتا تھا، بلکہ بتدریج اسلام کی تعلیم کو ہر شعبۂ حیات کی ضرورتوں کے لیے مکمل کرنا اور اس کو مسلمانوں تک پہنچانا اور اس پر عمل کرنا اور عمل کرانا بھی شامل تھا۔ مسلمانوں کی تعداد صفر سے شروع ہوئی اور آغاز میں رفتار لازماً سست رہی ۔ ابتدائی بارہ سال میں بمشکل دو چار سو آدمی مسلمان ہوئے ۔ غیر محسوس طور پر ان میں تنظیم پیدا ہو گئی ۔ ایک سردار ، ایک قانون ، ایک برادری یا امت ۔ ہر مسلمان ہر ضرورت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے رجوع کرتا اور مسلمانوں میں باہم تعاون رہتا ۔ اس مملکت کے لیے شروع میں مرکز نہ تھا ؛ تو اس کی پرواہ بھی نہ کی گئی، کیونکہ اصل مقصد تبلیغ دین تھا اور اس کے لیے صورت حال کے مطابق کام کرنا تھا ۔ ہجرت کرکے مدینہ منورہ آنے پر ایک اسلامی ریاست قائم کرنی ممکن ہوئی، لیکن آبادی کی اکثریت ہنوز غیر مسلم تھی اور ایک عنصر یہود سے بھی سابقہ تھا۔ اس لیے حکومت کا ہر شعبہ اور ہر ادارہ بتدریج قائم کرنا اور تجربے سے اس کی کارکردگی کو سدھارنا تھا ۔ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ آپ[ص] نے شہری مملکت کس طرح قائم فرمائی اور اس کے لیے ایک تحریری دستور کس طرح تدوین کیا ۔ اب اس تنظیم کے ارتقا، تعلیم عامہ، عدلیہ ، قانون سازی ، دفاع ، مالیہ وغیرہ کے وجود میں لائے جانے کی ضرورت تھی، جو کہ آپ[ص] نے باحسن طریقے پر پوری فرمائی ۔

تعلیم عوام : عہد نبوی[ص] میں تعلیم کو بڑی اہمیت دی گئی ۔ جس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبی امّی پر نازل ہونے والی اولین وحی کا اولین لفظ اِقْرَأْ، یعنی پڑھ تھا اور اس کے ساتھ ہی قلم کی تعریف میں یہ حقیقت یاد دلائی گئی کہ سارا انسانی علم یعنی تہذیب و تمدن قلم ہی کا رہین منت ہے اور اگلوں کے

تجربوں سے پچھلوں کا استفادہ اس کے بغیر ممکن نہیں ۔ قرآن کریم نے نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب نبوت کا ذکر کرتے ہوے فرمایا: وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُونُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲ [البقرة]: ۱۵۱)، یعنی آپ تمھیں کتاب و حکمت اور اس چیز کی تعلیم دیتے ھیں ، جو تمھیں معلوم نہ تھی۔ علاوہ ازیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صراحت فرمائی : بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (ابن ماجہ ، فضل العلماء)؛ اس سے بھی بڑھکر ارشاد ھے ، العلماء ورثة الانبیاء (البخاری ، ۳/۱۰، ۱ : ۲۸) ، یعنی علما نبیوں کے وارث ھوتے ھیں .

نتیجہ یہ ھوا کہ عربی زبان جو تاریخ میں پہلی دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نوعمری میں (ابو سفیان کے باپ) حرب کی سرداری کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں لکھی جانے لگی تھی اور قرآن اولین کتاب تھی، جو عربی زبان میں نازل ھوئی ۔ اسلام کی تعلیمی روح کے باعث دو سو سال ھی بعد تحریری ادب میں دنیا کی سب سے زیادہ با ثروت علمی زبان بن گئی، جس میں دنیا کے سارے ھی علوم کی اعلیٰ ترین کتابیں دستیاب ھونے لگیں ۔ لکھائی کے آغاز کے وقت خود اس کے خط کا یہ حال تھا کہ ۲۸ ابجد کے لیے صرف پندرہ [چودہ ؟] شکلیں تھیں (ب ، ت ، ث ، ن ، ی) ؛ (ج ، ح ، خ) ؛ (د ، ذ) ؛ (ر ، ز) ؛ (س ، ش) جس سے جملے کبھی صحیح اور کبھی غلط پڑھے جاتے تھے ۔ رقش یعنی حروف کے نقطے نیز اعراب میں کم از کم تنوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیے جاتے ھیں ۔ باقی اعراب بعد میں وضع کیے گئے (دیکھیے مقالہ صنعة الکتابة فی عهد الرسول والعمارة، در مجلہ فکر و فن، ھامبورگ، دسمبر ۱۹۶۴ء) اور اعراب لگا ھوا عربی خط دنیا کا سب سے زیادہ بے التباس اور خوبصورت خط بن گیا ؛ چنانچہ لاطینی میں Rahim کو رحم ، رحیم اور راحیم تین طرح پڑھا جاسکتا ھے، لیکن عربی میں یہ التباس ناممکن ھے۔ خط کے استقرار کی طرح زبان کا استقرار بھی قابل ذکر ھے ۔ دنیا کی زبانیں چار پانچ سو سال بعد عام طور پر ناقابل فہم ھو جاتی ھیں ۔ چوسر Chaucer (م ۱۴۰۰ء) کی انگریزی کو آج کتنے لوگ سمجھ سکتے ھیں ، مگر عربی زبان چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود نہ صرف و نحو میں بدلی، نہ لغت میں اور نہ املا و تلفظ میں .

عہد نبوی میں درس کے لیے صرف ایک جامع کتاب رکھی گئی، یعنی قرآن جس میں سارے ھی علوم کی اساسی چیزیں ھیں ۔ عقائد و عبادات بھی، قانون بھی، خدا کی حمد و ثنا بھی ، تاریخ عالم بھی ، اخلاق و طریقۂ معاشرت بھی ۔ تورات بشمول زبور ایک قبیلے کی تاریخ ھیں ۔ موجودہ انجیل ایک فرد کی محض سوانح عمری ھے ، جبکہ قرآن انسانیت کی تاریخ اور انسان کے لیے ھر شعبۂ حیات میں راستہ بتانے والی کتاب ھے .

ھجرت سے قبل ھی مکے میں قرآن کریم کو لکھ کر محفوظ کیا جانا شروع کیا گیا ۔ مردوں کے علاوہ عورتوں کو بھی اس کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ اس کا پڑھنا سمجھنا کسی کنبے اور کسی ایک ذات کے لوگوں سے مخصوص نہیں کیا گیا ۔ ھجرت سے قبل مکہ مکرمہ ھی سے ایک عالم حضرت مُصعب رض بن عمیر کو مدینہ منورہ بھیجا گیا ۔ ان کی کوشش سے سال ڈیڑھ سال میں کوئی سو کے قریب خاندان مسلمان ھوگئے۔ ھجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسجد نبوی بنی تو اس میں صُفّہ کے نام سے ایک اقامتی تعلیم گاہ بھی قائم کی گئی ۔ اس میں لکھنے پڑھنے جیسی سادہ تعلیم سے لے کر ، دین، قانون سلوک اور اخلاق کی اعلیٰ تعلیم بھی دی جاتی تھی ۔ عہد نبوی میں مدینہ منورہ ھی میں مسجد نبوی کے علاوہ نو مسجدیں تھیں جن میں سے ھر ایک میں مدرسہ بھی تھا اور اھل محلہ وھیں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ابن حزم (جوامع السیرة، ص ۳۲۳) کے مطابق صحابیات میں سے بیس کے قریب صاحب فتوی فقیہ تھیں ۔

شفاءؓ بنت عبداللہ جو ، جو حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں ، کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کو لکھنا پڑھنا سکھایا تھا (ابو داؤد سنن ؛ ابن حنبل : مسند ، ۶/۳۷۲ ؛ الحاکم : المستدرک ، ۴ : ۵۶ تا ۵۷) ۔ ایک روایت (ابن حجر : الاصابہ ، نساء/ص ۶۱۸) میں ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے انھیں شہر کی منڈی میں بعض خرید و فروخت کے معاملات (امر السوق) پر مامور فرمایا تھا ۔ بیرون سے مسلمان مدینہ منورہ آتے اور تعلیم و تربیت حاصل کر کے اپنے علاقوں کو واپس جا کر معلم بنتے تھے ۔ مدینہ منورہ سے بھی مدرس ہر جگہ بھیجے جاتے تھے ۔ الطبری نے سنہ ۱۱ھ کے حالات میں (۱ : ۱۸۵۲ ، ۱۹۸۳) یہ اثر انگیز واقعہ لکھا ہے کہ حضرت معاذؓ بن جبل کو جب یمن بھیجا گیا تو وہ یمن اور حضر موت کے صوبوں کے ہر ضلع میں تعلیمی دورے کیا کرتے تھے ، گویا وہ صوبۂ یمن میں تعلیم کے ناظر اعلی تھے ۔ یہی حالت دوسرے صوبوں میں بھی ہوگی ۔ سورہ ۲ [البقرۃ]: ۲۸۲ میں حکم دیا گیا کہ کوئی ادھار رقم یا معاملہ تحریر کے بغیر نہ ہو اور یہ کہ ایسی دستاویز پر فریقین کے علاوہ دو گواہوں کے دستخط بھی ہوں .

سرکاری تدبیروں کے ساتھ عوام کو بھی تعلیم پھیلانے کی پر زور ترغیب و تشویق دی جاتی رہی ۔ قرآن کریم کو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدون کرایا ، حدیث کی تدوین متعدد صحابہؓ نے آپؐ کی اجازت سے آپؐ کے جیتے جی شروع کر دی تھی ۔ ان میں آپؐ کے خادم خاص حضرت انسؓ بن مالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، جو لکھی ہوئی یاد داشتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سنا کر تصحیح کرانے کے عادی تھے (الخطیب : تقیید العلم ، ص ۹۵ تا ۹۶ ؛ الحاکم : المستدرک) ۔ شاید حکومت کے وسائل کی کمی تھی کہ حکومت نے صرف مسلمانوں کی تعلیم پر اکتفا کیا ، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ رواداری کا وفور تھا کہ کوئی طبقۂ رعیت بھی ایسا نہ ہو جسے اپنی ثقافت کی آزادی نہ ہو اور اس رواداری ہی کا نتیجہ ہے کہ کبھی مسلمانوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں بھی ذمیوں نے بغاوت نہ کی اور اسلامی حکومت کو وہ اپنے ہم مذہب رومیوں وغیرہ کی حکومت پر کھلم کھلا ترجیح دیتے رہے کہ وہاں فرقہ واریت بہت زیادہ تھی ۔

عدلیہ و تشریعیہ (مقنّنہ) : شروع میں یگانہ حاکم عدالت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی تھے ۔ ہجرت کرکے مدینہ منورہ آنے پر آپؐ زیادہ تر عدالت مرافعہ بنے رہے ۔ مقدمے اولاً شیوخ قبائل کے پاس جاتے ، بجز اس کے کہ مقدمے کے فریق دو مختلف قبیلوں کے ہوں ۔ ملک میں توسیع ہوئی تو کبھی عامل ہی حاکم عدالت بھی ہوتے ؛ کبھی ایک علیحدہ با اختیار قاضی مأمور کیا جاتا ۔ صوبوں سے بعض اوقات قاضی پیچیدہ مقدموں میں استصواب کرتے ؛ بعض اوقات صوبوں کے نامناسب فیصلوں کی اطلاع ملتی تو مرکز سے تنسیخ اور تصحیح و اصلاح کی ہدایتیں بھی دی جاتیں ۔ قانون (نص صریح) میں سکوت نظر آئے تو قاضیوں کو اجتہاد اور قیاس سے امثلہ و نظائر پر قیاس کرکے نیا قانون بنانے کی بھی اجازت تھی ۔ نیت کی اصلاح پر زور دیا جاتا تھا ۔ قاضیوں کو حکم تھا کہ اپنی ذاتی معلومات پر عمل نہ کریں بلکہ پیش شدہ شہادت پر ہی فیصلے کی بنیاد رکھیں ؛ نیز یہ کہ فریق ثانی کا جواب سنے بغیر یک طرفہ بیان پر فیصلہ ہرگز نہ کیا جائے ۔ ایک اہم ہدایت قاضیوں کو یہ دی گئی ! "البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر" (ثبوت پیش کرنا دعوی کرنے والے کا فریضہ ہے اور انکار کنندہ مدعی علیہ کو قسم کھا کر انکار کرنا پڑے گا) ۔ فنی چیزوں کے

لیے ماہرین سے تحقیقات کرا کر ان کے مشورے پر عمل کیا جاتا ۔ قاضیوں کو تاکید ہوتی کہ پیچیدہ معاملات میں نیک اور باصلاحیت اہل علم سے مشورہ کیا کریں ۔ اسلام نے کسی شخص حتی کہ حاکم ملک کو بھی قانون سے بالا قرار نہ دیا اور ہر فرد کو اس کے اعمال کا مسئول اور ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے ۔ خلافت راشدہ کے زمانے سے ہمارے ہمعصر عہد تک مسلمان حکمرانوں کے خلاف اس کے اپنے ملک میں قاضی کے ہاں مقدمہ دائرہ ہوتا رہا ہے ۔ حکمران اپنا مقدمہ آپ سننے اور فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ۔ قانون کی تکمیل کے لیے ہر نظام میں ایک تہدید ہوتی ہے جو پولیس اور فوج کی قوت اور حاکم عدالت کے فیصلوں کا نفاذ ہے ۔ اسلام نے اس ظاہری تہدید کو کاملاً اپناتے ہوے اس میں ایک مزید اور قوی تر عنصر کا اضافہ کیا جو حساب آخرت اور خدا کے ہاں ظالم کی جوابدہی ہے ۔ ایک حدیث ہے کہ لوگ جھگڑے میرے پاس لاتے ہیں اور ممکن ہے کہ کوئی اپنی دلیل بیان کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو اور میں جو سنوں اس کے مطابق فیصلہ کر دوں ۔ اگر میں کسی کو اس کے بھائی کا حق مار کر کچھ دینے کا حکم دوں تو یقین جانو کہ میں اسے جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا دیتا ہوں (صحاح ستہ) ۔

قرآن نے تعلیم کی طرح عدالتی معاملات میں بھی غیر مسلموں کو کامل خود مختاری دی ہے ۔ فریقین ایک ہی ملّت (مثلاً نصرانیت) کے ہوں تو انہیں کے قانون ، انہیں کے حاکم عدالت اور انہیں کی ابتدائی و آخری عدالت مرافعہ ہوگی ؛ اسلامی عدالت اور قاضی سے ان کو کوئی سروکار نہ ہوگا ۔ حاکم عدالت کا تقرر بھی انہیں کی ملت کرتی ہے ۔ انہیں اجازت ہے ، جبر بالکل نہیں ، کہ فریقین متفقہ طور پر چاہیں تو اسلامی حاکم عدالت کے پاس رجوع کریں ۔ فریقین ایک ہی ملت کے ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ انہیں کا قانون منگوا کر اس کے مطابق فیصلہ فرماتے ۔ فریقین اگر دو مختلف ملتوں کے غیر مسلم ہوتے تو وہی آپس میں فیصلہ کرتے کہ کس قانون کی طرف رجوع کیا جائے ۔ اگر وہ اسلامی عدالت میں آنے کا فیصلہ کرتے تو ان کی خواہش کے مطابق ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جاتا، (لیکن ایسی کوئی معین مثال عہد نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں نہیں ملتی) ۔

اگر فریقین میں سے ایک مسلمان ہوتا تو مقدمہ لازماً اسلامی عدالت میں آتا اور اسلامی قانون رو رعایت کے بغیر پورا پورا انصاف کرتا ۔ (ایسی مثالیں موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمان کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ کیا) ۔

قانون سازی کا عام اصول یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کے پرانے رسم و رواج اور عرف و عادت پر عمل جاری رکھتا ہے ، بجز ان چیزوں کے جن سے گھ اسے ، اس کا قابل احترام سردار ، منع کرے ۔ نیز ان نئی چیزوں پر عمل کرے جن کا وہ حکم دے ۔ اس طرح شروع ہی سے مسلمانوں میں قانون کے دو ماخذ رہے : کتاب اللہ ؛ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ؛ [البتہ اضافی طور پر مقامی (مثلاً مکی یا مدنی) رواج کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امت کی سہولت اور آسانی کی خاطر اپنی صوابدید کے مطابق کچھ تغیر و تبدیلی کے ساتھ شامل کرنے کی اجازت دے دی ؛ اس طرح] اس پرانے رسم و رواج کو "تقریر نبوی" ہونے ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے برقرار رکھے جانے ، کی سند حاصل ہوگئی اور وہ اسلامی قانون کا جزو لاینفک بن گیا اور سنت سے بنے ہوے قانون ہی کے برابر مقدس ۔ "تقریر نبوی" کا اطلاق مکے کے بعد مدینے کے رواج پر ہوا ۔ یہ صحیح ہے کہ مقامی رواج کی "اصلاح" اور اس کو اسلام کے مطابق بنانا بتدریج ہی ہو سکتا تھا ، یعنی

اگر کسی رواج کا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو علم ہوتا، یا رواجی عمل کی بنا پر پیدا شدہ جھگڑا فیصلے کے لیے آپؐ تک لایا جاتا تو آپؐ کچھ نہ کچھ ضرور کر دیتے، چاہے رواج کو برقرار رکھتے یا اسے تبدیل کر دیتے، لیکن اگر کوئی رواج آپؐ کے علم میں نہ لایا جاتا تو اس کی اصلاح کی واحد صورت یہ تھی کہ قرآن [illegible] کے عام احکام سے استنباط کرکے اس رواج کو بعد کے فقہا برقرار رکھیں یا بدلنے کا حکم دیں اور فقہا کا یہ عمل لا متناہی ہے۔ اس کا تعلق ساری دنیا سے ہے، سارے زمانوں سے کہ قرآن و سنت معلوم و معین ہو چکے ہیں، لیکن دنیا میں اسلام کا پھیلنا ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ قرآن و سنت اسلامی قانون کے اہم اور بنیادی مآخذ بھی ہیں اور مقامی پرانے رواجوں کے اصلاح کنندہ بھی؛ البتہ ان کا سمجھنا اور ان سے نئے احکام کا استنباط کرنا انتھک اور مسلسل محنت چاہتا ہے۔ فہم میں قصور ہو سکتا ہے، مثلاً وضو کی ضرورت ہو اور پانی نہ ہو تو منہ اور ہاتھوں پر مٹی سے تیمم کرنا چاہیے، لیکن اگر ضرورت غسل کی ہو تو قرآن مجید (۴ [النساء] : ۴۳؛ ۵ [المائدۃ] : ۶) میں کافی صراحت کے باوجود بعض صحابہؓ نے قیاس کیا کہ غسل کے وقت مٹی پر لوٹ کر سارے جسم پر تیمم کرنا چاہیے۔ ایسے عمل کی اطلاع جب آپؐ کو ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں منہ اور ہاتھوں کا مسح کافی ہے۔ اسی بنا پر جب حضرت عمروؓ بن العاص کو آپؐ نے قاضی بنایا تو انھیں بتایا کہ قانون کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں حاکم عدالت کو دیانتداری سے اجتہاد (کوشش) کرکے قیاس سے حکم شریعت معلوم کرنا چاہیے اور اس میں اگر حاکم عدالت ناکام رہے، یعنی غلط حکم دے تو بھی اسے اللہ کے ہاں ایک اجر ملے گا (نیت کی درستگی کا)، اور اگر صحیح حکم تلاش کر لے تو اسے دو اجر ملیں گے۔ اسلام میں اہل علم میں مساوات ہے؛ اس لیے ان میں اختلاف رائے قابل برداشت ہے اور امت کا یہ اختلاف اس معنی میں بھی خدا کی رحمت ہے کہ مختلف آرا اور دلیلوں کو دیکھ کر بہتر رائے کا معلوم کر سکنا ممکن ہے۔ حدیث حضرت معاذؓ بن جبل کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ یمن بھیجے گئے تو رخصتی ملاقات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کس طرح فیصلہ کیا کروگے؟ انھوں نے کہا: کتاب اللہ کے مطابق۔ فرمایا: اگر اس میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے کہا: تب سنت رسولؐ کے مطابق۔ آپؐ نے فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ کہا: تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروں گا۔ اس پر آپؐ نے انتہائی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: اللہ کے لیے حمد ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کے سفیر کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول پوری طرح راضی ہے۔ غرض قرآن مجید، سنت نبوی اور تقریر نبوی نیز اجتہاد و استنباط عہد نبوی میں قانون سازی کے عام ذریعے تھے۔ کچھ خاص وقتی اور محدود ذریعے بھی تھے، مثلاً قدیم پیغمبروں کی شریعتیں، کیونکہ وہ بھی خدا ہی کا حکم لائے تھے؛ اس لیے ان کی شریعتیں مسلمانوں پر بھی برقرار اور نافذ رہتی ہیں، بشرطیکہ اس کا قرآن کریم میں ذکر ہو اور اس کو قرآن یا سنت نبوی نے منسوخ نہ کیا ہو۔ چنانچہ اٹھارہ پیغمبروں کا نام لینے کے بعد قرآن (۶ [الانعام] : ۹۰) نے صراحت کی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی اس لیے (اے محمدؐ) ان کی ہدایت کی اقتدا کرو۔ [قانون سازی کے سلسلے میں قانون بین الممالک کے کئی احکام قرآن مجید میں بھی ہیں، یعنی جنگ اور امن کے زمانے میں دوسری حکومتوں سے کیسا برتاؤ اور سلوک کیا جائے۔ اس ضمن میں قانون زیادہ تر سنت نبوی پر مبنی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے غزوات اور جنگوں میں جو برتاؤ دشمن سے

روا رکھا اور یہ قانونِ جنگ دنیا کے تمام قوانین جنگ سے بدرجہا بہتر اور زیادہ انسانیت پرور ہے۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنن ؛ محمد (سورہ)] .

دفاعی اور عسکری ادارہ : عہد نبوی ؐ کی روحانی فتوحات کہ کئی لاکھ آدمی مسلمان ہوے ، (حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان شریک ہوے) اپنی جگہ ہیں، لیکن مادّی فتوحات بھی کچھ کم نہیں [رک بہ غزوات] ۔ آپ ؐ کی جنگوں میں آپ ؐ کے دشمنوں کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوتی تھی ۔ بعض اوقات دس گنا سے بھی زیادہ ، اس کے باوجود دشمن مقابلہ نہ کر سکا۔ ہجرت مدینہ کے فوراً بعد قرآن مجید نے جہاد یعنی فوجی خدمت ہر مسلمان کا فریضہ قرار دے دیا ؛ [کیونکہ دشمن اہل اسلام کو مٹانے کے لیے پوری طرح تیاریوں میں مصروف تھے؛ اس لیے اندیشہ تھا کہ اگر ان کے مقابلے کے لیے تیاری نہ کی گئی تو اہل اسلام کو مٹانے میں کوئی دریغ نہ کریں گے (دیکھیے ۲۲ [الحج] : ۳۹) .

ملک جنگجو اور ہر شخص مسلح تو پہلے سے تھا؛ اب ان کی جنگی تربیت کی تدبیریں روز افزوں اختیار کی گئیں ۔ تیر اندازی ، گھڑ دوڑ اور کُشتی وغیرہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم شخصی سرپرستی فرماتے رہے [رک بہ علم فروسیۃ ؛ فرس] ؛ گھڑ دوڑ میں شرکت کرکے جیتنے والوں کو خود انعام دیتے ؛ جنگ کے لیے تربیت کے دوران میں جیتنے والے گھوڑوں کا انتخاب جس ٹیلے پر کھڑے ہوکر فرماتے وہاں مدینہ منورہ میں آج بھی مسجدالسبق (گھڑدوڑ کی مسجد) باقی ہے۔ عبادت کے قواعد ایسے بنے کہ ان سے فوجی تربیت میں مدد ملتی ہے ۔ ہر سال مہینا بھر روزے رکھنا سپاہیوں کو بھوکے پیاسے رہ کر لڑنے کی تربیت دلاتا ہے ۔ نماز سے صبح خیزی ، صف بندی اور امام کی آواز پر حرکات و سکنات بھی فوجی تربیت میں معاون ہیں ۔ حج کے ذریعے سے ساری مملکت سے مسلمانوں کا اجتماع عام گھر کی چھت کے بجاے آسمان تلے زندگی گزارنا وغیرہ سکھاتا ہے ۔ قمری مہینوں کے اختیار کرنے کی وجہ سے ہر موسم کے روزوں کی تربیت دی جاتی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بچوں ، معذوروں ، اپاہجوں کو چھوڑ کر ساری مسلم آبادی مستقل فوج تھی ، جب چاہا اور جتنوں کی ضرورت ہوئی اتنوں کو بلا لیا جاتا تھا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مسجد میں نماز کے وقت رضاکاروں کی ضرورت کا اعلان کرتے اور بتاتے کہ کس کے پاس اپنے نام لکھوائیں اور کب اور کہاں جمع ہوں ۔ اور اگر خود قیادت نہ فرماتے تو سالار جیش نامزد فرماتے ۔ حسب ضرورت ذیلی افسر بھی مامور کیے جاتے ؛ چونکہ لڑائی کا مقصد دنیوی منفعت بالکل نہ تھا، اس لیے جنگ کے عین اثنا میں بھی نمازِ خوف کا حکم نازل ہوا (م [النساء] : ۱۰۲) ۔ اس کی تعمیل کی جاتی تھی خواہ نتائج کچھ ہی نکلیں ، اس سے اسلامی افواج کی اہلیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس سوال پر کہ کوئی مال غنیمت کے لالچ میں ، کوئی اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے ، کوئی حمیت سے ، ان میں سے راہ خدا میں لڑنے والا کسے سمجھا جائے گا ؟ آپ ؐ نے جواب دیا : صرف وہ جو اللہ کے نام کی سربلندی کے لیے جنگ کرے ۔ اسے نہ مال غنیمت کی چاہت ہو ، نہ کوئی اور مادی طلب [رک بہ جہاد] ۔ تنظیم کی بہر حال ضرورت تھی ۔ جس طرح عوام کی عسکری تربیت میں حکومت دلچسپی لیتی تھی، اسی طرح حکومت سے مستقل فوج کے فائدے نظر سے پوشیدہ نہ رہے ۔ فوری ضرورت کے لیے صفّہ کی "خانقاہ" سے دن ہو کہ رات ، ہر وقت رضاکار تیار ملتے ۔ جب رفتہ رفتہ حکومت کے مالی وسائل بڑھے ، بڑی تعداد میں نیم مستقل فوج کے تیار رکھنے کے لیے وظیفہ دینے کا نظام شروع کیا گیا ۔ السرخسی (شرح السیر الکبیر، ۲ : ۲۵۶ ، باب ۱۰۵ ، حیدرآباد)

نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں سے جو صدقات وصول ہوتے ان کو دشمنوں سے حاصل شدہ مال (فَیْء) سے الگ رکھا جاتا؛ ہر ایک کے مصارف و مستفیدین جدا جدا تھے ۔ صدقات یتیموں، بوڑھوں اور غریبوں کے لیے تھے؛ پھر جب کوئی یتیم بالغ ہو کر جہاد (فوجی خدمت) کا مستوجب ہو جاتا تو اسے صدقات کے مستفیدین سے نکال کر فیء کے مستفیدین میں منتقل کر دیا جاتا، لیکن اگر وہ جہاد میں حصہ لینا نہ چاہتا تو اسے حکومت کے مال میں سے کچھ نہ دیا جاتا، (نہ صدقات سے، نہ فیء سے)، بلکہ اسے کہا جاتا کہ اپنا کسب معیشت خود تلاش کرے ۔ ان وظائف کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ مرد کے فوجی خدمت پر جانے کی صورت میں اس کا کنبہ وسائل حیات سے محروم نہ رہے اور ہتھیار وغیرہ بھی خرید کر تیار رکھے جا سکیں ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا دیوان (دفتر) اسی کی تکمیلی اور ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتا ہے)۔ مدینہ منورہ سے باہر مسلمان مجاہدین کی طلبی کے لیے ان کے قبائلی سردار (شیوخ) ذمہ دار قرار دیے گئے اور وہی مطلوبہ تعداد منتخب کرکے روانہ کرتے ۔ اس کے علاوہ سرکاری خزانے میں بھی ہتھیار، گھوڑے، اونٹ، غلہ اور دیگر جنگی ضرورت کی چیزیں رکھی جاتیں ۔ خبر رسانی کے نظام کو بہت ہی عمدہ بنایا گیا ۔ دشمن کے علاقوں میں افراد مقرر کیے جاتے تھے تاکہ ہر نئی اور خطرے والی خبر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو باخبر رکھیں ۔ خصوصی جاسوس بھی عام طور پر خطرے کے دنوں میں کثرت سے بھیجے جاتے ۔ دوسری طرف اپنی خبروں کو دشمن سے چھپانے کی ممکنہ تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں ۔ خود آپؐ کا طریقۂ جنگ بھی دلچسپ معلومات کا حامل ہے ۔ خندق [رک بآں] سے اہل عرب واقف نہ تھے، اسے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر اختیار کر کے عظیم فائدہ اٹھایا گیا ۔ جنگ خیبر میں دشمن نے منجنیق سے سنگباری کی تھی ۔ ایک ہی سال بعد طائف کے محاصرے میں آپؐ نے منجنیق اور دبابے (زرہ پوش گاڑیاں) استعمال کیں ۔ علم الجو سے ہمیشہ استفادہ کیا جاتا ۔ حملے کے وقت کے لحاظ سے حملے کے لیے دشمن بستی یا پڑاؤ کی ایسی جہت انتخاب کی جاتی کہ ابھرتا ہوا یا ڈھلتا ہوا سورج مسلمان سپاہیوں کی آنکھوں کے سامنے نہ رہے؛ چلنے والی ہوا مسلمانوں کے پیچھے سے چلے، سامنے سے نہیں؛ رات کے سفر میں اونٹوں کے گلے کی گھنٹیاں نکلوا دی جاتیں تاکہ آواز سے دشمن متنبہ نہ ہوجائے ۔ عہد نبوی ہی سے فوج میں طبی امداد کا انتظام نظر آتا ہے ۔ جنگ کے دوران میں مردوں کی قلت کی وجہ سے کھانا پکانے اور تیمار داری کے لیے عورتیں منتخب کی جاتیں ۔ مال غنیمت قبل از اسلام دستِ خود دہان خود کا مصداق تھا ۔ قرآن کریم نے حکم دیا کہ جملہ مال غنیمت کو مرکزی ملکیت سمجھا جائے اور فوج کے تمام لوگ برابر کا حصہ پائیں ۔ چاہے مال جمع کرنے میں انھوں نے حصہ لیا ہو یا کسی فوجی کام میں مشغول رہنے کے باعث انھیں اس کا موقع نہ ملا ہو ۔ اس مال کا پانچواں حصہ (خُمس) مرکزی حکومت کے خزانے میں جمع ہو جو عام رعایا کی بہبود پر خرچ کیا جائے اور باقی غانم فوج میں تقسیم کر دیا جائے [رک بہ انفال]۔ نیز سپہ سالار سے لے کر ادنیٰ سپاہی تک سب کا حصہ یکساں ہو؛ فرق ہو تو صرف اس کا کہ سپاہی کے پاس اس کا اپنا گھوڑا تھا یا یہ کہ وہ پیدل تھا (۸ [انفال] : ۱ تا ۴)۔

مال غنیمت کے سلسلے میں اسیران جنگ کا ذکر ناگزیر ہے ۔ دشمن کی جان اور مال کو نقصان پہنچا سکنا ہر فریق جنگ کے حقوق جنگ میں داخل ہے، لیکن اسیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا، بجز اس کے کہ اسیر نے عہد سابق میں کسی اور قابل سزا جرم کا ارتکاب کیا ہو ۔ اسیروں کو بلامعاوضہ

رہا کرنا، فدیہ لے کر رہا کرنا، اپنے کسی اسیر سے جو دشمن کے قبضہ میں ہو، تبادلہ کرنا، نیز غلام بنا سکنا، عہد نبوی میں ان میں سے ہر ایک کی نظیریں ملتی ہیں۔ غلام بنانا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو قطعی پسند نہ تھا، لیکن اس عالمگیر رواج کو یک طرفہ طور سے منسوخ کرنے میں دشواری یہ تھی کہ مسلمان قیدیوں کو دشمن غلام بنا سکتا تھا۔ اسیروں کو غلام بنانے کی جو دو ایک مثالیں عہد نبوی میں ملتی ہیں (مثلاً بنو المصطلق اور بنو ہوازن) ان میں یہ بھی تحقیق سے ثابت ہے کہ بالآخر غلام آزاد کر دیے گئے تھے (دیکھیے بالا) اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غلامی کا جزئی انسداد کرتے ہوے فرمایا: لَا رِقَّ علیٰ عربی، یعنی کسی عرب کو غلام نہیں بنایا جاسکتا (السرخسی: المبسوط، ۱۰: ۴۰، ۱۱۸؛ وہی مصنف: شرح السیر الکبیر، ۲: ۲۶۵، ۲۶۹)۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے کی بڑی تاکیدیں ہیں؛ اس کے ساتھ ہی غلاموں کو آزاد کرنے کی بھی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، حتّٰی کہ اسے بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے۔ [مختلف گناہوں کا کفارہ مثلاً کفارۂ قتل خطأ (۴ [النساء]: ۹۲)؛ کفارۂ حِنث (۵ [المائدۃ]: ۸۹)؛ کفارۂ ظِہار (۵۸ [المجادلۃ]: ۳) غلام کی آزادی سے ہوتا ہے]۔ زکوٰۃ [رک بآں] جو حکومت کی آمدنی کا ایک حصہ ہے، اس میں سے ہر سال ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کرنے کا قرآن مجید میں حکم ہے اور یہ بھی کہ اگر کوئی غلام اپنی آزادی (مکاتبت) کے لیے کچھ رقم اپنے آقا کو دینے پر آمادہ ہو تو آقا اس سے انکار نہیں کر سکتا، بلکہ اسے مطلوبہ رقم کمانے کی سہولت مہیا کرنے پر بھی مجبور ہے۔ مسلم قیدیوں کو دشمن کی قید سے رہائی دلانا اسلامی حکومت کے خرچ پر ہوتا ہے اور اس میں مسلمان اور ذمی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ علم حرب اور علم قانون دونوں کے نقطۂ نظر سے عہد نبوی کی جنگوں کے متعلق تفصیلوں کے لیے دیکھیے [(حمید اللہ: عہد نبوی کے میدان جنگ، مطبوعہ لاہور؛ نیز رک بہ غزوات].

مالیات: [نیز رک بہ اسلام؛ صدقات؛ زکوٰۃ وغیرہ]؛ مال کو قرآن کریم (۴ [النساء]: ۵) میں زندگی اور اس کی بقا کا وسیلہ قرار دے کر اس کی روز مرہ زندگی میں اہمیت کی طرف ایک جامع اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مال ظاہری اور باطنی احوال پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے آغاز ہی سے آپؐ نے ایسی تدابیر اختیار کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جن کا مقصد اقتصادی و معاشی حالات کو بہتر بنانا تھا؛ چنانچہ ابتدائی مکی دور میں اہل ثروت کو اہل حاجت کی امداد کرنے کا حکم دیا گیا اور اسے مالداروں پر غربا کے حق واجب سے تعبیر کیا گیا (۵۱ [الذاریت]: ۱۹؛ نیز ۷۰ [المعارج]: ۲۴)۔ مدنی دور میں اس میں مزید وسعت پیدا کی گئی اور زر نقد، سونا، چاندی، ریوڑ وغیرہ کی ایک خاص مقدار پر زکوٰۃ [رک بآں] فرض کر دی گئی [مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ابو یوسف: کتاب الخراج؛ ابو عبید: کتاب الاموال، مطبوعہ اسلام آباد، نیز رک بہ علم (معاشیات)؛ مالیات وغیرہ]۔ علاوہ ازیں صنعت و تجارت میں ایمانداری، دیانتداری اور فرض شناسی پر خصوصی زور دیا گیا؛ چنانچہ ایک مستقل سورہ المطففین [رک بآں] میں کم تولنے اور کم ماپنے والوں کی خصوصی مذمت کی گئی۔ اس کے علاوہ معاقل [دیت رک بآں]، جسے موجودہ دور کی اصلاح میں بیمہ [کے مشابہ قرار دیا جا سکتا] ہے، کے نظام کو بہتر بنایا گیا۔ اس طرح قتل خطا کی صورت میں نہ صرف مقتول کے وارثوں کو قابل لحاظ خون بہا ملتا تھا، بلکہ قاتل کی امداد کے لیے بھی اس کے قبیلہ، اس کے خاندان اور بعض صورتوں میں قریہ کے لوگوں کو

شریک تصور کیا جاتا تھا تاکہ اس پر اور اس کے خاندان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے ۔ بعد ازاں یہ سلسلہ ترقی کر گیا اور امداد باھمی کی طرز پر بننے والی یہ انجمنیں مزید فروغ پذیر ہوئیں ؛ اسلام کی سب سے اہم اصلاح جو سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے اختیار کی گئی ، وہ سود کا معاشرے سے مکمل اور غیر مشروط انسداد ہے ۔ اس کے بجاے قرضِ حسنہ کے جذبے کو ابھارا گیا تاکہ ضرورت مند افراد کو بغیر کسی استحصالی صورت کے امداد مل سکے ؛ البتہ ساجھے کے کاروبار [مضاربت رک بآن] کو اس بنا پر بحال رکھا گیا تاکہ ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر و توسیع میں مشترک کوششیں اہم کردار ادا کرتی رہیں ۔ خلافت راشدہ کے دور میں ، باقاعدہ طور پر بیت المال [رک بآن] سے ضرورتمندوں کو قرض حسنہ کےطور پر امداد دی جاتی تھی جو اس کے وظائف سے ششماہی طور پر وصول کر لی جاتی [نیز رک بہ زکوٰۃ ، ربو ، بیت المال ، دیت].

تقویم : عبادات ، یعنی نماز ، روزہ ، زکوٰۃ اور حج میں بھی اور نظم و نسق مملکت میں بھی تقویم اور علم ہیئت کی ہر وقت ضرورت پڑتی ہے ۔ پنجوقتہ نمازوں کے اوقات حرکت شمسی کے تابع ہیں ۔ جمعہ اور عیدین کے لیے ہفتے اور سال کے ایام متعین کرنے کے لیے تقویم کی حاجت ہے ۔ روزوں میں سحری اور افطار کے لیے بھی اس علم کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ حج کا وقت بھی تقویم سے متعین کیا جاتا ہے ۔ زکوٰۃ کا وجوب بھی سال گزرنے پر ہوتا ہے ؛ لہذا اس کے لیے بھی اس علم کی ضرورت ہے .

تقویم کے دو جز ہیں : اسلامی تاریخ (سنہ) کا آغاز کب سے ہو اور مہینوں کا آغاز کہاں سے ؟ عرب میں اگرچہ سال کا آغاز عام طور پر محرم سے تسلیم کیا جاتا تھا ، یعنی حج بیت اللہ کے بعد کے مہینے سے ، لیکن عرب میں سنہ [کے لیے کوئی ضابطہ اور کوئی واقعہ مقرر نہ تھا ؛ چنانچہ مختلف قبائل میں مختلف سنہ رائج تھے ، بلکہ] ایک ہی جگہ بارہا کسی اہم تر واقعے کے وقوع پر قدیم تر نقطۂ توقیت کو ترک بھی کر دیا جاتا تھا ۔ خود مکہ مکرمہ میں متعدد سنہ رائج تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت سے لے کر ہجرت تک عام طور پر ابرھہ کے ہاتھیوں کے حملے کی یاد میں عام الفیل سے وقت شماری ہوتی رہی ۔ مکہ مکرمہ میں یہ سنہ ۸ھ میں اس کے اسلام لانے تک نافذ رہا ۔ لیکن مدینہ منورہ میں آپؐ کے تشریف لانے کے بعد مسلمان ہجرت سے توقیت (وقت شماری) کرنے لگے ، لیکن امام بیہقی (کتاب دلائل النبوۃ) کے مطابق کچھ مہاجرین توقیت کے لیے سنہ کا آغاز اسی سال سے کرتے تھے جس کے آخر میں انھوں نے مدینہ منورہ ہجرت [رک بآن]، شروع کی، [یعنی موجودہ اعتبار سے سنہ ۱ ق ۔ ھ سے]، کچھ اس سال کے آغاز سے جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ماہ ربیع الاول میں مدینہ منورہ تشریف لائے ؛ [اسی صورت کو عہد فاروقی میں صحابہؓ کے مشورہ سے مجموعی طور پر اپنا لیا گیا (رک بہ ہجرت)] اور کچھ اس سال سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آمد مدینہ منورہ کے بعد شروع ہوا (یعنی سنہ ہجری کے ایک سال بعد سے) ۔ آخر حضرت عمرؓ کے زمانے میں یکسانی کا حکم دیا گیا؛ ورنہ اس سے پہلے ایک ہی واقعہ مختلف انداز سے توقیت کےلیے سامنے رکھا جاتا تھا، مثلاً بنوالمصطلق کی جنگ شعبان سنہ ۴ ، ۵ اور ۶ھ تینوں میں بیان کی جاتی ہے ۔ یہ فرق اسی مختلف طریقہ ہاے توقیت کے باعث ہے، ورنہ سب کا مقصد ایک ہی ہے .

قدیم زمانے ہی سے اہل عرب سال کے بارہ مہینوں پر متفق تھے، لیکن انھوں نے جب یہ دیکھا کہ مہینوں کا آغاز اگر چاند کی رؤیت (دیکھنے) سے کیا جائے تو مہینا کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا اور اس طرح سال میں تقریباً ۳۵۴ دن ہوتے

ہیں ؛ اگر موسموں کا تعلق شمسی سال سے ہو تو پھر ۳۶۵ دن ہوتے ہیں اور ان گیارہ دن کے فرق کے باعث بتدریج قمری مہینے کبھی سردی میں اور کبھی گرمی وغیرہ میں ہو جاتے ہیں۔ زراعت کے لیے عربوں نے اَنواء (یعنی بارش کے ستاروں) کا ایک الگ سنہ بنا لیا ، لیکن حج کو ہمیشہ ایک ہی موسم میں لانا مطلوب تھا ، تاکہ موسم حج فصل کے کٹنے وغیرہ کے زمانے میں نہ آنے پائے۔ اس غرض کے لیے خاصے قدیم زمانے سے انہوں نے نسیٔ (یعنی کبیسہ گری) شروع کر دی تھی کہ وقتاً فوقتاً ایک "خالی" یا گمنام مہینے کا سال میں اضافہ کردیتے۔ بعض مؤرخ کہتے ہیں کہ یہ ہر سال ہوتا ، بعض کے مطابق ہر دو سال بعد ، بعض کے مطابق ہر تین سال بعد ، اور بعض کے مطابق حسب ضرورت ہوتا، جس سے کبھی ایک سال کا ، کبھی دو سال کا اور کبھی تین سال کا وقفہ ہو کر سال تیرہ مہینوں کا شمار کیا جاتا۔ غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ اس سے سارے اختلافات رفع ہو جاتے اور سب بیانوں کی تطبیق بھی ہو جاتی ہے (اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حمید اللہ : مقالہ نسیٔ درجرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، جنوری و اکتوبر ۱۹۶۸ء ؛ اسلامک ریویو، ووکنگ ، فروری ۱۹۶۹ء)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے وفات سے تین ماہ قبل خطبہ حجۃ الوداع میں قرآن کریم (۹ [التوبۃ] : ۳۷) کے اس حکم کا اعادہ کیا، جس میں اس رسم بد کی منسوخی کا اعلان کیا گیا ہے؛ تب سے خالص قمری سال مسلمانوں میں رائج ہے۔

تقویم کی اصلاح اور قمری سنہ کے رائج کرنے میں کئی مصلحتیں ملحوظ نظر آتی ہیں۔ اولاً دینی احتیاج ہے۔ سابق شمسی یا کبیسہ والے حساب میں مثلاً رمضان المبارک ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا۔ فرض کیجیے کہ وہ دسمبر کے مطابق ہے۔ یہ مہینا خط استوا کے شمال کے علاقوں میں سردی کا موسم ہے اور خط استوا کے جنوب میں وہی زمانہ گرمی کا ہے۔ منطقہ بارده والوں کے لیے گرمی کا موسم خوشگوار ہوتا ہے اور سردیاں تکلیف دہ ہوتی ہیں تو منطقہ حارہ میں گرمیاں بار خاطر ہوتی ہیں اور ساری عمر اگر رمضان بعض ملکوں میں خوشگوار اور بعض ملکوں میں ناقابل برداشت موسم میں آتا رہے تو یہ دین حنیف کی طرف سے ان لوگوں پر بہت نا انصافی ہوتی۔ اس کے برخلاف ساری ہی دنیا میں رمضان بدل بدل کر بہار ، سرما ، خزاں اور گرما میں آتا رہے ، تو فطرت کی غیر تغیر پذیری کے باوجود سب ہی کو کبھی سہولت اور کبھی زحمت تو ہو، لیکن شکایت اور دلشکنی کا موقع کسی کو نہ ہو اور ضمناً فائدہ یہ بھی ہے کہ دین کا دفاع کرنے والی مسلمان فوج کو ہر قسم کے موسموں میں بھوکے پیاسے رہنے کی تربیت ملتی رہے۔

ثانیاً اس کے مالی اور اداری فائدے بھی ہیں۔ ہجری تقویم کے باعث تینتیس شمسی سال میں چونتیس قمری سال ہوتے ہیں۔ یعنی ۳۳ شمسی سالوں میں محکمہ مالیہ تقریباً ۳۴ مرتبہ محاصل اس طرح وصول کرتا ہے کہ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ کوئی ماہر اقتصادیات اس تدبیر کو برا نہیں کہہ سکتا۔ اس میں شک نہیں ملازمین کی ماہانہ تنخواہیں بھی (۳۳×۱۲) ۳۹۶ کی جگہ (۳۴×۱۲=) ۴۰۸ مرتبہ دینی پڑتی ہیں، لیکن حکومت کی ساری آمدنی چونکہ تنخواہوں پر صرف نہیں ہوتی، بلکہ رفاہ عامہ کے لیے بھی خاصی رقم بچ رہتی ہے ، اس لیے اس تقویمی اصلاح سے محکمہ مالیہ کی منفعت بھی مقصود ہے۔ ضمناً یہ مصلحت بھی ہے کہ عام طور پر مالی سال کے آخر میں حکومت کے خزانے خالی ہو جاتے ہیں اور نئے محاصل کی آمد تک روز مرہ کے اخراجات کے لیے حکومت کو خاصی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور عام طور پر مختصر مدت والے ڈبنچر جاری کر کے مغربی حکومتیں سود پر قرض لیتی

ہیں ۔ اسلامی نظام میں محصولوں کی وصولی کے دو مختلف اوقات رکھے گئے ہیں ۔ زراعتی مالگزاری شمسی حساب سے ، اور دیگر محاصل قمری حساب سے ؛ اس لیے حکومت کی تھیلیاں کبھی خالی نہیں ہو سکتیں ۔ اگر اتفاق سے کبھی شمسی اور قمری سال دونوں بیک وقت شروع ہوں تو ان کا اتفاق ایک سال سے زیادہ کے لیے نہیں ہوتا ، بلکہ تیس بتیس سال تک دونوں سالوں میں دوری ہی رہتی ہے ۔

ایک عالمگیر اور ابدی دین کے لیے مقامات کے اعتبار سے دنوں کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی گتھی کا حل بتانا ناگزیر تھا ؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک قول کے ضمن میں اس کا حل تجویز فرمایا جو صحیح مسلم وغیرہ میں ہے ۔ آپؐ نے فرمایا : جب دجال آئے گا تو وہ دنیا میں چالیس دن رہے گا، جس میں کا پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا ؛ دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ؛ تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر اور باقی ۳۷ دن تمہارے موجودہ دنوں جیسے ۔ کسی صحابیؓ نے عرض کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ! اس سال بھر کے لمبے دن میں کیا صرف ایک دن کی نمازیں پڑھنی کافی ہوں گی ؟ فرمایا : نہیں، بلکہ حساب کرو ۔ ایک سال کے برابر لمبا دن ۹۰ درجہ عرض بلد پر ہوتا ہے ۔ ایک مہینے کے برابر لمبا دن سال کے ایک معین مہینے میں تقریباً ۶۷ درجہ پر اور ایک ہفتے کے برابر لمبا دن ۶۵ درجہ پر ہوتا ہے ۔ چنانچہ مسلم فقہا نے اس پر قیاس کرکے یہ استنباط کیا ہے کہ فنلینڈ ، روس اور کینیڈا میں نماز روزے کے اوقات کے لیے اس حدیث دجال پر قیاس کرنا چاہیے ۔ البتہ ایک صورت غیر واضح رہی وہ یہ کہ ۶۶ تا ۹۰ درجے کے طول بلد پر رہنے والے کس طرح نمازیں پڑھیں ؟ مجلس علمائے دکن نے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اتفاق رائے سے تجویز کیا کہ ۴۵ درجہ عرض بلد کے اوقات طلوع و غروب ہی قطب تک کے تمام علاقوں میں سال بھر تک زیر عمل رہیں ، اس وقت بھی جب آفتاب مسلسل کئی دن تک نہ ڈوبے اور اس وقت بھی جب مثلاً ساڑھے تیئیس گھنٹے کا دن اور آدھ گھنٹے کی رات ہو ۔ اس نقطۂ زمین، یعنی ۴۵ درجہ کے انتخاب میں اس واقعے کو مد نظر رکھا ہے کہ عہد صحابہؓ میں مسلمان اس مقام تک پہنچ گئے تھے اور حرکت شمسی ہی کو نماز روزے میں ملحوظ رکھتے تھے ۔ آج بھی خط استوا سے ۴۵ درجہ تک کے علاقوں میں جو مسلمان ہیں انہیں اپنی پرانی عادتوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں ۔ رعایت شمالی یورپ اور شمالی امریکہ ، نیز جنوبی چلی اور جنوبی ارجنٹائن کے ایسے علاقوں میں ملے گی جہاں اسلام ہنوز نو وارد ہے ۔ مزید برآں ۴۵ درجہ شمالی اور ۴۵ درجہ جنوبی کے معنی اگرچہ نظریہ کی حد تک نصف کرہ ارض کے ہوتے ہیں، لیکن در اصل اس میں تین چوتھائی سے زیادہ معمور حصہ زمین شامل ہے ۔

دین میں یُسر و عُسر کا مسئلہ : قرآن کریم میں ارشاد باری ہے : یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲ [البقرۃ] : ۱۸۵) ، یعنی خدا تمہارے لیے سہولت چاہتا ہے ، دشواری نہیں چاہتا ۔ یہ اصول ہر اسلامی حکم میں کارفرما ہے ؛ عہد نبوی کے معاشرے کے لیے بھی اور ہمارے عصر حاضر کے حالات کے لیے بھی ۔ [ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسی اصول کی وضاحت کرتے ان دو مبلّغوں کو ، جنھیں ایک قبیلے کی طرف دعوت و تبلیغ کے لیے بھیجا جا رہا تھا ، ارشاد فرمایا : یَسِّرَا و لا تُعَسِّرَا یعنی تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ، دشواری پیدا نہ کرنا ۔ اسی بنا پر اسلامی احکام کی تعمیل و تکمیل کو بقدر استطاعت (۲ [البقرۃ] : ۲۸۶) سے مشروط فرمایا اور ہر اسلامی حکم میں اہل عذر کے لیے استثنائی احکام خود بیان فرمائے ، مثلاً پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی سے تیمم [رگڑ بان] کرنے کا حکم ؛ سفر میں

قصر صلوٰۃ (۴ [النساء] : ۱۰۲) کا حکم ؛ حالت سفر و مرض میں روزے قضا کر لینے کی رخصت (۲ [البقرۃ] : ۱۸۳)؛ حائضہ و نفساء کے لیے نماز کی معافی وغیرہ (نیز رک بہ صلوٰۃ ، روزہ ، حج وغیرہ)] .

اسلام اور مسائل نسواں : دور جاہلی میں عورت کو کمتر درجہ حاصل تھا ۔ معاشرے میں اسے کوئی سماجی اور اقتصادی حقوق حاصل نہ تھے ۔ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج بھی موجود تھا ۔ عام تصور میں مرد کو تمام معاشرتی و سماجی حقوق حاصل تھے ۔ اسلام نے ان تمام بے ضابطگیوں کی اصلاح کی ؛ چنانچہ بعض استثنائی صورتوں کے سوا ان کو یکساں حقوق و مراعات دیے گئے ۔ جہاں مردوں کو عورتوں پر قوامون (الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (۴ [النساء] : ۳۴) ، قرار دیا، وہاں عورتوں کے بھی مردوں پر واضح حقوق و فرائض مقرر فرمائے : وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲ [البقرۃ] : ۲۲۸)؛ اسلامی احکام و فرائض کی تعمیل میں دونوں کو برابر کا ذمہ دار ٹھیرایا اور افضلیت کا دار و مدار تقوٰی [رک بآں] پر رکھا، نہ کہ جنسی تقسیم پر (۴۹ [الحجرات] : ۱۳) ؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کہ کر خواتین کی مزید حوصلہ افزائی فرمائی : الجنۃُ تحتَ اَقدامِ الاُمہات (النسائی : سنن)؛ اسلام میں عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے ؛ اسی مقصد کے پیش نظر عورتوں اور مردوں کو نگاہ نیچی رکھکر چلنے اور ان کے آزادانہ اختلاط کو سختی سے منع کیا گیا ہے (۲۴ [النور] : ۳۰، ۳۱) ۔ عورت کی عزت و حرمت کو بحال رکھنے کے لیے حجاب [رک بآں] کا حکم نازل ہوا (۲۴ [الاحزاب] : ۶۰)۔ کسی پاکدامن عورت پر جھوٹی تہمت (قذف) لگانے والے کو ۸۰ دروں کی سزا کا مستحق قرار دیا گیا (۲۴ [النور] : ۴) ۔ زنا کے انسداد کے لیے ، غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اورشادی شدہ کے لیے رجم [رک بآں] حد کے طور پر مقرر کیا (۲۴ [النور] : ۲) ۔ عورت کو ایسا لباس پہننے کا حکم دیا گیا جو اس کے جسمانی حسن و جمال کو ظاہر کرنے کے بجائے اسے اجنبی آنکھوں سے مستور کرتا ہو ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی جو اس قسم کا تنگ یا باریک لباس پہنتی ہیں جس سے ان کی جسمانی آرائش و زیبائش کا اظہار ہوتا ہو .

اسلام سے قبل عورت کو حق وراثت سے محروم تصور کیا جاتا تھا۔ اسلام نے پہلی دفعہ اسے وراثت میں حصہ دار بنایا (۴ [النساء] : ۷ ، ۱۱ تا ۱۲ ؛ نیز کتب تفسیر بذیل آیات مذکورہ [رک بہ وراثت]) اور عورت کی الگ ملکیت کا تصور قائم کیا تاکہ وہ معاشرے میں باوقار مقام حاصل کر سکے ۔ سب سے اہم اصلاح نکاح کے معاملے میں کی گئی اور وہ یہ کہ مرد کی طرح عورت کو بھی اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ تعلیم بھی دی کہ وہ والدین کی مرضی سے باہر نہ ہو [رک بہ نکاح] ۔ اسلام سے قبل بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی ۔ لوگ لا تعداد بیویاں اپنے گھروں میں رکھ چھوڑتے تھے (دیکھیے Encyclopaedia Britannica، بذیل مادہ)۔ اسلام نے اس کی ایک خاص تعداد یعنی چار مقرر فرما دی (۴ [النساء] : ۳) ، مگر اس میں یہ شرط رکھی کہ ایسا اسی صورت میں کیا جائے جبکہ مرد اپنی ہر بیوی سے معاملے ، سلوک ، مروت ، احسان اور محبت میں مساوات قائم رکھ سکتا ہو؛ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایک ہی کافی ہے (۴ [النساء] : ۱۲۹) ۔ گویا تعدد ازواج کو مخصوص حالات اور مخصوص شرائط کی موجودگی میں چار کی تعداد تک محدود کرکے ایک طرف تو عورتوں کو بھی ان کے جائز حق سے محروم نہیں کیا اور دوسری طرف مسلم معاشرے کو پاکبازی کی خوش گوار اور پر سکون زندگی اختیار

کرنے کے ایک عمدہ طریقے کی تعلیم دی ۔

ازواج مطہرات : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم صرف مردوں ہی کے مبلّغ اور معلّم نہ تھے، بلکہ آپؐ عورتوں کے بھی محسن اور مربی تھے ۔ عورتوں کو ان کے نازک مسائل کی براہ راست تعلیم دینا نہ صرف نامناسب تھا بلکہ پیکر شرم و حیا صنف نازک کو قطعی طور پر ان کی تعلیم سے باز رکھنے کے مترادف بھی ہو سکتا تھا ۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خصوصی اجازت خداوندی سے متعدد نکاح فرمائے (۳۳ [الاحزاب] : ۵۰) تا کہ عورتیں عورتوں سے بہتر طور پر مسائل سیکھ سکیں ۔ اسی بنا پر تنہا حضرت عائشہؓ کے متعلق منقول ہے کہ ان سے ایک تہائی دین نقل ہوا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے سید سلیمان ندوی : سیرت عائشہ)۔ اس کے علاوہ مختلف قبائل عرب کی اس کے ذریعے تالیف قلب بھی مقصود تھی ۔ اس امر کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ آپؐ نے اپنی جوانی کے بہترین ایام صرف ایک بیوی یعنی حضرت خدیجہؓ کی رفاقت میں گزار دیے ، جبکہ ۵۰ اور ۵۹ برس کی عمر کے درمیان آپؐ نے زیادہ تر نکاح فرمائے ۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپؐ کو دنیاوی فائدوں سے زیادہ دینی فائدے مقصود تھے ؛ کیونکہ آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے : مَالی فی النساء من حاجۃ (الدّارمی) ، یعنی مجھے عورتوں کی کوئی خواہش نہیں ہے ۔

بہر حال آپؐ نے مختلف اوقات میں گیارہ ازواج مطہرات سے نکاح فرمایا، جن میں سوائے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے باقی تمام بیوہ تھیں ۔ آپؐ کے نکاح میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ نو بیویاں رہیں ۔ تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) حضرت خَدیجۃ الکبریٰؓ بنت خُوَیلد : آپؐ نے ۲۵ سال کی عمر میں ان سے نکاح فرمایا ، جبکہ حضرت خدیجہؓ کی عمر ۴۰ سال تھی (البلاذری : الانساب) ۔ ان کی وفات ۱۰ نبوی ۵۰ عمری (۳ ق ۔ ھ/ ۶۱۹ء) میں ہوئی (ابن الجوزی: الوفا باحوال المصطفی، ص ۶۴۶ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء [نیز رک بآں] ؛ (۲) حضرت سَودہؓ بنت زَمْعَہ ؛ رمضان المبارک ۱۰ نبوی (۵۰ عمری) میں نکاح ہوا ۔ ان کے سال وفات میں مختلف روایات ہیں مثلاً ۲۳ھ اور حضرت عمرؓ بن الخطاب نے نماز جنازہ پڑھائی (البلاذری : انساب الاشراف، ۱ : ۴۰۷)؛ ۵۴ھ (الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۲ : ۱۹۱) [نیز رک بآں] ؛ (۳) حضرت عائشہ صدیقہؓ، ۱۰ نبوی (۵۰ عمری) میں نکاح ہوا اور شوال المکرم ۲ھ میں ان کی رخصتی عمل میں آئی ۔ اس وقت ان کی عمر ۹ سال تھی ۔ ۵۸ھ میں بعمر ۶۶ سال انتقال فرمایا ۔ جنت البقیع میں مدفون ہیں (انساب الاشراف، ۲ : ۴۱۱، جوامع السیرۃ، ۳۳) [نیز رک بآں]؛ (۴) حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ : رمضان المبارک ۳ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نکاح ہوا (انساب الاشراف ، ۱ : ۴۲۲ ؛ ابن حجر : فتح الباری ، ۹ : ۱۶۲ ببعد) ۔ ۴۵ھ میں ان کا وصال ہوا (انساب، ۱ : ۴۲۷ ؛ جوامع السیرۃ، ۳۳) ؛ [نیز رک بآں] ؛ (۵) حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ ، ۴ھ میں آپؐ سے نکاح ہوا ۔ ۸۴ سال کی عمر ۵۹ھ یا ۶۱ھ میں انتقال فرمایا (انساب ، ۱ : ۴۳۲ ؛ جوامع السیرۃ ، ۳۳ ؛ الذہبی ، سیر اعلام النبلاء، ۲ : ۱۴۸)، [نیز رک بآں] ؛ (۶) حضرت زینبؓ بنت جحش، ۵ھ میں نکاح ہوا اور ۵۳ سال کی عمر میں ۲۰ھ میں انتقال فرمایا (کتب مذکورہ) [نیز رک بآں] ؛ (۷) حضرت جویرہؓ بنت الحارث بن ابی ضرار؛ غزوہ مریسیع میں گرفتار ہوکر آئیں ۔ آپؐ نے ۵ھ میں ان کو آزاد فرما کر نکاح کر لیا ۔ ۵۶ھ میں انتقال فرمایا جوامع السیرۃ، ص ۳۵)، [نیز رک بآں] ؛ (۸) حضرت زینبؓ ام المساکین بنت خزیمہ ، ۳ھ میں نکاح ہوا ۔ دو ماہ آپؐ کے نکاح میں رہنے کے بعد ۳۰ سال کی عمر میں وفات پا گئیں (کتاب مذکور ، ص ۳۳)

[نیز رک بآں] ؛ (۹) حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان: ۶ یا ۷ھ میں نکاح ہوا ، ۴۴ھ میں وفات پائی (انساب الاشراف، ۱ : ۴۴۰) ، [نیز رک بآں] ؛ (۱۰) حضرت میمونہؓ بنت الحارث : ۷ھ میں نکاح ہوا اور ۶۱ھ میں اور بقول بعض ۵۱ھ میں وصال ہوا (انساب الاشراف ۱: ۴۴۶؛ سیر اعلام النبلاء ، ۲ : ۱۷۴؛ جوامع السیرۃ، ص ۳۶)، [نیز رک بآں]؛ (۱۱) حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب : ۷ھ میں نکاح ہوا ؛ ۵۰ھ میں وفات ہوئی (انساب ، ۱ : ۴۴۴)، [نیز رک بآں] ؛ اس کے علاوہ مصری باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی ۶ھ میں آپؐ کے حرم میں بطور ام ولد کے آئیں اور ان سے آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوے .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ تمام ازواج مطہرات نہایت اعلیٰ درجہ کی عابدہ و زاہدہ اور عالمہ خواتین تھیں ۔ ان میں سے ہر ایک سے متعدد روایات منقول ہیں ۔ سب سے زیادہ احادیث حضرت عائشہؓ سے منقول ہیں (۲۲۱۰ احادیث)؛ ان سے کم حضرت ام سلمہؓ سے (۳۷۸ احادیث) ؛ ان سے کم حضرت میمونہؓ سے (۷۶ احادیث) ؛ پھر حضرت ام حبیبہ سے (۶۵ احادیث) منقول ہیں (ابن حزم : جوامع السیرۃ، ۲۷۵ تا ۳۱۵)۔ ابن حزم نے ہی حضرت عائشہؓ ، حضرت ام حبیبہؓ ، حضرت ام سلمہؓ ، حضرت حفصہؓ کو اصحاب فتوی فقیہ افراد میں شمار کیا ہے (۳۱۹ تا ۳۳۵)؛ (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: السہیلی : روض الانف ، ۲ : ۳۶۶ ؛ البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۳۱۶ تا ۴۵۴ ببعد ؛ الزرقانی : شرح المواہب ، ۳ : ۲۱۶ تا ۲۵۵) .

اولاد و احفاد : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیادہ تر اولاد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی ، البتہ ایک بیٹے کی پیدائش حضرت ماریہ قبطیہؓ (ام ولد) سے ہونا ثابت ہے ۔ تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) حضرت قاسم : ۱۱ ق از نبوی میں پیدا ہوے ۔ حضرت مجاہدؒ تابعی کے نزدیک سات دن اور ابن سعد (الطبقات ، ۱ : ۱۳۱) کے مطابق دو سال تک حیات رہے ۔ آپؐ کی کنیت ابوالقاسم انھیں سے منسوب ہے ؛ (۲) حضرت زینبؓ : تقریباً ۲۳ ق ھ/۶۰۰ء - ۶۰۱ء میں پیدا ہوئیں ۔ ان کا نکاح ابوالعاص بن ربیع سے ہوا ۔ ۸ھ میں انتقال فرمایا؛ ان سے دو اولادیں ہوئیں ۔ امامہؓ اور علیؓ، مؤخر الذکر بچپن ہی میں فوت ہوگئے، جبکہ حضرت امامہؓ حد بلوغ کو پہنچیں اور حضرت فاطمہؓ کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں ۔ ان کے بعد حضرت مغیرہؓ نے ان سے نکاح کیا (ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۳۱ تا ۳۶) ؛ (۳) حضرت رقیہؓ : حضرت زینبؓ کے بعد پیدا ہوئیں ۔ ان کا نکاح عہد نبوت سے قبل عقبہ بن ابی لہب سے ہوا ، مگر اس نے اپنے باپ ابو لہب [رک بآں] کے کہنے پر رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی ؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت عثمانؓ بن عفان [رک بآں] سے کر دیا ۔ ان سے حضرت عبداللہؓ (بن عثمان) پیدا ہوے جو دو سال کی عمر میں انتقال کر گئے ۔ رمضان المبارک ۲ھ میں ان کا انتقال ہوا (ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۳۶ تا ۳۷) ؛ (۴) حضرت ام کلثومؓ : حضرت رقیہؓ سے چھوٹی اور حضرت فاطمہؓ سے بڑی تھیں ۔ ان کا نکاح آپؐ نے عتبہ بن ابی لہب سے کیا تھا ، مگر اس نے بھی اپنے بھائی کی طرح رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی ۔ آپؐ نے حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد شوال ۳ھ میں ان کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا ۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ وفات شعبان ۹ھ میں ہوئی (حوالۂ مذکور، ۲۷ ببعد)؛ (۵) حضرت فاطمۃالزہراءؓ : نبوت سے پانچ سال پہلے (۳۵ عمری) میں پیدا ہوئیں ۔ تمام اولاد میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سب سے زیادہ پیاری تھیں ۔ ۲ھ میں آپؐ نے ان کا نکاح حضرت علیؓ [رک بآں]

سے کر دیا ۔ ان سے حضرت علیؓ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں کل پانچ بچے پیدا ہوئے : حضرت حسنؓ (م ۵۹ھ)؛ حضرت حسینؓ (ش ۶۱ھ)؛ حضرت محسنؓ؛ حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ۔ حضرت زینبؓ کی پہلی شادی حضرت عبداللہؓ بن جعفر سے اور حضرت ام کلثومؓ کی حضرت عمرفاروقؓ سے ہوئی ، مگر حضرت فاطمہؓ کی نسل صرف حضرت حسنؓ [رکّ بآں] اور حضرت حسینؓ [رکّ بآں] کے ذریعے دنیا میں باقی رہی (البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۴۰۲ تا ۴۰۵) ؛ ابن سعد : الطبقات، ۸ : ۱۹ تا ۳۰ ؛ ابن العماد الحنبلی : شذرات، ۱ : بمدد اشاریہ) ؛ (۶) حضرت ابراہیمؓ : حضرت ابراہیمؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ام ولد حضرت ماریہؓ قبطیہ کے بطن سے ۸ھ میں پیدا ہوئے ۔ ابو سیف اور ام سیف ان کے رضاعی والد اور والدہ تھے ڈیڑھ سال کی عمر پا کر ۸ھ میں فوت ہوگئے (شذرات ، ۱ : ۱۲ تا ۱۳) .

ابن سعد نے مزید دو صاحبزادوں یعنی ، حضرت طیبؓ اور حضرت (عبداللہ) طاہرؓ کے نام بھی گنوائے ہیں جو زمانہ اسلام میں پیدا ہوئے اور مکہ مکرمہ ہی میں انتقال فرما گئے۔ (الطبقات ، ۱ : ۱۳۳ تا ۱۳۴)] .

مآخذ : (۱) قرآن کریم ، بمواضع کثیرہ ؛ کتب تفسیر : (۲) ابن جریر الطبری (م ۶۷۱) : تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن ، بولاق ۱۳۲۲ء تا ۱۳۳۰ھ ؛ (۳) ابن کثیر : تفسیر ، مطبوعہ قاہرہ ؛ (۴) البیضاوی : انوار التنزیل و اسرار التاویل ، مطبوعہ قاہرہ ، ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۰ء؛ (۵) ابن عباس (م ۶۸ھ) : تفسیر، مطبوعۂ بولاق ؛ کتب حدیث : (۶) محمد بن اسماعیل البخاری : الجامع الصحیح، مطبوعہ لائیڈن (بدون تاریخ) (۴ جلدیں) ؛ (۷) مسلم النیسابوری : الصحیح ، قاہرہ ۱۳۳۰ھ ؛ (۸) ابوعیسیٰ الترمذی (م ۲۷۹) : الجامع السنن، بولاق ۱۲۹۲ھ ، ۲ جلدیں ؛ نیز شمائل ترمذی ؛ (۹) ابو داؤد : السنن ، دہلی ۱۳۸۳ھ ، ۲ جلدیں ؛ (۱۰) ابن ماجہ : السنن ، طبع محمد فؤاد عبدالباقی ، قاہرہ، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء ؛ (۱۱) الدار قطنی : السنن، دہلی ۱۳۱۰ھ ؛ (۱۲) النسائی : السنن ، دہلی ۱۸۹۱ء ، ۲ جلدیں ؛ (۱۳) الدارمی : الجامع الصحیح المعروف بہ مسند دارمی ، کانپور ۱۲۹۳ھ ؛ (۱۴) محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدہ، بار سوم ، بیروت ۱۹۶۹ء ؛ (۱۵) A. J. Wensinck : المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبویہ ، مطبوعہ لائیڈن ۱۹۵۵ء ؛ (۱۶) ہمام بن منبہ : صحیفہ ؛ (۱۷) معمر بن راشد : جامع ؛ (۱۸) عبدالرزاق : مصنف ؛ (۱۹) احمد بن حنبل : مسند ، قاہرہ ۱۳۱۳ھ ، ۶ جلدیں ؛ (۲۰) امام مالک : موطأ، دہلی ۱۲۱۶ھ ؛ (۲۱) الطبرانی : المعجم الصغیر ، دہلی ۱۳۱۱ھ ؛ (۲۲) ابن ابی شیبہ : مصنف ؛ کتب سیر و مغازی : (۲۳) ابن اسحٰق : المبدأ والمغازی (مخطوطہ ، فرانس و دمشق) ؛ (۲۴) الواقدی : کتاب المغازی ، طبع Marsden Jones ، لندن ۱۹۶۶ء ، ۳ جلدیں ؛ (۲۵) ابن سعد : کتاب الطبقات الکبیر، مطبوعہ بیروت ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء ، ۸ جلدیں ؛ (۲۶) ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفیٰ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء ؛ (۲۷) علی بن برہان الدین (م ۹۷۰ھ/۱۵۴۴ء) : انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ، الشہیر، بسیرۃ الحلبیہ ، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء ؛ (۲۸) احمد بن یحیی بن جابر البلاذری: انساب الاشراف ، مطبوعہ بیت المقدس، ۱۹۳۶ء ، جلد اول؛ (۲۹) القسطلانی : المواہب اللدنیہ بمع الزرقانی : شرح المواہب اللدنیہ ، ۸ جلدیں ، قاہرہ ۱۳۲۸ء ؛ (۳۰) ابن ہشام : السیرۃ النبویہ ، طبع مصطفی السقا ، ابراہیم الانباری و عبدالحفیظ شلبی ، قاہرہ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۶ء ، ۴ جلدیں ، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۵ھ ؛ (۳۱) احمد زینی دحلان : السیرۃ المحمدیہ ؛ (۳۲) کرامت علی : السیرۃ المحمدیہ والطریقۃ الاحمدیہ، مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۰ھ؛ (۳۳) المقریزی : امتاع الاسماع ، ۱ جلد ، مطبوعہ (باقی مخطوطہ) ؛ (۳۴) ابن حزم : جوامع السیرۃ ، مطبوعہ قاہرہ

۱۳۲۵ھ ؛ (۳۵) محمد بن یوسف الشامی : السیرۃ الشامیہ؛ (۳۶) الازرقی : اخبار مکہ ، ۱۸۵۸ء طبع باعتناء Wüstenfeld ؛ (۳۷) السمہودی : خلاصۃ الوفا فی اخبار دار المصطفی، مطبوعہ بولاق ۱۲۸۵ھ ؛ کتب تاریخ: (۳۸) الطبری : تاریخ الامم والملوک ، مطبوعہ لائیڈن ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۱ ؛ (۳۹) ابن کثیر : البدایہ والنہایہ ؛ (۴۰) الیعقوبی : تاریخ ، مطبوعہ بیروت ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء؛ (۴۱) ابن الاثیر : تاریخ الکامل، لائیڈن ۱۸۵۱ء تا ۱۸۷۱ء؛ (۴۲) الذہبی : دول الاسلام ، حیدر آباد ۱۳۳۳ھ ، ۲ مجلدات ؛ عام کتب معارف : (۴۳) ابن قتیبہ الدینوری : عیون الاخبار ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۰۷ء ؛ (۴۴) المسعودی : التنبیہ والاشراف ، طبع ڈی خویہ ، لائیڈن ۱۸۹۳ء ؛ (۴۵) عبدالحی الکتانی : نظام الحکومۃ النبویہ ، المسمی بالترتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمتاجر والحالۃ العلمیہ ، التی کانت علی عہدالمدینۃ الاسلامیہ فی المدینۃ المنورۃ العلیہ، مطبوعہ فاس، ۲ جلدیں؛ (۴۶) السرخسی : شرح السیرالکبیر، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۴ جلدیں؛ (۴۶) ابن العماد الحنبلی: شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۰ھ، جلد اول؛ کتب اردو: (۴۷) شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی: سیرۃ النبی ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۷۱ھ، ۶ جلدیں ؛ (۴۸) قاضی سلیمان سلمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۳ جلدیں، مطبوعہ لاہور، تاریخ ندارد؛ (۴۹) محمد حمید اللہ: عہد نبوی کا نظام حکمرانی ، حیدر آباد دکن ؛ (۵۰) وہی مصنف : عہد نبوی کے میدان جنگ ، مطبوعہ با تصویر ، حیدر آباد دکن : (۵۱) محمد ادریس کاندھلوی : سیرۃ المصطفی ، مطبوعہ لاہور ۱۳۸۱ھ ؛ یورپین زبانوں میں موجودہ صدی کے مجلات میں شائع شدہ مقالوں کے لیے: (۵۲) Pearson : *Index Islāmicus* ؛ عام علمی کتابوں کے لیے : (۵۳) Pfanmüller : *Handbuch der Islam-Literatur* ؛ (۵۴) Chauvin : *Bibliographie des ouvrages arabes ou relatifs aux Arabes* ؛ (۵۵) Sauvaget : *Introduction a l'histoire de l'Orient musulman* ، (متعلقہ فصلیں)؛ یورپی مصنفین کی قدیم کتب سیرت میں اس قدر ایجاد واختراع اور اتنی گالی گلوچ ہے کہ ان پر جدید مؤلفین کو شرم آتی ہے ؛ (۵۶) William Muir : *Life of Muhammad* ؛ (۵۷) W.Montgomery Watt : *Muhammad at Mecca*؛ (۵۸) وہی مصنف : *Muhammad at Medina* ؛ (۵۹) وہی مصنف : *Muhammad Prophet and Statesman* ؛ (۶۰) M. Gaudefroy-Demombynes : *Mahomet* ، پیرس ۱۹۵۷ء ؛ (۶۱) Muhammad Hamidullah : *Muhammad Rasulullah* ، حیدرآباد دکن ، ۱۹۷۴ء ، کراچی ۱۹۷۹ء ؛ (۶۲) وہی مصنف : *Le prophete de l' Islam (sa vie et son oeuvre)* ، پیرس ۱۹۵۹ء ؛ (۶۳) Alois Sprenger : *Das Leben und die Lehre des Mohammad* ، ۳ جلدیں، ۱۸۶۱ء ؛ (۶۴) G. Weil : *Muhammad der Prophet* ، ۱۸۴۳ء ؛ (۶۵) Franz Buhl : *Das Leben Muhammeds* ، جرمن ترجمہ از Shaeder ، ۱۹۳۰ء ؛ (۶۶) J. Wellhausen : *Skizzen und vorarbeiten, Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit* ؛ (۶۷) L. Caetani : *Annali de l'Islam* ، میلان ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۶ء .

(محمد حمید اللہ [و ادارہ])

تعلیقات : شمائل و اخلاق نبوی :

(الف) حلیۂ اقدس: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا جسم اطہر متناسب ، جوڑ بند مضبوط ، بدن پُرگوشت اور کسا ہوا اور رنگ مبارک سرخی مائل سفید تھا (الترمذی : شمائل ، عن انس رض) ۔ آپ ص نہ تو بہت طویل القامت (الطویل البائن) تھے اور نہ چھوٹے قد کے (القصیر المتردد) ۔ آپ ص کا جسم مبارک میانہ تھا ۔ آپ ص کے قدرے بھاری سر (ضخم الراس) پر گھنے بال ، جو بعض اوقات کانوں کی لوؤں کو چھو رہے ہوتے (حوالۂ مذکور عن براء بن عازب)، نہ تو بہت گھنگھریالے تھے نہ بہت سیدھے ، البتہ ایک خوشنما اور ہلکا سا خم ان میں دکھائی دیتا

تھا (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۳) - چہرۂ مبارک آفتابی ، پر شکوہ اور درخشاں و تاباں تھا - پیشانی کشادہ اور پر نور تھی ، جس میں سے ایک نور ابھرتا دکھائی دیتا (کتاب مذکور، ص ۳۹۱ ببعد) - ابرو دراز ، سیاہ اور بیچ میں ذرا سے غیر پیوستہ اور ان کے درمیان ایک رگ کا معمولی سا ابھار تھا، جو غصے کی حالت میں مزید نمایاں ہو جاتا تھا (شمائل عن ہند بن ہالہ) - آنکھیں سیاہ مگر سرمئی مائل (اکحل و لیس باکحل) ، پتلیاں سیاہ کالی اور آنکھوں کی سفیدی میں ہلکی سی سرخی کی آمیزش تھی (حوالۂ مذکور) ، پلکیں سیاہ اور دراز ، گویا کہ ایک دوسری کو چھو رہی ہوں (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۱۰ تا ۴۱۱ ببعد) - ناک ستواں اور بڑی تھی اور رخسار متوازی (سہل الخدین) ، ریش مبارک گھنی اور بہت دیدہ زیب تھی - دہن مبارک کشادہ اور سامنے کے دانتوں میں ذرا سا فاصلہ نمایاں تھا (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۰) - کان حسین و جمیل (تام الاذنین) اور شانے پُرگوشت اور چوڑے تھے - گردن مبارک قدرے لمبی تھی - سینہ کشادہ تھا - کلائیوں، بازوؤں اور بالائی سینے پر بالوں کی کثرت تھی ، مگر پیٹ اور سینے کا نچلا حصہ بالوں سے خالی تھا ، البتہ سینے سے ناف تک بالوں کی ایک پتلی اور لمبی دھار (اجرد طویل السرہ) تھی - دونوں شانوں کے مابین "مہر نبوت" تھی، جو بالوں اور گوشت سے بنے ہوئے ابھار (کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ) کی شکل میں تھی (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۴۲۵ ببعد) - ہتھیلیاں چوڑی اور پُرگوشت تھیں - اسی طرح کلائیاں اور انگلیاں بھی دراز اور پر گوشت تھیں کہ مصافحہ کرنے والوں کو اتنی نزاکت اور نفاست کا احساس ہوتا کہ حریر و دیباج کا لمس بھی اس کے سامنے بے معنی تھا - (حوالۂ مذکور ، ۱ : ۴۱۳ عن انسؓ)- بطن مبارک کسا ہوا اور سینے کے مساوی تھا ، (گویا کاغذوں کی تہ جما دی گئی ہو : (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۳۹۷)- پنڈلیاں لانبی اور پُرگوشت ، پاؤں پُرگوشت اور مضبوط اور تلوے درمیان سے خالی تھے (کہ پانی نیچے سے نکل سکے) - مجموعی طور پر آپؐ کی شخصیت میں جلال و جمال کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا تھا کہ دیکھنے والے پر ہیبت طاری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں آپؐ کے لیے انتہائی محبت بھی پیدا ہو جاتی (شمائل عن علیؓ) - آپؐ کے پسینے سے عطر جیسی مہک آتی ؛ جسم مبارک سے ہر وقت سرور انگیز خوشبو محسوس کی جاتی (الوفا ، ص ۳۹۱، عن انسؓ) - آپ کی ہنسی کبھی مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھی جس میں سامنے کے دانت نمایاں ہو جاتے - چہرۂ مبارک غصے میں تمتما اٹھتا کہ اس پر نگاہ کا ٹھیرنا مشکل ہو جاتا - چہرۂ مبارک پر پسینے کے قطرے موتی کی طرح چمکتے (البخاری، ۳ : ۱۰۸ ، المغازی ، باب ۳۴ ، واقعۂ افک) - آپؐ کن انکھیوں سے کسی کی طرف نہ دیکھتے ؛ ہمیشہ پورا چہرہ گھما کر نظر ڈالتے ؛ کسی سے ناراض ہوتے تو اس سے رخ پھیر لیتے - آپؐ ہمیشہ سلام اور مصافحہ کرنے میں پہل کرتے اور ہاتھ کو اس وقت تک دوسرے کے ہاتھ میں رہنے دیتے جب تک دوسرا خود ہاتھ نہ چھڑا لیتا (الترمذی : شمائل) .

گفتگو : آپؐ کی زبان نہایت شیریں اور باوقار تھی - ٹھیر ٹھیر کر گفتگو فرماتے کہ مخاطب الفاظ گن سکتا تھا - جس بات پر خصوصی زور دینا ہوتا اسے کئی بار دہراتے - آواز اتنی بلند تھی کہ حضرت ام ہانیؓ کے بیان کے مطابق ، ان کے گھر کے صحن میں صاف سنائی دیتی تھی (ابن ماجہ : سنن، باب ما جاء فی صلوۃ اللیل) - اکثر متفکر رہتے - بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے - گفتگو کے دوران میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ اٹھا کر اشارہ فرماتے - تعجب کا اظہار کرنا ہوتا تو ہاتھ پلٹ دیتے

(الترمذی : شمائل، عن ھند بن ابی ھالہ) - کلام کو بے جا طول دینے سے گریز فرماتے (ابن سعد : الطبقات، ۲ ، ۳۷۵).

چال : آپؐ قدم اٹھا اٹھا کر یوں چلتے گویا بلندی سے اتر رہے ہوں - آپؐ کی رفتار نہ تو کسی عاجز کی طرح ہوتی اور نہ کسی سست شخص کے مانند بلکہ ایسی تیز رفتاری سے قدم اٹھاتے کہ صحابہؓ بڑے تکلف سے آپؐ کو مل سکتے تھے (ابن سعد ، ۲ : ۳۸۹) - دوران سفر میں آپؐ ادھر ادھر توجہ نہ فرماتے ، خواہ آپؐ کا کپڑا ہی کسی چیز میں کیوں نہ الجھ جاتا .

لباس : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب کوئی نیا کپڑا زیب تن فرماتے ، تو اس کپڑے کا نام لیتے اور پھر فرماتے : اللھم لک الحمد کما کسوتنیہ اسألک خیرہ و خیر ما صنع لہ و اعوذ بک من شرہ و شرما صنع لہ (ابوداؤد : السنن ، ۴ : ۳۰۹ ، حدیث ۴۰۲۰) - کپڑوں میں عموماً آپؐ کو سفید رنگ کا کپڑا زیادہ پسند تھا (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۴۹) اور آپؐ فرمایا کرتے تھے : علیکم بالبیاض من الثیاب ، فلیلبسھا احیاؤکم و کفنوا فیھا موتاکم (ابو داؤد ، ۴ : ۳۳۲ ، حدیث ۴۰۶۱) ، یعنی سفید رنگ کے کپڑوں کو لازم پکڑو ، اسی لباس کو زندہ پہنیں اور اسی لباس میں مردے کو کفنایا جائے ؛ ایک دوسری روایت میں آپؐ نے اسے خیر اللباس قرار دیا (الطبقات، ۱ : ۴۴۹)، تاہم آپؐ نے بعض موقعوں پر سرخ رنگ کے (غالباً دھاری دار) (انوار محمدی ، شرح شمائل ترمذی، ص ۸۰)، نیز زعفران اور ورس سے رنگے ہوئے زرد رنگ کے کپڑے بھی ملبوس فرمائے ہیں (ابن سعد : الطبقات ، ۴۵۰ تا ۴۵۲) .

آپؐ کو عموماً لباس میں کسی قسم کا تکلف پسند نہ تھا۔ اکثر آپؐ کا لباس چادر، قمیض اور تہبند تھا - آپؐ کی چادر (جبرۃ، جو آپؐ کو بہت پسند تھی) لمبائی میں چار ہاتھ (اذرع) اور چوڑائی میں دو ہاتھ اور ایک بالشت ہوتی تھی۔ چادروں میں آپؐ کو یمنی چادر بہت پسند تھی، جو سرخ اور خط دار اور صموت یا کتان کی بنی ہوتی تھی (علی جونپوری : شرح شمائل ترمذی، ص ۱۷۹) - آپؐ کو قمیض بہت پسند تھی - آپؐ کی کتان سے بنی ہوئی قمیض کی آستینیں کلائی کے جوڑ تک ہوتی تھیں، تاہم لمبائی زیادہ نہیں ہوتی تھی (ابن سعد : الطبقات، ۱ : ۴۵۸) ؛ ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ کی قمیض ٹخنوں سے اوپر اور آستین ہاتھ کی انگلیوں تک ہوتی تھی (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۵۶۳) - آپؐ کا ازار مبارک اگلی جانب سے نیچے اور پچھلی طرف سے کسی قدر اونچا اور ٹخنے سے نصف پنڈلی تک ہوتا تھا (ابن سعد ، ۱ : ۴۵۹ ؛ الوفا ، ۵۶۵) .

آپؐ عموماً سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرماتے تھے - فتح مکہ کے دن بھی عمامہ سیاہ رنگ کا تھا (الوفا ، ص ۵۶۷) - شملہ بعض اوقات کندھے پر اور بعض اوقات دونوں کندھوں کے درمیان ڈال لیتے تھے۔ کبھی پگڑی کو ٹھوڑی کے نیچے لا کر باندھ لیتے تھے - عمامہ کے نیچے سفید شامی ٹوپی کا استعمال بھی معمول تھا - فرمایا کرتے تھے : "ہم میں اور مشرکین میں یہی فرق ہے کہ ہم ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں" (ابو داؤد : السنن ، ۴ : ۳۴۰ ، حدیث ۴۰۷۸) - آپؐ سفر میں ایسی ٹوپی (قلنسوہ) پہنتے جو کانوں کو بھی ڈھانپ لیتی تھی (الوفا ، ص ۵۶۷ و ۵۶۸) .

آپؐ کو موزے استعمال کرنے کی عموماً عادت نہ تھی ، مگر نجاشی نے (غالباً چرمی) موزے بھیجے تو استعمال فرمائے (ابن الجوزی : الوفا، ص ۵۷۱)۔ اسی طرح آپؐ نے ان موزوں کو بھی پہنا جو حضرت دحیہ الکلبیؓ نے ہدیۃً پیش کیے تھے (الترمذی ، ۴ : ۲۴۰ ، حدیث ۱۷۶۹) - بعض اوقات آپؐ شامی عبا بھی ملبوس فرماتے تھے، جس کی آستین تنگ ہوتی تو آپؐ

نیچے سے بازو نکال کر دھویا کرتے تھے (ابن الجوزی، ص ۵۶۴؛ الترمذی، ۴ : ۲۴۰، جہاں جبۃ رومیۃ کا ذکر ہے)۔ اس کے علاوہ نوشیروانی قبا بھی استعمال فرمائی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سوت اور کتان دونوں سے بنے ہوے کپڑے استعمال کیے (ابن سعد: الطبقات، ۱۷ : ۱۴۵۳)۔ آپؐ کے نعلین چپل سے مشابہ تھے، مگر ان میں دو تسمے لگے ہوے تھے (ابن الجوزی، ص ۵۸۱)۔ آپؐ کا بچھونا چمڑے کا بنا ہوا تھا جس میں خشک گھاس بھری ہوئی تھی۔ چارپائی بان کی تھی، جس سے اکثر جسم پر نشانات پڑ جاتے۔ کبھی کبھار کھجور کی چٹائی پر بھی لیٹتے تھے۔ ایک رات حضرت عائشہؓ نے گدے کو نرم کرنے کے لیے اس کی چار تہیں بنا دیں، مگر آپؐ نے اس کو دوبارہ سابقہ حالت پر لوٹانے کا حکم دیا (الطبقات، ۱ : ۴۶۴، ۴۱۵)۔ ٹیک لگانے کے لیے تکیہ بھی استعمال فرماتے تھے، جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوتے تھے۔ آپؐ گھر میں نماز چھوٹی چٹائی پر پڑھتے تھے۔

(ب) معمولات نبوی: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معمولات و مشاغل مبارکہ کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آپؐ کی حیات طیبہ ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے مبرا اور پاک تھی۔ معمولات میں ایک توازن اور تسلسل پایا جاتا تھا، البتہ موقع و محل کی مناسبت سے ان میں خفیف سی زمانی و مکانی تبدیلیاں رونما ہو جاتی تھیں۔

۱۔ روزمرہ کے معمولات: آپؐ عموماً فجر کی نماز پڑھ کر اپنی جاے نماز (مصلّٰی) پر (خاموشی کے ساتھ) آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ سورج نکل آتا۔ اس کے بعد صحابہؓ آپؐ کے گرد جمع ہو جاتے اور اپنی پرانی، خاص طور پر عہد جاہلی کی، باتیں یاد کر کر کے ہنستے، مگر آپؐ صرف تبسم فرماتے (مسلم، ۴ : ۱۸۱۰، حدیث ۳۲۲۲؛ ابو داؤد، ۵ : ۱۷۸، حدیث ۴۸۵۰؛ النسائی، حدیث ۱۳۵۸)۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ مجھے اس قوم کے ساتھ جو ذکر الٰہی میں مصروف ہو، نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اور نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک بیٹھنا اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں اولاد اسمٰعیل میں کے چار غلام آزاد کروں (ابو داؤد، ۴ : [illegible]، حدیث ۳۶۶۷)۔ ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ صبح تک صحابہؓ کو بنی اسرائیل کے حالات بتایا کرتے تھے (حوالۂ مذکور، ص ۷۰، حدیث ۳۶۶۳)۔ اسی مجلس میں اگر کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو بیان کرتا اور آپؐ خود یا اکابر صحابہؓ میں سے کوئی ایک (مثلاً حضرت ابوبکرؓ) اس کی تعبیر (تاویل) بیان کرتے (مسلم، ۴ : ۱۷۷۷ تا ۱۷۷۹، حدیث ۲۲۶۹)۔ آپؐ حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ فرماتے: "تم میں سے جس کسی نے کوئی خواب دیکھا ہو وہ مجھے بتائے، میں اس کی تعبیر بیان کروں گا (حوالہ مذکور؛ البخاری، ۴ : ۳۶۳)۔ اسی بنا پر امام البخاری نے کتاب التعبیر میں ایک باب بعنوان "تعبیر الرؤیا بعد صلٰوۃ الصبح" باندھا ہے۔ انھیں مجالس میں آپؐ اپنے خواب بھی بیان فرماتے (دیکھیے البخاری، ۴ : ۳۶۳ تا ۳۶۵)۔ پھر آپؐ صلٰوۃ الضحٰی ادا فرماتے، جو عموماً چار تا آٹھ رکعات پر مشتمل ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ کے بقول اگر سفر سے واپسی ہوتی تو یہ نماز گھر میں ادا فرماتے (مسلم، ۱ : ۴۹۶، حدیث ۷۱۷ تا ۷۲۰)۔ فتح مکہ کے روز آپؐ نے یہ آٹھ نوافل حضرت ام ہانیؓ کے گھر میں ادا فرمائے (حوالۂ مذکور)۔ ان نوافل سے قبل اور بعد میں تسبیح کا معمول نہ تھا (مسلم، ۱ : ۴۹۸، حدیث ۲۳۶)۔

بعد ازاں آپؐ گھر تشریف لے آتے اور پوچھتے کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟ اگر بتایا

جاتا کہ گھر میں برکت ہے ۔ تو آپؐ روزے کی نیت فرما لیتے (مسلم ، ۲ : ۸۰۸ ، حدیث ۱۱۵۴) اور اگر کچھ موجود ہوتا تو اسے تناول فرما لیتے (حوالۂ مذکور) ۔ پھر دن بھر اپنے گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے اور جب نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لیے متوجہ ہو جاتے (البخاری ، ۴ : ۱۲۲) ۔ دوپہر کے وقت استراحت (قیلولہ) فرماتے ۔ بعض اوقات آپؐ حضرت ام سُلَیمؓ کے گھر تشریف لاتے اور قیلولہ فرماتے (مسلم، ۴: ۱۸۱۷؛ حدیث ۲۲۳۶)۔ حضرت ام سلیمؓ آپؐ کے لیے چمڑے کا بستر بچھا دیتیں، جس پر آپؐ کے جسم اطہر کے پسینے کے قطرے جمع ہو جاتے ، پھر ان سے عطر بناتیں جو بہت پسند کیا جاتا تھا (حوالۂ مذکور) ۔ آپؐ کا یہ معمول سفر میں بھی جاری رہتا (مسلم ، ۲ : ۸۵۳).

نماز عصر کے بعد باری باری تمام ازواج سے مختصر ملاقات اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جاتے ۔ اس موقع پر بعض ازواج کسی مشروب سے آپؐ کی تواضع کرتیں مثلاً حضرت زینبؓ بنت جحش اس موقع پر آپؐ کو شہد پیش فرماتی تھیں ، جسے آپؐ بڑے شوق سے نوش فرماتے (البخاری ، ۳ : ۳۵۸) ۔ ان مختصر سی ملاقاتوں کے بعد آپؐ اس زوجۂ مطہرہ کے پاس تشریف لے جاتے ، جس کے ہاں آپؐ کی باری ہوتی تھی ۔ عموماً ہر زوجہ کی نو ایام کے بعد باری آتی تھی (مسلم ، ۲ : ۱۰۸۴ ، حدیث ۱۴۶۲ ، نیز حدیث ۱۴۶۳ ، جہاں یہ مذکور ہے کہ حضرت سَودہؓ بنت زَمعہ نے بعد ازاں اپنی باری حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دے دی تھی)۔ یہاں دیگر ازواج مطہرات بھی جمع ہو جاتی تھیں اور رات گئے تک یہ مجلس جاری رہتی (مسلم ، ۲ : ۱۰۸۴، حدیث ۱۰۶۲)۔ یہاں کبھی کبھار بعض ازواج کے درمیان معمولی تکرار بھی ہو جاتی تھی ، جو ایک فطری امر تھا (حوالہ مذکور)۔ بعض اوقات آپؐ کوئی دلچسپ واقعہ بھی سناتے (ابن الجوزی ، ۲ : ۶۲۳) ۔ عشا کی نماز کے بعد (جو اکثر قدرے تاخیر سے پڑھنے کا معمول تھا) دیگر ازواج اپنے اپنے حجروں میں چلی جاتیں اور آپؐ نماز سے فراغت کے بعد واپس تشریف لا کر سو رہتے ۔ عموماً عشا کی نماز سے پہلے سونا (مگر امام بخاری [۱ : ۱۵۲] نے نماز کے انتظار میں سونے کو مستثنیٰ کیا ہے) اور نماز کے بعد گفتگو کرنا آپؐ کو ناپسند تھا (البخاری، ۱: ۱۵۲، ۱۵۳).

سوتے وقت آپؐ وضو ضرور فرماتے تھے (ابن الجوزی، ۲ : ۶۲۴) اور حضرت عائشہؓ کے بقول قضاے حاجت کے بعد ہر مرتبہ استنجا اور وضو کرنا بھی آپؐ کا معمول تھا (ابو داؤد ، ۱ : ۱۵۱، حدیث ۲۲۲) ۔ سونے سے قبل وضو کے لیے پانی اور مسواک (ابو داؤد ، ۱ : ۴۷، حدیث ۵۶) اور زندگی کے آخری دنوں میں لکڑی کا پیالہ آپؐ کے پلنگ کے پاس (یا نیچے) رکھ دیے جاتے (کتاب مذکور ، ۱ : ۲۸ ، حدیث ۲۴)۔ سونے سے پہلے آپؐ دونوں آنکھوں میں تین تین سلائی سرمہ بھی ڈالتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۶۲۴) ۔ ابن سعد کے مطابق پانچ اشیا سفر و حضر میں ہمیشہ آپؐ کے ہمراہ ہوتیں : کنگھی ، شیشہ ، تیل ، مسواک اور سرمہ (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۴۸۴) ۔ سونے سے قبل مُسبحات [رک بآں] تلاوت فرماتے اور دوسروں کی ترغیب کے لیے فرماتے کہ ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیات سے افضل ہے ۔ (ابو داؤد ، ۵ : ۳۰۴ ، حدیث ۵۰۵۸ ؛ الترمذی ، ۵ : ۱۸۱ ، حدیث ۲۹۲۱) ۔ ایک دوسری روایت میں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الزمر کے پڑھنے کی صراحت ہے (الترمذی، ۵ : ۱۸۱، عدد ۲۹۲۰) ۔ ان کے علاوہ سورۂ اخلاص اور معوذتین کو پڑھ کر ہاتھوں پر پھونکتے اور پھر تمام بدن پر ہاتھ پھیرتے تھے (الترمذی ، ۵ : ۴۷۳ تا ۴۷۴ ، حدیث ۳۴۰۲ تا ۳۴۰۳ ؛ البخاری ، ۴ : ۱۸۹ وغیرہ) ۔ ایک صحابی

کو آپؐ نے سونے سے قبل سورۃ الکافرون پڑھنے کی بھی ہدایت فرمائی (ابو داود، ۵ : ۳۰۲، حدیث ۵۰۵۵) - پھر آپؐ داہنی کروٹ پر، دائیں رخسار کے نیچے ایک ہاتھ رکھ کر اور قبلہ رو ہو کر بستر پر لیٹ جاتے اور یہ دعا پڑھتے تھے : اللّٰھم باسمک اموت و احیا (البخاری، ۴ : ۱۸۸) - بعض اوقات یہ دعا پڑھتے : اللھم انی اسلمت نفسی الیک و وجھت وجھی الیک و فوضت امری الیک، الجأت ظھری الیک رغبۃ و رھبۃ الیک لا ملجأ ولا منجأ منک الا الیک؛ اٰمنت بکتابک الذی انزلت و بنبیک الذی ارسلت (البخاری، ۴ : ۱۸۸؛ مسلم، ۴ : ۲۰۸۱، حدیث ۲۷۱۰، و بعد؛ ابو داود، ۵ : ۲۹۹، حدیث ۵۰۴۶)- آپؐ کا ارشاد تھا کہ سونے سے قبل جو شخص یہ دعا پڑھے اور پھر رات کو مر جائے تو وہ فطرت اسلام پر مرے گا (حوالہ مذکور) - حضرت حفصہؓ کے مطابق آپؐ یہ دعا بھی تین مرتبہ پڑھتے تھے : اللّٰھم قنی عذابک یوم تبعث عبادک (ابو داود، ۵ : ۲۹۸، حدیث ۵۰۴۵) - حضرت ابوھریرہؓ سے منقول ہے کہ بستر پر لیٹ کر آپؐ یہ دعا بھی پڑھتے تھے : اللّٰھم رب السموات و رب کل شیءٍ خالق الحب والنوٰی منزل التوراۃ والانجیل والفرقانْ، اعوذبک من شر کل ذی شر، انت اٰخذ بناصیتہ انت الاول فلیس قبلک شیءٌ و انت الآخر فلیس بعدک شیء و انت الظاھرفلیس فوقک شیء، و انت الباطن فلیس دونک شیء، اقض عنا الدین و اغننا من الفقر (مسلم، ۴ : ۲۰۸۴، حدیث ۲۷۱۳؛ الترمذی، ۵ : ۴۷۲، حدیث ۳۴۰۰) - حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ اس موقع پر یہ دعا پڑھتے تھے : اللّٰھم انی اعوذ بوجھک الکریم و کلماتک التامۃ من شرما انت اٰخذ بناصیتہ اللّٰھم انت تکشف المغرم والمأثم اللھم لایھزم جندک ولا یخلف وعدک ولا ینفع ذا الجد منک الجد، سبحانک و بحمدک (ابو داود، ۵ : ۳۰۲، حدیث ۵۰۵۲) - آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزھراءؓ کو سونے سے پہلے ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ یہ گنتی میں تو سو ہیں مگر میزان عمل میں پورے ہزار ہیں (البخاری ۴، : ۱۸۹؛ مسلم، ۴ : ۱۰۹، حدیث ۲۷۲۷؛ ابو داود، ۵ : ۳۰۶ تا ۳۰۷، حدیث ۵۰۶۲ و ۵۰۶۳).

جب آپؐ نیند سے بیدار ہوتے تو فرماتے : الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور (البخاری، ۴ : ۱۸۸) اور حضرت عائشہؓ کے مطابق دس مرتبہ تکبیر، دس مرتبہ تحمید، دس مرتبہ تسبیح، دس مرتبہ تہلیل اور دس مرتبہ استغفار پڑھتے اور پھر فرماتے : اللّٰھم اغفرلی و اھدنی و ارزقنی و عافنی (ابو داود، ۱ : ۴۸۷، حدیث ۷۶۶)؛ اسی موقع پر یہ دعا بھی پڑھتے : لا الہ الا انت سبحانک اللّٰھم استغفرک لذنبی و اسألک رحمتک، اللھم زدنی علما و لا تزغ قلبی بعد از ھدیتنی و ھب لی من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب (ابوداود، ۵ : ۳۰۶، حدیث ۵۰۶۱)- اگر اتفاقاً رات کو آنکھ کھل جائے تو یہ دعا پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے : لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک و ھو علی کل شیء قدیر، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ اِلاّ اللہ و اللہ اکبر ولاحول ولا قوۃ الا باللہ، رب اغفرلی - آپؐ کا ارشاد تھا کہ اس کے بعد اگر کوئی دعا مانگی جائے تو ضرور مقبول ہو اور اگر ارادہ کرکے اٹھے اور وضو کرکے نماز پڑھے تو وہ بھی عنداللہ مقبول ہو (الترمذی، ۵ : ۴۸۰، حدیث ۳۳۱۴) - نماز تہجد کی تیاری کرتے ہوئے سورۂ اٰل عمرٰن کی آخری دس آیات تلاوت فرماتے (ابن الجوزی، الوفا، ۲ : ۶۲۶) - حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس موقع کی یہ دعا نقل فرماتے ہیں : اللھم انت نور السمٰوٰت و الارض و من فیھن ولک الحمد، انت قیم السمٰوٰت والارض ومن فیھن ولک الحمد، انت الحق و وعدک حق

و قولک حق و لقاؤک حق و الجنة حق و النار حق و الساعة حق و محمد حق اللّٰھم لک اسلمتُ و علیک توکّلتُ و بک اٰمنتُ و الیک انبتُ و بک خاصمتُ و الیک حاکمتُ فاغفرلی ما قدمتُ و ما اخرتُ و ما اسررتُ و ما اعلنتُ انتَ المقدم و انتَ المؤخر لا الہ الا انتَ ولا الہ غیرُک (البخاری ۱ : ۲۸۴ و ۴ : ۱۸۹) - پھر آپؐ قضاے حاجت سے فارغ ہو کر اچھی طرح مسواک فرماتے (ابو داؤد ، ۱ : ۴۷ ، حدیث ۵۵) - پھر وضو فرماتے اور بشمول وتر گیارہ رکعات ادا فرماتے (البخاری ، ۱ : ۲۸۸ و ۴ : ۱۸۸) - اس نماز کو آپؐ نے تمام زندگی کامل پابندی وقت کے ساتھ ادا فرمایا اور سواے ایک یا دو راتوں کے جبکہ آپؐ کی طبیعت ناساز تھی ، آپؐ نے اس نماز کو ترک نہیں فرمایا (البخاری ، ۱ : ۲۸۴ ، ۲۸۵) - اس نماز کے اہتمام کا یہ عالم تھا کہ آپؐ اپنے متعلقین کو بھی اس نماز کے لیے جگاتے تھے (کتاب مذکور ، ۱ : ۲۸۵) اس نماز میں آپؐ اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپؐ کے پاے مبارک سوج جاتے (کتاب مذکور، ۱: ۲۸۶)- حضرت حذیفہؓ کے مطابق آپؐ نے ایک مرتبہ ایک رکعت میں سورة البقرة، سورة آل عمران اور سورة النساء تلاوت فرمائی (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۲، ۵۰۳) - ایک شب آپؐ نے سبع طوال تلاوت فرمائیں (حوالۂ مذکور)- دوران تلاوت ہر تسبیح والی آیت پر آپؐ تسبیح فرماتے ، ہر سوال والی آیت پر اللہ تعالٰی سے سوال فرماتے ، ہر پناہ والی آیت پر خدا تعالٰی سے پناہ مانگتے (حوالہ مذکور)- ایک شب آپؐ نے پوری رات سورة المائدہ کی یہ آیت پڑھتے ہوے گزار دی : اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۸) - رمضان المبارک میں شب بیداری کا یہ اہتمام اور زیادہ بڑھ جاتا اور آپؐ لمبی لمبی نمازیں ادا فرماتے تھے (البخاری ، ۱ : ۲۹۰).

بعض اوقات وتروں سے قبل (البخاری ، ۱ : ۲۹۰) اور بعض اوقات ہر دو رکعتوں کے بعد قلیل سے وقفے کے لیے سو بھی جاتے اور پھر اٹھ کر وضو فرماتے اور بقیہ نماز پوری فرماتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۱ تا ۵۰۲) - رات کی یہ نماز عموماً دو دو رکعات پر مشتمل ہوتی تھی (البخاری ، ۱ : ۲۸۷) - اس کے رکوع اور سجدے کا یہ حال ہوتا تھا کہ ناظر یہ فرق محسوس نہیں کرتا تھا کہ قیام طویل تھا یا رکوع و سجدہ (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۲ ، ۵۰۳) - حضرت عائشہؓ کے بقول آپؐ کا سجدہ ۵۰ آیات کی تلاوت کے مساوی ہوتا تھا (البخاری ، ۱ : ۲۸۵) - نماز تہجد میں آپؐ تین دن سے کم میں قرآن حکیم کا ختم کرنا ناپسند فرماتے تھے اور جب قرآن ختم ہوتا تو آپؐ کھڑے کھڑے دعا مانگتے تھے (ابن الجوزی ، ۲ : ۵۰۶)- وتروں میں آپؐ علی الترتیب سورة الاعلی، سورة الکافرون اور سورة الاخلاص پڑھتے تھے اور نماز کے اختتام پر فرماتے: سبحانَ الملکِ القدوس (تین مرتبہ اور تیسری مرتبہ ذرا دراز کرتے ہوے ؛ دیکھیے ابن الجوزی، ۲ : ۵۰۷)- نماز وتر کے بعد آپؐ استراحت فرماتے تھے- پھر جب اذان کی آواز بلند ہوتی تو اٹھ کر فجر کی دو رکعتیں ادا فرماتے (البخاری ، ۱ : ۲۸۶) - اس کے بعد آپؐ اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاتے (کتاب مذکور، ۱ : ۲۹۲، ۲۹۳)، لیکن بقول حضرت عائشہؓ اگر وہ جاگ رہی ہوتیں تو لیٹنے کے بجاے ان سے گفتگو فرماتے (حوالۂ مذکور) اور پھر جب مؤذن بلانے آتا تو آپؐ اٹھ کر باہر نکلتے اور نماز فجر کی امامت فرماتے .

۲- صبح و شام کے معمولات : صبح و شام کے اوقات آپؐ کے نزدیک خاص اہتمام رکھتے تھے ، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قرآن کریم میں بے شمار مواقع پر صبح و شام (بکرةً و اصیلاً / عشیًا ، دیکھیے محمد فؤاد عبدالباقی : معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم) کی عبادت اور التسبیح و تہلیل پر زور دیا گیا - اسی بنا پر آپؐ کا یہ فرمان تھا کہ جو

شخص صبح نماز کے لیے وقت پر نہیں اٹھتا اس پر شیطان غالب آ جاتا ہے اور وہ تمام دن تھکاوٹ اور کسل مندی محسوس کرتا رہتا ہے (البخاری ، ۱ : ۲۸۸ تا ۲۸۹) - آپؐ ان اوقات کو بہت سی دعاؤں اور اوراد سے معمور رکھتے تھے (جن کے لیے دیکھیے البخاری ، ۴ : ۱۸۴ تا ۲۱۰، کتاب الدعوات ؛ مسلم، ۴ : ۲۰۶۱ تا ۲۰۹۰، کتاب الذکر و الدعا و التوبۃ و الاستغفار ؛ الترمذی ، ۴ : ۴۵۵ تا ۵۸۲ ، کتاب الدعاء ؛ و دیگر کتب حدیث).

۳- معمولات طہارت : آپؐ کو طہارت کا بہت خیال رہتا تھا - دن ہو یا رات آپؐ بدوں طہارت کیے وقت گزارنا ہرگز پسند نہیں فرماتے تھے - آپؐ رفع حاجت کے لیے بہت دور بعض اوقات تقریباً ۲ میل (ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۱۷۱) نکل جاتے ، جہاں سے بمشکل آدمی دکھائی دے سکے (ابو داؤد ، ۱ : ۱۴ ، حدیث ۱ و ۲) - قضاے حاجت سے قبل آپؐ یہ دعا ضرور پڑھتے تھے : اعوذ باللہ من الخبث والخبائث (مسلم، ۱ : ۳۸۴، حدیث ۳۷۵)، یا اللّٰھم انی اعوذ بک من الخبث و الخبائث (ابن الجوزی ، ۲ : ۴۸۷) ابن ماجہ (حدیث ۲۹۹) میں اس کے معاً بعد یہ اضافہ بھی ہے - الرّجس النّجس الشیطان الرّجیم (نیز دیکھیے ابن قیم : زاد المعاد ، ۱ : ۱۷۰ تا ۱۷۲) اور دوران قضاے حاجت قبلے کی طرف منہ اور کمر کرنے سے پرہیز فرماتے (مسلم ، کتاب الطہارۃ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۳۱۳ ؛ النسائی، ۱ : ۲۳) اور جب تک بیٹھ نہ جاتے اس وقت کپڑے نہیں اٹھاتے تھے (الترمذی، ۱: ۲۱ ، حدیث ۱۴ ؛ ابو داؤد ، ۱ : ۲۱ ، حدیث ۱۴) ہمیشہ بیٹھ کر رفع حاجت فرماتے (الترمذی، حدیث ۱۲) اور اس دوران میں ہر قسم کی گفتگو کرنے (بشمول جواب سلام) کو ناپسند فرماتے تھے (ابن ماجہ ، حدیث ۳۴۲؛ ابو داؤد، ۱ : ۲۲ تا ۲۳، حدیث ۱۵ تا ۱۷) - آپؐ رفع حاجت کے لیے جانے سے قبل اپنی انگوٹھی (جس پر محمد رسول اللہ کے الفاظ کندہ تھے) اتار کر رکھ جاتے تھے (ابن ماجہ، حدیث ۳۰۳)- آپؐ (ابتدائی) استنجا ایسی اشیا سے فرماتے جو مطہر ہوتیں (مثلاً ڈھیلا وغیرہ) ؛ ایسی اشیا جو غیر مطہر ہوں (مثلاً کوئلہ، وغیرہ)، ان سے استنجا کرنا آپؐ کو ناپسند تھا (ابو داؤد ، ۱ : ۳۴ تا ۳۷ ، حدیث ۳۶ تا ۳۹) اور ان کے استعمال میں طاق کا لحاظ رکھتے تھے (ابن ماجہ : سنن، حدیث ۳۴۹۸؛ ابو داؤد، ۱ : ۳۳ تا ۳۴ ، حدیث ۳۵) - بعد ازاں پانی استعمال فرماتے (البخاری ، ۱ : ۵۱) اور پھر زمین پر ہاتھ مار کر اپنے دونوں ہاتھ اچھی طرح رگڑ کر دھوتے تھے (ابو داؤد ۱ : ۳۹ ، حدیث ۴۵) - اس سے فارغ ہو کر جب آپؐ باہر نکلتے تو فرماتے : غفرانک (الترمذی، حدیث ۷ ؛ ابن ماجہ، حدیث ۳۰۰ (ابن الجوزی ، ۲ : ۴۸۷).

معمولات مسواک و وضو : مسواک آپؐ کی تمام زندگی کا معمول رہی ، یہاں تک کہ آخری گھڑیوں میں بھی حضرت عائشہؓ نے آپ کا منشا پا کر آپؐ کو مسواک کرائی ، جس سے چہرۂ مبارک فرط مسرت سے تمتمانے لگا تھا (ابن ہشام ، البلاذری وغیرہ) - آپؐ کو مسواک اس قدر پسند تھی کہ آپؐ فرماتے تھے کہ اگر میری امت پر گراں نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا لازمی حکم دیتا (النسائی، ۱ : ۱۲ ؛ مسلم، ۱ : ۲۲۰، حدیث ۲۵۲) - آپؐ ہر نماز کے لیے تازہ وضو فرماتے (البخاری ، ۱ : ۶۶) ، ہر وضو میں اچھی طرح مسواک فرماتے اور دوسروں کو بھی آپؐ کی یہی تلقین تھی کہ اگر ہر نماز کے لیے تازہ وضو نہ کیا جا سکے تو مسواک ضرور کر لینی چاہیے (ابو داؤد، ۱: ۴۱، حدیث ۴۸)- اسی طرح جب بھی آپ سو کر بیدار ہوتے تو ضرور مسواک فرماتے (ابو داود ، ۱ : ۴۷ ، حدیث ۵۷) .

وضو سے قبل آپؐ بسم اللہ ضرور پڑھتے ؛ پھر

برتن میں ہاتھ ڈالنے سے قبل ہاتھوں پر پانی ڈال کر تین مرتبہ انھیں دھوتے؛ پھر ایک یا دو یا تین چلوؤں سے (ابن قیم، ۱ : ۱۹۲) اچھی طرح کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف فرماتے؛ پھر تین مرتبہ چہرہ دھوتے؛ پھر پہلے اپنا دایاں پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت (دو یا تین مرتبہ) دھوتے؛ پھر اپنے سر کا مسح فرماتے؛ پھر پہلے دائیں، پھر بائیں پاؤں کو دھوتے (البخاری، ۱ : ۶۰ تا ۶۱؛ مسلم، طہارۃ، ۱ : ۲۰۴ و ۲۰۵، حدیث ۲۲۶؛ ابن ماجہ، حدیث ۲۹۵؛ النسائی، ۱ : ۶۹، ۷۰، وغیرہ)۔ اگر موزے پہنے ہوتے تو انھیں اتارے بغیر ان پر مسح فرماتے (البخاری، ۱: ۶۱ ببعد؛ مسلم، ۱: ۲۲۸، حدیث ۲۷۴)۔ دوران وضو داڑھی کا خلال اور پاؤں کی انگلیوں کے خلال کا بھی معمول تھا (ابو داؤد، ۱ : ۱۰۱، حدیث ۱۴۵)۔ ابن قیم (زاد المعاد، ۱ : ۱۹۵ ببعد) کے مطابق دوران وضو آپؐ سے بجز ابتدا میں تسمیہ کے اور کوئی دعا منقول نہیں، البتہ وضو کے بعد آپؐ یہ دعا پڑھتے تھے: اشھد اَن لّا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ و اشھد ان محمدا عبدہٗ و رسولہٗ اللّٰھم اجعلنی من التوابین و اجعلنی من المتطھّرین۔ آپؐ عموماً دو رطل پانی سے وضو اور ایک صاع (تقریباً چار سیر) پانی سے غسل فرما لیا کرتے تھے (ابن الجوزی، ۲ : ۴۸۸)؛ پانی کی اس سے زیادہ مقدار بھی مروی ہے (ابو داؤد، ۱: ۱۶۶ و ۱۶۷، حدیث ۲۳۸)۔ وضو کے بعد بعض روایات کے مطابق کپڑے سے منہ وغیرہ صاف کرتے تھے (الترمذی، ۱: ۸۴ ببعد، حدیث ۵۳، ۵۴)۔

غسل: آپؐ کے غسل کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ پہلے اپنے دونوں ہاتھ دو یا تین مرتبہ دھوتے؛ پھر استنجا فرماتے؛ پھر زمین پر ہاتھ مار کر انھیں اچھی طرح دھوتے، پھر کلی کرتے اور پانی ڈال کر ناک صاف فرماتے، پھر اپنا چہرہ دھوتے، اپنے تمام بدن پر پانی ڈالتے، پھر اس جگہ سے ہٹ کر اپنے پاؤں دھوتے (ابو داؤد، ۱: ۱۶۹ تا ۱۷۰، حدیث ۲۴۵؛ مسلم، ۱: ۲۵۴، حدیث ۳۱۷؛ الترمذی، ۱: ۱۷۳ تا ۱۷۴، حدیث ۱۰۳)۔ حضرت عائشہؓ کے مطابق آپؐ غسل میں بھی نماز کی طرح پورا وضو فرماتے، پھر دائیں کندھے پر پانی ڈالتے، پھر بائیں پر، پھر تین مرتبہ تمام بدن پر پانی بہاتے (ابو داؤد، ۱ : ۱۶۷، حدیث ۲۴۰ و ۲۴۱؛ ابن ماجہ، حدیث ۵۷۴)۔ خصوصی ضرورت کے علاوہ جمعہ اور عیدین کے مواقع پر غسل کا شدید اہتمام ہوتا تھا (البخاری، ۱ : ۲۲۴ تا ۲۲۵ و ببعد، کتاب الجمعہ؛ مسلم، ۱ : ۵۷۹ تا ۵۸۱، حدیث ۸۴۴ تا ۸۴۷؛ الترمذی، حدیث ۴۹۲ تا ۴۹۴) ان تقریبات پر آپؐ خوشبو کے استعمال کو پسند فرماتے تھے (ابو داؤد، ۱ : ۲۴۷، حدیث ۳۴۷)۔

۴۔ معمولات نماز: آپؐ کو تمام زندگی نماز کے اہتمام کا بڑا خیال رہا۔ آپؐ کے نزدیک سب سے عمدہ عمل نماز کا اول وقت پر ادا کرنا ہے (الترمذی، ۱: ۳۲۰، حدیث ۱۷۰؛ ابو داؤد، ۱: ۲۹۶)۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ تین چیزوں کو کبھی مؤخر نہیں کرنا چاہیے: نماز جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ جب آ جائے اور جوان عورت، جب اس کا کوئی رشتہ مل جائے (احمد بن حنبل: مسند، ۱ : ۱۰۵، حدیث ۸۲۸؛ الترمذی، ۱ : ۳۲۰، حدیث ۱۷۱)۔ آپؐ کی زندگی مبارک میں ایک نماز کے سوا (اور وہ بھی سفر کے دوران میں تمام صحابہؓ کو نیند آ جانے کی وجہ سے) کوئی نماز قضا نہ ہوئی (مسلم، ۱ : ۴۷۱، حدیث ۶۸۰؛ ابن ماجہ، حدیث ۶۹۷؛ النسائی، حدیث ۶۲۰؛ ابو داؤد، ۱ : ۳۰۲ تا ۳۰۵، حدیث ۴۳۵ تا ۴۳۷)۔ فرض نمازیں مسجد میں باجماعت اور نفل نمازیں گھر میں تنہا پڑھنے کا معمول تھا۔

فجر کی نماز آپؐ اتنی روشنی میں کہ پاس بیٹھنے والا، دوسرے کو پہچان سکتا تھا ادا فرماتے تھے (مسلم ۱ : ۴۴۷، حدیث ۶۴۷)، لیکن خواتین

کی شمولیت کی وجہ سے آپؐ بعض دنوں (بالخصوص رمضان المبارک) میں اتنے منہ اندھیرے نماز پڑھتے کہ عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی پہچانی نہ جا سکتی تھیں (مسلم، ۱ : ۴۴۶، حدیث ۶۴۶)۔

فجر کی نماز میں آپؐ عموماً ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۴۴۷، حدیث ۶۴۷)، مگر کبھی سورۃ المومنون کی ۴۵ یا ۴۹ آیات، کبھی سورۂ قٓ، کبھی التکویر جیسی چھوٹی سورتیں بھی پڑھنے کا معمول تھا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ عموماً آپؐ قراءت میں تخفیف فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۶ تا ۳۳۷، حدیث ۴۵۵ تا ۴۵۸)، تاہم جمعہ کے روز نماز فجر کی پہلی رکعت میں سورۃ الٓمٓ السّجدہ اور سورۃ الدّھر تلاوت فرماتے (مسلم، ۲ : ۵۹۹، حدیث ۸۷۹، ۸۸۰؛ نیز دیکھیے ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۲۰۹ تا ۲۱۰، مطبوعہ کویت)۔ ظہر کی نماز آپؐ گرمیوں میں ذرا تاخیر سے، یعنی سایہ کے تین قدموں سے پانچ قدم ہونے کے درمیان) اور سردیوں میں ذرا جلدی (سایے کے پانچ قدم سے سات قدم کے درمیان) پڑھا کرتے تھے؛ (ابو داؤد، ۱ : ۲۸۳، حدیث ۴۰۱؛ النسائی، کتاب المواقیت، ۱ : ۲۵۰، ۲۵۱) ایک مرتبہ آپؐ نے اس وقت ظہر کی نماز ادا فرمائی جب کہ ٹیلوں کے سایے نمودار ہوگئے (البخاری؛ مسلم، ۱ : ۴۳۱، حدیث ۱۶۱، الترمذی، ۱ : ۲۹۶، حدیث ۱۵۷)۔ آپؐ ظہر کی ابتدائی دو رکعتوں کو آخری دو رکعتوں سے اور پہلی رکعت کو دوسری رکعت سے لمبا فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۳ تا ۳۳۴، حدیث ۴۵۱ تا ۴۵۲)۔ پہلی دو رکعتوں میں عام اندازے کے مطابق ۳۰، ۳۰ آیات (مثلاً سورہ ۳۲ [الٓمٓ السجدۃ]، آیات ۳۰) اور آخری دو رکعتوں میں ۱۵، ۱۵ آیات کے بقدر قیام فرماتے تھے (حوالۂ مذکور)؛ مگر یہ تصریح بھی کی گئی ہے کہ ظہر اور عصر کی آخری دو رکعتوں میں سوائے سورۃ الفاتحہ کے کوئی اور سورت نہیں پڑھتے تھے۔ پہلی رکعت کا قیام اتنا طویل ہوتا کہ ایک شخص بآسانی بقیع میں قضائے حاجت سے فارغ ہو کر، گھر میں طہارت اور وضو کر کے پہلی رکعت میں شامل ہو سکتا تھا (کتاب مذکور، ۱ : ۳۳۵، حدیث ۴۵۴)، مگر کبھی کبھار اسی نماز میں سورۃ اللّیل کا پڑھنا بھی مروی ہے۔ آپؐ عصر کی نماز اس وقت ادا فرماتے جب کہ سورج کی روشنی حضرت عائشہؓ کے حجرے میں موجود ہوتی (البخاری، ۹/۱۳، ۱ : ۱۴۶) اور ایک شخص مدینہ منورہ کے انتہائی علاقے سے ہو کر سورج کے زرد ہونے سے قبل واپس پہنچ جاتا تھا (کتاب مذکور، ۱ : ۱۴۷)۔ عصر کی پہلی دو رکعتوں میں آپؐ کا قیام ظہر کی آخری دو رکعتوں کے قیام سے قدرے کم ہوتا تھا (یعنی تقریباً ۱۵ آیات کے بقدر: مسلم ۱ : ۳۳۴، حدیث ۴۵۲ تا ۴۵۳)۔ ظہر اور عصر میں قراءت مخفی ہوتی تھی، مگر کبھی کبھار، دوسروں کو بتلانے کے لیے کوئی ایک آدھ آیت آپؐ بلند آواز سے بھی پڑھ دیتے (کتاب مذکور، ۱ : ۳۳۳، حدیث ۴۵۱)۔ نماز مغرب کو جلدی پڑھنے کا معمول تھا، یہاں تک کہ نماز کے بعد تیر گرنے کی جگہ دکھائی دے سکتی تھی۔ نماز مغرب میں سورہ مرسلات یا سورہ طور (یا اس کے مطابق کوئی سورت) پڑھتے تھے۔ (مسلم، ۱ : ۳۳۸، حدیث ۴۶۲ تا ۴۶۳)۔

عشا کی نماز کو آپؐ تاخیر سے پڑھتے تھے (البخاری ۹/۲۰، ۱ : ۱۵۰)، مگر ایک دوسری روایت کے مطابق اگر لوگ جمع ہو جاتے تو جلدی ورنہ تاخیر سے ادا فرماتے تھے (کتاب مذکور، ۹/۲۱، ۱ : ۱۵۱)۔ عشا کی نماز میں آپؐ سورۃ الاعلی، سورۃ الشمس اور سورۂ التین جیسی سورتیں تلاوت فرماتے تھے (مسلم، ۱ : ۳۳۹ تا ۳۴۰، حدیث ۴۶۴، ۴۶۵)۔

نماز باجماعت میں آپؐ خود بھی تخفیف کے حکم پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کی تاکید فرماتے (کتاب مذکور، ص ۳۴۰، حدیث ۴۶۶ ببعد) - جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ دوسری رکعت میں سورۂ منافقون اور کبھی سورۃ الاعلی اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے ؛ علامہ ابن القیم (زاد المعاد، ۱ : ۳۷۹) کے مطابق ان سورتوں کا مکمل طور پر پڑھنا سنت ہے نہ کہ بعض حصوں کا - عیدین میں دونوں مؤخر الذکر سورتیں تلاوت فرماتے تھے (البخاری، کتاب العیدین و کتاب الجمعہ ؛ نیز زاد المعاد، ۱ : ۳۷۸ تا ۳۷۹) .

۵- معمولات صوم : آپؐ رمضان المبارک کے علاوہ بھی بہت سے روزے رکھتے تھے ، مگر آپؐ کو صوم وصال (مسلسل روزے رکھنا) پسند نہ تھا ، بلکہ آپؐ کو صوم داودؑ (ایک دن روزہ اور ایک دن افطار) ، زیادہ محبوب تھا (البخاری ، ۳۰/۵۸ ، ۱ : ۴۹۳؛ مسلم، حدیث ۱۱۵۹، النسائی ، ۴ : ۲۰۶؛ ابو داود ، ۲ : ۸۰۷ ، حدیث ۲۴۲۶ تا ۲۴۲۷) - آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم رمضان المبارک کے علاوہ پورے شعبان کے (البخاری، ۳۰/۵۲، ۱:۴۹۱؛ ابو داود ، ۲ : ۸۱۲، حدیث ۲۴۳۱ ؛ الترمذی ، ۳ : ۱۱۳ ، حدیث ۷۳۷ ؛ النسائی، ۴ : ۲۰۰)، ہر ماہ میں تین دن ، ذی الحجہ کے نو ابتدائی ایام ، یوم عاشورہ (ابو داود ، ۲ : ۸۱۵ ، حدیث ۲۴۳۷؛ النسائی ، ۴ : ۳۰۵) ہر ماہ کی تیرھویں چودھویں اور پندرھویں (النسائی، ۴: ۲۲۲ تا ۲۲۳ ، حدیث ۲۴۳۴؛ ابو داود، حدیث ۲۴۳۹)، ہر ہفتے میں سے دو دن، پیر اور جمعرات (ابو داود ، حدیث ۲۴۳۶؛ الترمذی ۳ : ۱۲۱، حدیث ۷۴۵) کے روزے رکھنے کا بھی معمول تھا - اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ روزے رکھتے تو اتنے روزے رکھتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا اب کبھی آپؐ افطار نہیں کریں گے اور جب افطار کرتے تھے تو لگتا تھا اب آپؐ کبھی روزے نہیں رکھیں گے (البخاری ، ۳۰/۵۲ ، ۱ : ۴۹۱) - آپؐ کا طریقہ خود آپؐ کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھا کہ آپؐ روزے بھی رکھتے تھے اور افطار بھی فرماتے تھے ، مگر اعتدال کے ساتھ (البخاری) - آپؐ سحری کا ہمیشہ اہتمام فرماتے تھے ؛ آپؐ کے نزدیک بہترین سحری کھجور تھی (ابو داود ۲ : ۸۲۴ ، حدیث ۲۴۵۴) ، لیکن کبھی ایسے بھی ہوتا کہ جب گھر تشریف لاتے اور گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو روزے کی نیت فرما لیتے (مسلم ، حدیث ۱۱۵۴؛ النسائی ، ۴ : ۱۹۳ تا ۱۹۵ ببعد)- نفلی روزوں میں یہ بتلانے کے لیے کہ بوقت ضرورت انہیں کھولا بھی جا سکتا ہے ؛ آپؐ نے بعض مواقع پر روزے کی نیت کر کے افطار کر لیا (ابو داود ، ۲ : ۸۲۶ ، حدیث ۲۴۵۶ ؛ الترمذی ، ۳ : ۶ ، حدیث ۷۳۲) ، مگر ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم روزے کی قضا ضروری سمجھتے تھے (ابو داود ، ۲ : ۸۲۶ ، حدیث ۲۴۵۷) - روزے کے دوران میں مسواک کرنے ، حجامت کروانے (پچھنے لگوانے)، سرمہ ڈالنے کا بھی معمول تھا (ابو داود ، حدیث ۲۳۶۴، ۲۳۷۲، ۲۳۷۸)- افطار میں آپؐ ہمیشہ تعجیل فرماتے (البخاری، ۱ : ۴۸۸ ، ۳۰/۴۵ ؛ مسلم ، حدیث ۱۰۹۸) آپؐ کا ارشاد تھا کہ جب تک امت روزے کی افطاری میں تعجیل کرتی رہے گی اس وقت تک وہ خیر پر رہے گی- روزہ عموماً کھجور یا پانی سے افطار فرماتے (الترمذی ، ۳ : ۷۹، حدیث ۶۹۵ ؛ ابو داود ، ۲ : ۷۶۴ ، حدیث ۲۳۵۵ ببعد) - افطار کے وقت کبھی تو فرماتے : ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ (ابو داود ۲ : ۷۶۵ ، حدیث ۲۳۵۷) اور کبھی یہ دعا پڑھتے : اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَ عَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ (حوالۂ مذکور).

۵- معمولات حج و عمرہ : آپؐ نے ہجرت سے قبل جو حج اور عمرے کیے ان کی صحیح

تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے (ابن حزم : جوامع السیرۃ ، ۱ ، ص ۱۵) ۔ ہجرت کے بعد آپؐ نے صرف ایک حج اور دو مفرد عمرے (عمرۃ القضا : سنہ ۷ھ/۶۲۹ء ، عمرہ از جعرانہ ، ۸ھ/۶۳۰ء) اور ایک عمرہ قران (حجۃ الوداع کے ساتھ) ادا فرمائے (تفصیل کے لیے دیکھیے ابن سید الناس : تاریخ الخمیس ۲ : ۲۸؛ ابن قیم ، زاد المعاد ، ۲ : ۹۷ تا ۱۰۰ ؛ ابن کثیر ، ۵ : ۲۱۵) ۔ ابن سید الناس، ابن کثیر (حوالہ مذکور) اور دوسرے بہت سے سیرت نگاروں نے عمر، صلح حدیبیہ کو شمار کر کے ان عمروں کی تعداد چار تک بیان کی ہے .

جب آپؐ حج ، عمرے یا جہاد کے سفر کے لیے روانہ ہوتے تو سب سے پہلے اپنی جگہ کسی کو مدینہ منورہ میں قائم مقام امیر مقرر فرماتے ؛ چنانچہ عمرہ صلح حدیبیہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر ابن ام مکتوم کو اور عمرہ قضا کے موقع پر ابو رُہم الانصاری کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا (دوسرے مواقع کے امیروں کے لیے دیکھیے ، الواقدی ، ۱ : ۷ تا ۸ ، مطبوعہ آکسفرڈ) ۔ اپنی ازواج میں سے عموماً ایک (بعض اوقات ایک سے زائد) کو اپنے ساتھ لے جاتے ، لیکن اس کا فیصلہ بجائے خود کرنے کے، قرعہ اندازی کے ذریعے فرماتے (البخاری، ۶۴/۳۴، ۳ : ۱۰۴، کتاب المغازی) عموماً حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو زیادہ ہم رکابی کا شرف حاصل ہوتا تھا .

گھر سے عموماً پیر یا جمعرات کو نکلتے (ابن الجوزی ، ۲ : ۶۵۹ ، ، صرف یوم الخمیس : ابو داؤد ۳ : ۷۹ ، حدیث ۲۶۰۵) اور عموماً فجر کے تڑکے نکلنے کا معمول تھا (الترمذی ، ۳ : ۵۱۷ ، حدیث ۱۲۱۲؛ ابو داؤد، ۳ : ۷۹، حدیث ۲۶۰۶)۔ اکیلے سفر کے بجائے آپؐ جماعت (دو یا زائد افراد) کی صورت میں اور باقاعدہ ایک امیر کے تحت نکلنے کو پسند فرماتے تھے۔ اگر آپؐ کسی قافلے میں شامل ہوتے تو اس کے امیر تو آپؐ ہی ہوتے ، ورنہ آپؐ امیر کا تقرر بھی فرماتے۔ الوداع کے وقت آپؐ فرماتے : استودع اللہ دینکم و امانتکم و خواتم اعمالکم (ابو داود ، ۳ : ۷۷ ، حدیث ۲۶۰۱ ؛ الترمذی ، ۵ : ۴۹۹ ، حدیث ۳۴۴۲ تا ۳۴۴۳)۔ جب آپؐ سواری کے رکاب پر پاؤں رکھتے تو فرماتے : بسم اللہ ؛ پھر جب سواری پر اچھی طرح بیٹھ جاتے تو یہ دعا فرماتے : سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ، الحمد للہ (تین مرتبہ) اللہ اکبر (تین مرتبہ) لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ سُبْحٰنَکَ اِنِّی ظلمت نفسی فاغفرلی فانہ لایغفر الذنوب الا انت ، (ابن قیم : زاد المعاد ، ۳ : ۳۴۵ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۷۷ ، حدیث ۲۶۰۲)۔ اسی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ اس دعا کے بعد مسکراتے ، پوچھا جاتا تو فرماتے خدا اپنے اس بندے کو پسند فرماتا ہے جو یہ کہتا ہے (اے رب) میرے گناہوں کی مغفرت فرما، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخش سکتا (الترمذی، ۵ : ۵۰۱، حدیث ۳۴۴۶)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مطابق سواری پر بیٹھ جانے کے بعد یہ دعا پڑھتے : اللہ اکبر (تین مرتبہ) ، سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ؛ اللھم انا نسألک فی سفرنا ھذا البر والتقوی و من العمل ما ترضی؛ اللھم ھوّن علینا سفرنا ھذا واطوِعنّا بُعدہ؛ اللھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی الاھل ؛ اللھم انی اعوذ بک من وعثاء السفر و کآبۃ المنظر و سوء المنقلب فی المال والاھل اور جب سفر سے واپسی ہوتی تو یہ اضافہ فرماتے : آیبون ان شاء اللہ، تائبون عابدون لربنا حامدون (مسلم ، ۲ : ۹۷۸ ، حدیث ۱۳۴۲ ؛ معمولی اختلاف کے ساتھ : الترمذی ، ۵ : ۵۰۲ ، حدیث ۳۴۳۸ تا ۳۴۳۹) ۔ دوران سفر میں ہر بلندی کو چڑھتے اور ہر نشیب کی طرف اترتے ہوئے تکبیر کا ورد جاری

رکھتے تھے (الترمذی ، ۵ : ۵۰۰ ، حدیث ۳۴۴۵) - جب کسی جگہ پڑاؤ کرتے تو فرماتے : اعوذ بکلمات اللہ التّامّات من شرّ ما خلق (کتاب مذکور، ص ۴۹۶، حدیث ۳۴۳۷) - حج اور عمرے کے سفروں میں آپؐ ذوالحلیفہ کے مقام [رک بہ میقات] سے احرام باندھتے (مسلم ، ۲ : ۸۸۷ ، حدیث ۱۲۱۸) - تمام راستے تکبیر و تہلیل اور تلبیہ کا ورد جاری رکھتے (حوالۂ مذکور)- مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے قبل آپؐ ذو طوای میں شب باشی کر کے صبح غسل کرکے پھر مکہ مکرمہ کی طرف بڑھتے (مسلم ، ۲ : ۹۱۹، حدیث ۱۲۵۹)- مکہ مکرمہ میں آپؐ ثنیۃالعلیا سے داخل ہوتے اور ثنیہالسفلیٰ سے باہر نکلتے (مسلم ، ۲ : ۹۱۸، حدیث ۱۲۵۹)- بیت اللہ شریف پر نظر پڑتی تو تکبیر و تہلیل پڑھتے (ابو داؤد ، ۲ : ۴۳۸ ، حدیث ۱۸۷۲) اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے: اللھم زد ھذا البیتَ تشریفاً و تعظیماً و تکریماً و مہابۃً و زد من شرفہ و کرمہ ممن حجّہ او اعتمرہ تشریفا و تعظیماً و تکریماً (عبدالحی لکھنوی : حاشیہ ھدایہ ، ۱ : ۲۲۱، شمارہ ۱۰ ، بحوالۂ امام شافعی) - مسجد میں داخل ہوتے ہی آپؐ سیدھے حجر اسود کے پاس آتے ؛ اس کے سامنے کھڑے ہو کر تکبیر و تہلیل فرماتے اور اسے چومتے (ابو داؤد ، ۲ : ۴۳۹ ، حدیث ۱۸۷۳) - پھر بیت اللہ شریف کا طواف فرماتے - طواف کے ہر چکر میں حجر اسود کے استلام کو دہراتے ، نیز رکنین یمانین کو بھی ہاتھ سے چھوتے اور دعائیں پڑھتے (کتاب مذکور ، ۲ : ۴۴۰ ، حدیث ۱۸۷۳ و ۱۸۷۶)- طواف اور استلام حجر اسود سے فارغ ہو کر دروازے اور رکن کے مابین کھڑے ہو کر اپنا سینہ ، چہرہ اور دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت پھیلا کر بیت اللہ شریف کی دیواروں پر رکھتے اور جہنم کے عذاب سے پناہ مانگتے (ابن ماجہ ، حدیث ۲۹۶۲ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۴۵۲ ، حدیث ۱۸۹۹) - پھر مقام ابراھیم پر کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا فرماتے جن میں سورہ الکافرون اور سورہ اخلاص تلاوت فرماتے تھے (مسلم ، ۲ : ۸۸۸ ، حدیث ۱۲۱۷) - وھاں سے باب بنی مخزوم ، یعنی باب الصّفا سے صفا مروہ کی طرف نکل جاتے اور صفا مروہ کے مابین سعی فرماتے - ہر چکر میں دعاؤں اور اوراد کا سلسلہ جاری رہتا (حوالۂ مذکور) اور اسی طرح بقیہ مناسک حج ادا فرماتے - [حج اور عمرہ کے دیگر مناسک کے لیے رک بہ حج ؛ عمرہ ؛ احرام ؛ تلبیہ ؛ قربانی وغیرہ] .

مناسک حج سے فراغت کے بعد آپؐ اپنی اور اپنے اھل و عیال کی طرف سے متعدد جانور ذبح فرماتے - حجۃ الوداع میں آپؐ نے اپنی طرف سے ۱۰۰ اونٹ قربان کیے جن میں سے ۳۰ اونٹ اپنے مبارک ہاتھوں سے ذبح فرمائے (ابو داؤد، ۲ : ۳۶۷، حدیث ۱۷۶۱، ۴۵۵ تا ۴۶۴ ، باب صفۃ حجۃ النبیؐ، حدیث ۱۹۰۵) باقی حضرت علیؓ نے ذبح کیے .

مدینہ منورہ کے لیے واپسی کے دوران میں بھی تکبیر و تہلیل کا سلسلہ جاری رہتا - جب مدینہ کے پاس ثنیّہ یا مقام فدفد پر پہنچتے تو یہ دعا پڑھتے : "اللہ اکبر (تین مرتبہ) ، لا الہ اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہُ الملک و لہُ الحمد و ھو علی کل شیءٍ قدیر آیبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ و نصر عبدہ و ھزم الاحزاب وحدہ (مسلم ، ۲ : ۹۸۰، حدیث ۱۳۴۴)- دوسری روایت کے مطابق آپؐ واپسی کے سفر کے دوران میں ہر بلندی و پستی کے موقع پر مذکورہ دعا پڑھتے - آپؐ یہ التزام فرماتے تھے کہ مدینہ منورہ میں آپؐ کی واپسی (چاشت) کے وقت ہو۔ آپؐ سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا کر کے وھیں بیٹھ رہتے؛ لوگ حال احوال اور مسائل پوچھنے آتے رہتے ؛ ان سے فارغ ہو کر آپؐ گھر میں تشریف لے جاتے (ابن الجوزی ، ص ۶۶۳ تا ۶۶۴).

۶- معمولات سفر : [نیز رک بہ معمولات حج و عمرہ] آپؐ سفر کے دوران میں (خاص طور پر سفر جہاد میں) رات کے پر سکون لمحات میں سفر کرنا زیادہ پسند فرماتے تھے (ابو داؤد) - سفر کرتے ہوئے سواری کو تیز تیز ہانکتے (ابن الجوزی ، ص ۶۶۱) - دوران سفر میں اپنی سواری پر بیٹھ کر خواہ اس کا کسی طرف بھی رخ ہوتا نوافل ادا فرماتے (حوالہ مذکور) .

۷- معمولات دعا : دعا کو آپؐ عبادت کا مغز (مُخ) قرار دیتے تھے (الترمذی ، ۵ : ۴۵۶ ، حدیث ۳۳۷۱) ؛ نیز فرماتے تھے کہ اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ مکرّم کوئی چیز نہیں (کتاب مذکور ، حدیث ۳۳۷۰) ؛ آپؐ فرماتے تھے جو خدا سے نہیں مانگتا ، خدا اس پر غضب ناک ہوتا ہے (کتاب مذکور، حدیث ۳۳۷۳) - صحابہؓ فرماتے ہیں کہ خود آپؐ کو دعا کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ آپؐ ہاتھ اٹھا کر یوں عاجزی سے دعا مانگتے جس طرح کوئی مسکین کھانا طلب کرتا ہے (ابن الجوزی، ص ۵۴۷) - آپؐ کا فرمان تھا کہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پھیلا کر دعا مانگنی چاہیے ، نہ کہ ہاتھ الٹے کر کے (ابو داؤد ، ۲ : ۱۲۵ ، حدیث ۱۴۸۴)۔ حضرت ابن عباسؓ کے بقول دعا کے وقت ہاتھ کندھوں کے برابر ہونے چاہئیں (حوالۂ مذکور)؛ حضرت عائشہؓ کے مطابق آپؐ صرف جامع دعائیں مانگتے تھے (ابو داؤد ، ۲ : ۱۶۳ ، حدیث ۱۴۸۲) اور آپؐ دوسروں کو بھی یہی تلقین فرماتے ، مثلاً آپؐ نے فرمایا: جب تم خدا سے جنت طلب کروگے تو اس میں جو کچھ بھی ہے تمہیں مل جائے گا؛ اسی طرح جب تم جہنّم سے پناہ مانگو گے تو جو کچھ اس میں ہے اس سے تمہیں پناہ حاصل ہو جائے گی (کتاب مذکور، ۲ : ۱۶۲ ، حدیث ۱۴۸۰)۔ آپؐ فرماتے تھے کہ اللہ تعالٰی کے اسماے حسنٰی کے ساتھ جس نے دعا مانگی وہ ضرور قبول ہوگی (ابو داؤد، ۲: ۱۶۶ تا ۱۶۸ ، حدیث ۱۴۹۳ تا ۱۴۹۶) - دعا کے بارے میں آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ سب سے پہلے اللہ عزّ و جل کی بزرگی اور اس کی ثنا بیان کی جائے ؛ پھر اس کے نبیؐ پر درود پڑھا جائے ؛ پھر جو چاہے اللہ سے دعا کی جائے (کتاب مذکور ، ۲ : ۱۶۲ ، حدیث ۱۴۸۱) - آپؐ دعا میں اِنْ شِئْتَ (اگر تو چاہے) کے بجاے عزیمت یعنی پختگی کے ساتھ مانگنے پر زور دیتے تھے (مسلم، ۴ : ۲۰۶۳ ، حدیث ۹-۲۶۷۸) - آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو مسلمان اپنے بھائی کے لیے اس کے پس پشت دعا مانگتا ہے تو ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے جو اس کی دعا پر آمین کہتا ہے اور نیز یہ دعا مانگتا ہے کہ یہ نعمت دعا کرنے والے کو بھی حاصل ہو (مسلم ، ۴ : ۲۰۹۴ ، حدیث ۲۷۳۲ و ۲۷۳۳).

آپؐ صبح و شام کے ہر معمول کو دعا سے شروع فرماتے اور دعا ہی پر ختم فرماتے تھے - آپؐ کی یہ دعائیں کتب احادیث و سیر میں ہر موقع کے لیے الگ الگ اور بڑی تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں - صرف نماز میں سات مواقع پر آپؐ کا معمول دعا مانگنے کا تھا : (۱) تکبیر تحریمہ کے بعد ؛ (۲) رکوع سے قبل اور قراءت کے بعد ؛ (۳، ۴) رکوع اور سجدے میں : مثلاً سبحانک اللھم ربنا و بحمدک اللھم اغفرلی؛ (۵) قومہ میں ؛ (۶) دونوں سجدوں کے درمیانی قعدے میں ؛ (۷) سلام سے قبل (مسلم و البخاری ، نیز ابن القیّم) (تفصیل کے لیے دیکھیے کتب حدیث میں، کتب دعا).

۸- معمولات جہاد : مدنی زندگی میں آپؐ کو بار بار دشمنان اسلام کے خلاف صف آرا ہونا پڑا اور فوجی دستوں کی قیادت کرنا پڑی - جنگ ہوش و عقل کے بجاے جوش و جذبے سے لڑی جاتی ہے ، مگر ہمیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی سیرت طیبہ میں ان مواقع پر بھی اعتدال و توازن نظر آتا ہے - جہاد کے لیے آپؐ حسب ذیل باتوں کا اہتمام فرمایا کرتے تھے :

حسب ارشاد خداوندی: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (۹ [الانفال] : ۶۰) - جنگ پر روانہ ہونے سے پہلے آپؐ اس جنگ کے لیے تمام ممکنہ وسائل بہم پہنچاتے تھے - موجود افرادی قوت میں سے جتنی ضرورت ہوتی اس کے مطابق رضاکاروں کا انتخاب فرما لیتے - چند جنگوں (مثلاً غزوہ تبوک وغیرہ) میں ہر مسلمان عاقل بالغ کا جنگ کے لیے حاضر ہونا لازمی تھا - ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے لیے دشمن کی تعداد (ابتداءً: دس ، مگر بعد ازاں دو ، کے مقابلے میں ایک : ۹ [الانفال] : ۶۵) کی مناسبت سے افرادی قوت کا تعین فرماتے ؛ افرادی قوت کےساتھ ساتھ تمام ممکنہ عسکری وسائل (اسلحہ ، مویشی اور باربرداری کے جانوروں) کا بھی پورا پورا انتظام فرماتے - ایسے مواقع پر صحابہؓ سے دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل کی جاتی ؛ پھر اس تمام جمع شدہ پونجی سے سامان جنگ خرید کر مجاہدین میں تقسیم فرماتے - سپاہیوں کو آپؐ کی تعلیم یہ تھی کہ صرف اور صرف اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کریں (البخاری ، ۲ : ۲۰۵ ؛ مسلم ، ۳ : ۱۵۱۲ تا ۱۵۱۳ ؛ حدیث ۱۹۰۴ ؛ الترمذی، حدیث ۱۶۴۶)، لیکن جنگ جیتنے کی صورت میں مال غنیمت میں سے حصہ دینے کا بھی وعدہ فرماتے [رک بہ انفال ؛ فیء ؛ غنیمت] - جہاد کی تیاری کے ضمن میں ہتھیاروں کی صفائی (ابو داؤد، ۳ : ۹۶، حدیث ۲۵۸۳) اور گھوڑوں اور جوانوں کی دوڑ کا بندوبست بھی فرماتے (ابو داؤد ۳ : ۵۴ ، حدیث ۲۵۷۵ ، ۲۵۷۸)؛ جہاں آپؐ کھڑے ہو کر گھوڑوں کی دوڑ کراتے ، وہیں بعد ازاں مسجد سبق الخیل بنی ہے .

اگر آپؐ نے خود قیادت نہ کرنا ہوتی تو آپؐ لشکر پر امیر اور نائب امیر اور بعض اوقات نائب النائب [رک بہ مؤتہ] بھی آپؐ ہی مقرر فرماتے ؛ قیادت سونپنے کا بھی وہی اصول تھا جو نماز کی امامت کے لیے مقرر تھا، یعنی آپؐ کسی صاحب علم اور پختہ عمر کے آدمی کو اس کا امیر مقرر فرماتے (البخاری ، ۲ : ۲۱۰) ، مگر بعض اوقات بہادری اور علم و فہم اور بعض دیگر خصوصیات کی بنا پر نوجوانوں کو بھی قیادت سونپ دیتے تھے (جیسے کہ حضرت اسامہؓ بن زید کو قیادت سونپی) - لشکر کو رخصت کرتے وقت مدینہ منورہ سے باہر تک تشریف لے جاتے - الوداع کرتے وقت ان کو اور ان کے دین کو اللہ کی امان میں سونپتے (ابو داؤد) - روانہ کرتے وقت یہ نصیحت فرماتے تھے کہ خدا سے ہر حال میں ڈرتے رہنا اور اپنے ساتھی مسلمانوں کی خیر خواہی کرتے رہنا - پھر آپؐ فرماتے : خدا کے نام پر کافروں کے خلاف جہاد کرنا ؛ خیانت اور بد عہدی نہ کرنا ؛ کسی کو مُثلہ نہ بنانا ؛ کسی بچے اور کسی عورت کو کو قتل نہ کرنا (البخاری، ۲ : ۲۵۱ ؛ مسلم، حدیث ۱۷۴۴) - جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کے سامنے تین باتیں پیش کرنا : (۱) اسلام قبول کرلو ؛ (۲) اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ ادا کرنا قبول کرو ؛ (۳) اگر جزیہ دینا بھی منظور نہیں کرتے تو پھر لڑنے کے لیے تیار جاؤ - اگر وہ اسلام یا جزیہ دینا قبول کر لیں تو ان سے جنگ روک دینا ؛ اگر وہ یہ باتیں قبول نہیں کرتے تو پھر اللہ کی مدد سے ان کے خلاف جہاد کرنا اور اگر تم کسی قلعے کا محاصرہ کرو اور قلعے کے لوگ اللہ اور اللہ کے رسول کی ذمہ داری پر اترنا چاہیں، تو تم ہرگز قبول نہ کرنا ، مگر یہ کہ وہ تمہاری ذمہ داری پر اترنا قبول کریں ؛ کیوں کہ اگر تم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ذمہ داری کو پورا نہ کر سکو ، تو یہ اللہ اور اللہ کے رسول کی ذمہ داری کو توڑنے سے بہتر ہے اور اسی طرح اگر کسی قلعے والے اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر اترنا قبول کریں تو ہرگز نہ ماننا ، مگر یہ کہ وہ تمہارے حکم پر اترنا منظور کریں ، کیوں کہ

تم نہیں جانتے کہ تم ان میں حکم خداوندی جاری بھی کر سکتے ہو یا نہیں (مسلم ، ۳ : ۱۳۵۷ تا ۱۳۵۸، حدیث ۱۷۳۱)۔ ایسے موقعوں پر آپؐ یہ بھی فرماتے : تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ، تنگی نہیں (کتاب مذکور، حدیث ۱۷۳۲)۔ آپؐ جنگ میں جنگی چال (خُدعہ) کے تو قائل تھے ، مگر دھوکا اور فریب (الغدر) کے ہرگز قائل نہ تھے ۔ آپؐ کا فرمان تھا کہ قیامت کے روز غدر کرنے والوں کا الگ جھنڈا ہوگا (کتاب مذکور ، حدیث ۱۷۳۵) ۔ امیر کے ساتھ ساتھ عام فوج کو بھی نصیحتیں فرماتے اور انھیں خاص طور پر اطاعت امیر کا حکم دیا جاتا (کتاب مذکور، ص ۱۴۶۵، حدیث ۱۸۳۴)۔ آخر میں دعا کر کے انھیں رخصت فرماتے (ابو داؤد).

اگر آپؐ نے خود کسی جنگ کی قیادت کرنا ہوتی تو آپؐ اپنی تمام ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ۔ آپؐ کو جب کسی طرف سے جنگی کارروائی کی اطلاع ملتی تو آپؐ اپنے خاص احباب کی مجلس مشاورت طلب فرماتے اور اس مسئلے کو سب کے سامنے پیش کرتے ؛ جو فیصلہ بھی ہوتا ، خواہ آپؐ کی مرضی کے خلاف ہو (مثلاً غزوہ احد کے موقع پر باہر نکل کر مدافعت کرنے کا فیصلہ) ، اس کی بہرحال پابندی فرماتے ۔ دشمنوں کی مدافعت کے لیے جو بھی تدبیر سوچی جاتی آپؐ اس تدبیر کی انجام دہی میں صحابہؓ کے پوری طرح شریک رہتے ، مثلاً خندق کھودنے میں (البخاری ، ۲ : ۲۱۰) ۔ اگر باہر نکل کر مدافعت کرنے کا فیصلہ ہوتا تو آپؐ پوری طرح زاد راہ لے کر نکلتے (البخاری، ۲ : ۲۴۳؛ باب حمل الزاد فی الغزو).

جب لشکر مدینہ منورہ سے باہر ڈیرے ڈال دیتا تو اپنے لشکر کا جائزہ لیتے؛ اگر کوئی اس میں نابالغ ہوتا (مسلم ، ۳ : ۱۴۹۰ ، حدیث ۱۸۶۸) یا اگر کوئی ماں باپ کی مرضی کے خلاف شریک جہاد ہونا چاہتا (ابو داؤد ، ۳ : ۳۸ ، حدیث ۲۵۲۹ ؛ النسائی ، حدیث ۳۱۰۵ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۲۷۸۲) تو اسے واپس بھیج دیتے؛ بقیہ لشکر کو لے کر روانہ ہوجاتے .

روانگی کے دوران میں دشمن کی نقل و حرکت سے باخبر رکھنے کے لیے آدمی مقرر فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۱۲ ؛ ابو داؤد ۳ : ۲۱ ، حدیث ۲۵۰۱) ۔ اگر قریبی علاقے میں دشمن کے کسی جاسوس کی اطلاع ملتی تو اسے ڈھونڈھ نکالتے (البخاری ، ۳ : ۱۳۷؛ مسلم ، ۴ : ۱۹۴۱، حدیث ۲۴۹۴ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۱۱۰، حدیث ۲۶۵۰).

آپؐ جنگی معلومات کو نہایت خفیہ رکھتے یہاں تک کے آپؐ کے انتہائی قریبی ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ آپؐ کا ارادہ کدھر کا ہے (غزوہ تبوک اس کلیے سے مستثنیٰ ہے) ۔ راستے میں آپؐ تیز تیز چلنا پسند فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۴۷)۔ رات کے آخری پہر میں سفر کرنا آپؐ کو زیادہ پسند تھا (ابو داؤد ، ۳ : ۷۹، حدیث ۲۶۰۴)۔ راستے میں اونٹوں اور دوسرے جانوروں کی گردنوں سے گھنٹیاں (جرس) اتروا دی جاتیں (البخاری، ۲:۲۴۸؛ ابو داؤد، ۳ : ۵۳ ، حدیث ۲۵۵۴) ۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ دشمن آپؐ کے اچانک پہنچ جانے سے حواس باختہ ہو جائے اور یوں خونریزی کی نوبت نہ آنے پائے .

اگر کسی جگہ رات بسر کرنے کا فیصلہ ہوتا تو رات کے پہرے داروں نیز ارد گرد کے علاقے پر دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے نگران افراد کا تقرر فرماتے (البخاری ، ۲ : ۲۲۰ ؛ ابو داؤد ، ۳:۲۱، حدیث ۲۵۰۱) ۔ رات راستے سے ہٹ کر بسر کی جاتی ۔ دشمن کے متوقع حملے کی وجہ سے حالت جنگ کے علاوہ پہرے دار دستوں کے (بعض اوقات الگ الگ) شعائر مقرر فرماتے ، تا کہ ایک دوسرے اور دوست دشمن کی شناخت میں آسانی رہے (ابو داؤد ، ۳ : ۷۳ ، حدیث ۲۵۹۵ ببعد) ۔ حملے کے لیے ، رات ہوتی تو

صبح کا اور صبح ہوتی تو دوپہر ڈھلنے کا انتظار فرماتے (البخاری، ۲ : ۲۳۹ ؛ ابو داؤد، ۳ : ۱۱۳، حدیث ۲۶۵۵ ؛ الترمذی، حدیث ۱۶۱۲) - اگر اس بستی میں مسجد کے کوئی آثار دکھائی دیتے یا اذان کی آواز سنائی دیتی تو حملہ موقوف کر دیتے (البخاری، ۲ : ۲۳۵) اور اگر اس بستی میں سے اسلام کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تو مقررہ وقت پر بلند آواز سے اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیتے (ابو داؤد، ۳ : ۱۱۴، حدیث ۲۶۵۶) - حملہ کرنے سے قبل آپ ؐ یہ دعا پڑھتے : اللّٰھم مُنزِلَ الکتاب مُجرِیَ السَّحاب و ھازِمَ الاحزاب ! اِھزِمھم و انصرنا علیھم (البخاری، ۲ : ۲۳۹) - نیز حملے سے قبل : اللّٰھمَّ اَنتَ عضدی و نصیری، بک اَحُول و بک اصول و بک اُقاتل (ابو داؤد، ۳ : ۹۶، حدیث ۲۶۳۲) بھی پڑھنے کا معمول تھا۔ ان مختصر دعاؤں کے علاوہ نماز فجر میں قنوت نازلہ (جس سے متعلقہ تمام بحثوں کے لیے دیکھیے : ابن القیم: زاد المعاد، ۱ : ۲۷۳ تا ۲۸۳، مطبوعۂ کویت ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) اور خطبات میں نصرت خداوندی کے حصول اور اسلام کی فتح و نصرت کے لیے لمبی لمبی دعائیں بھی ضرور مانگتے - اس وقت آپ ؐ پر ایسی رقت طاری ہوتی کہ صحابہ ؓ آپ ؐ پر ترس کھاتے (دیکھیے - غزوۂ بدر، ابن ہشام)۔ خیبر پر حملے کے وقت: "اللہ اکبر خربت خیبر، و انّا اذا نزلنا بساحۃ قوم فساء صباح المنذرین" (البخاری، ۲ : ۲۳۶) آپ ؐ کی زبان پر جاری تھا - آپ ؐ صحابہ کرام ؓ کو یہ تاکید فرمایا کرتے کہ اگرچہ دشمن تم پر حملہ کر چکا ہو، پھر بھی اگر وہ تمہارے حملے کے وقت کلمہ پڑھ لے تو اس سے تلوار فوراً اٹھا لی جائے (ابو داؤد، ۳ : ۱۰۴، حدیث ۲۶۴۴ ؛ مسلم، ۱ : ۹۵، حدیث ۹۵)۔ حملے سے قبل صحابہ ؓ کو مختلف مقامات پر تعینات فرماتے اور یہ تاکید کرتے کہ فتح ہو یا شکست تم اپنی جگہ ہرگز نہ چھوڑنا (ابو داؤد، ۳ : ۱۱۸، حدیث ۲۶۶۳) - جنگ کے میدان پر آپ ؐ کی نظر اس قدر حاوی ہوتی تھی کہ جنگ بہر صورت آپ ؐ کے مرتب کیے ہوئے نقشے کے مطابق ہی لڑی جاتی۔

جنگ کے دوران میں آفاقی اور قدرتی مظاہر سے بھی مدد لیتے - عام طور پر آپ ؐ سورج کو اپنے پیچھے اور دشمن کو اپنے آگے رکھتے ؛ ہوا کے رخ سے حملہ کرتے تاکہ گرد و غبار مسلم سپاہیوں کے بجائے دشمن کو پریشان کرے (ابو داؤد، ۳ : ۱۱۳، حدیث ۲۶۵۵) - آپ ؐ صحابہ ؓ کو یہ تاکید فرماتے کہ تاک تاک کر تیر چلاؤ، (زیادہ اسلحہ ضائع نہ کرو) اور تلوار اس وقت نکالو جب دشمن تمہارے سر پر پہنچ جائے (ابو داؤد، ۳ : ۱۱۸، حدیث ۲۶۶۴)۔ جنگ کے دوران میں مسلم خواتین کو بھی آپ ؐ ہمراہ لاتے تاکہ وہ زخمیوں کو پانی پلائیں اور اگر ضرورت پڑے تو انھیں اٹھا کر مدینہ منورہ یا مرکز عسکر تک پہنچا آئیں (مسلم، ۳ : ۱۴۴۲ تا ۱۴۴۴، حدیث ۱۸۰۹ تا ۱۸۱۲ ؛ الترمذی ۴ : ۱۳۹، حدیث ۱۵۷۵ ؛ ابو داؤد، ۳ : ۴۰، حدیث ۲۵۳۱)، دوران جنگ میں آپ ؐ ہمیشہ دشمن سے متصل سب سے اگلی صفوں میں ہوتے اور حضرت علی ؓ جیسے شجاع بھی جنگ کی شدت میں آپ ؐ کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے (ابن الجوزی، الوفا، باب شجاعت النبی) ؛ اسی طرح خطرات کے موقع پر آپ ؐ سب سے آگے ہوتے (البخاری، ۱۱۶/۵۶، ۲ : ۲۴۰) - آپ ؐ ہمیشہ بزدلی اور جبن سے پناہ مانگتے (البخاری، ۲ : ۲۰۷) - لڑائی میں اگر اور شدت آ جاتی اور آپ ؐ کی سواری مضطرب ہونے لگتی تو آپ ؐ سواری سے کود کر نیچے آ جاتے (البخاری، ۳ : ۱۴۸، ۵۴/۶۴ ؛ ابو داؤد، ۳ : ۱۱۴، حدیث ۲۶۵۸) - فتح ہوتی یا ہزیمت آپ ؐ اپنی جگہ سے ایک انچ پیچھے ہٹنا بھی پسند نہ فرماتے - لڑائی کے دوران میں اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھاتے اور فرماتے : ارموا و

ارکبوا (ابو داؤد، ۳ : ۲۹، حدیث ۲۵۱۲) کبھی ارشاد ہوتا : یا خیل اللہ ارکبی (حوالۂ مذکور).

اگر خدا تعالیٰ کی مدد سے آپ[ص] کو فتح ہو جاتی تو سجدۂ شکر بجا لاتے (الترمذی، ۴ : ۱۴۱، حدیث ۱۵۷۸؛ ابو داؤد، ۳ : ۲۱۶، حدیث ۲۷۷۴) اور اس جگہ قیام عدل و انصاف کے لیے کم از کم تین ایام تک قیام فرما رہتے (البخاری، کتاب الجہاد؛ الترمذی، ۴: ۱۲۱ حدیث ۱۵۵۱؛ الدارمی، حدیث ۲۴۶۱؛ ابو داؤد، ۳: ۱۴۴) - علاقے کا مناسب بند و بست کرکے اور علاقے میں کسی امیر کا تقرر فرما کر، مال غنیمت سمیت آپ[ص] بخیر و عافیت واپس تشریف لاتے، جہاں مدینہ کے لوگ شہر سے باہر نکل کر آپ[ص] کا استقبال کرتے (ابو داؤد، ۳ : ۲۱۹، حدیث ۲۷۷۹؛ البخاری، الجہاد، باب ۱۹۶، ۴ : ۳۱۸، الترمذی؛ حدیث ۱۷۱۸ [مزید تفصیلات کے لیے رک بہ غزوات نبوی]).

۹- معمولات ملاقات [دیکھیے شمائل و اخلاق نبوی : دوستوں سے آپ[ص] کا سلوک].

۱۰- معمولات عیادت و تعزیت [دیکھیے شمائل و اخلاق نبوی : بیماروں سے آپ[ص] کا سلوک].

۱۱- معمولات خطابت [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت خطیب].

۱۲- معمولات تبلیغ و رسالت [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم بحیثیت مبلّغ].

۱۳- معمولات عدل و انصاف [دیکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنّن؛ شمائل و اخلاق].

(ج) شمائل و اخلاق نبوی[ص]: یوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں اور خطوں میں جو انبیاے کرام[ع] بھی مبعوث ہوے، وہ سب کے سب حسن اخلاق اور اعلیٰ کردار کا جامع نمونہ تھے، جن سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو ہمیشہ اخلاق اور اعلیٰ کردار کی رہنمائی حاصل ہوتی رہی ہے؛ ارشاد باری ہے : اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰىھُمُ اقْتَدِہْ (۶ [الانعام] : ۹۱)، یعنی یہ انبیا[ع] وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے ہدایت دی تھی تو تم انھی کی ہدایت کی پیروی کرو - انبیاے کرام[ع] کے اعلیٰ و ارفع اخلاق کے حامل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ اہل دنیا ان کی پیروی سے اپنے معاشرے کو باہمی بھائی چارے اور الفت و محبت کے جذبوں سے معمور رکھیں : وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (۴ [النسآء] : ۶۴)، یعنی ہم رسول اس لیے بھیجتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی پیروی کی جائے؛ مزید فرمایا : قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (۶۰ [الممتحنۃ]: ۴)، یعنی بے شک تمھارے لیے ابراہیم[ع] اور ان کے رفقا عمدہ نمونہ ہیں - ان تمام انبیاے کرام[ع] میں، سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ[ص] کی ذات اقدس پر تمام انبیا کے مکارم اخلاق کی عظیم الشان طریقے پر تکمیل ہو گئی - خود آپ[ص] کا ارشاد ہے : بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاق (کنز العمال، ۲ : ۵، مطبوعہ حیدر آباد دکن) یا حسن الاخلاق (مالک : موطأ، باب حسن الخلق) یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا میں مکارم اخلاق کی تکمیل کر دوں (نیز دیکھیے مشکوٰۃ المصابیح، ۳ : ۱۲۹، حدیث ۴۷۷۰) - قرآن کریم میں آپ[ص] کے حسن کردار کی تعریف میں کہا گیا : وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۶۸ [القلم] : ۴)، یعنی اور بلاشبہ آپ[ص] عظیم اخلاق کے حامل ہیں - "خلق عظیم" کے جملے میں جو ظاہری اور معنوی محاسن جمیلہ پوشیدہ ہیں انھیں کی بنا پر دنیاے انسانیت کو بلا امتیاز رنگ و نسل آپ[ص] کی اتباع اور آپ[ص] کی پیروی کرنے کی تلقین کی گئی ہے : لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۳۳ [الاحزاب] : ۲۱)، یعنی البتہ تمھارے لیے آپ[ص] کی ذات اقدس میں عمدہ نمونہ موجود ہے - صرف یہی نہیں

بلکہ آپؐ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا: مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ (۴ [النساء] : ۸۰)، یعنی جو شخص آپؐ کی فرمانبرداری کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی؛ دوسری جگہ آپؐ کی پیروی کرنے والوں کو اللہ کی طرف سے محبت اور بخشش کی نوید سنائی گئی: قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (۳ [آل عمرٰن] : ۳۱)، یعنی اے پیغمبر! آپؐ کہہ دیجیے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

آپؐ کے مکارم اخلاق اور عادات حسنہ کے اپنے ہی نہیں، بلکہ دشمن بھی مداح تھے، قرآن کریم میں ہے: قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللهِ يَجْحَدُونَ (۶ [الانعام] : ۳۳)، یعنی بے شک ہمیں خوب معلوم ہے کہ ان (کافروں) کی باتیں آپؐ کو رنج پہنچاتی ہیں، مگر یہ آپؐ کی تکذیب نہیں کرتے، بلکہ یہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ بعثت مبارکہ سے پہلے آپؐ کو مکہ مکرمہ میں اسی بنا پر محمدؐ کے بجائے "الامین" اور "الصادق" کے نام سے پکارا جاتا تھا؛ یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنی امانتیں سونپنے کے لیے آپؐ کے سوا کوئی شخص موزوں نظر نہ آتا تھا اور آپؐ کا گھر اچھا خاصا "دارالامانت" بنا ہوا تھا۔ اسی بنا پر آپؐ کو ہجرت [رک بآں] کے موقع پر حضرت علیؓ کو یہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچانے کے لیے پیچھے چھوڑنا پڑا اور انھوں نے تین دن میں یہ امانتیں ان کے وارثوں کو پہنچائیں۔ ابو سفیان سے ان کے زمانۂ کفر میں قیصر روم نے آپؐ کے بارے میں پوچھا: کیا نبوت سے پہلے آپؐ نے کبھی جھوٹ بولا ہے؟ ابو سفیانؓ نے کہا: نہیں؛ پھر اس نے پوچھا کہ کیا کبھی آپؐ نے کسی سے دھوکا کیا ہے؟ ابو سفیان نے کہا: نہیں (البخاری، ۱: ۷، کتاب ۱، باب ۶)۔ حضرت ابو ذرؓ غفاری کے بھائی اُنَیسؓ نے آپؐ کو مکہ میں دعوت و تبلیغ میں مصروف دیکھا تو اپنے بھائی ابو ذرؓ کو جا کر بتلایا: میں نے دیکھا کہ آپؐ لوگوں کو اعلیٰ اخلاق اپنانے کا سبق دیتے ہیں (مسلم، ۴: ۱۹۲۳، حدیث ۲۴۷۴؛ البخاری، ۴: ۱۲۱، الادب)۔ بیت اللہ کی تعمیر نو کے موقع پر جب اہل مکہ نے ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواریں کھینچ لی تھیں تو یہ آپؐ ہی تھے جنھیں دیکھ کر قریش نے کہا تھا: هذا الامين قد رضينا بما قضى بيننا (ابن سعد، ۱: ۱۳۶) یعنی یہ تو امین ہیں، ہم ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

آپؐ کے کردار کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپؐ کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے وہ سب آپؐ کے حسن کردار کے مدّاح ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ (م ۱۰ نبوی ۳ ق ھ/۶۱۹ء) نے آپؐ کے ساتھ تقریباً ۲۵ سال بسر کیے؛ ان کا کہنا ہے کہ آپؐ صلہ رحمی کرنے والے، مقروض کا بوجھ اٹھانے والے، محتاج کو کما کر دینے والے، مہمان نوازی کرنے والے اور مصائب میں لوگوں کے مددگار تھے (البخاری، ۱: ۵، کتاب بدء الوحی)۔ حضرت عائشہؓ کو تقریباً دس سال تک آپؐ کے انتہائی قریب رہ کر اخلاق عالیہ کے مشاہدے کا موقعہ ملا۔ ان سے کسی نے آپؐ کے اخلاق کی بابت پوچھا تو فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے، کیونکہ قرآن ہی آپؐ کا اخلاق تھا (ابن سعد، ۱: ۳۶۴)، یعنی جو کچھ قرآن نے کہا آپؐ نے سب سے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہو کر دکھایا۔ ایک موقع پر انھوں نے آپؐ کے اخلاق حسنہ کی یوں تعریف کی: آپؐ تمام لوگوں میں سب سے عمدہ اخلاق والے تھے؛ آپؐ نہ تو قصداً اور نہ بلا قصد فحش گوئی کرتے؛ نہ بازاروں میں

شور و غوغا کرتے اور نہ ہی برائی کا بدلہ برائی سے دیتے ، بلکہ آپ ؐ معاف کرنے اور درگزر کرنے والے تھے (الترمذی : شمائل ، ص ۳۷۸ ، بمع شرح انوار محمدی ؛ ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۱۶) ۔ ایک دوسری روایت میں انھی سے منقول ہے کہ کوئی شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے زیادہ اچھے اخلاق والا نہ تھا؛ آپ ؐ کے ساتھیوں میں سے جس کسی نے بھی آپ ؐ کو بلایا تو آپ ؐ نے اس کی آواز پر لبیک کہا (الوفا) ۔ ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں : آپ ؐ نے اپنے کسی خادم یا خادمہ کو کبھی نہیں مارا پیٹا (مسلم : الصحیح، الفضائل ، حدیث ۲۳۲۸ ؛ ابن ماجہ : النکاح ، حدیث ۱۹۸۴) اور نہ ہی اپنے پر کسی زیادتی کا بدلہ لیا بجز اس کے کوئی اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو نظر انداز کر دے ؛ آپ ؐ کے سامنے کسی نے دو باتیں پیش نہیں فرمائیں، مگر آپ ؐ نے انھیں میں سے ، اس کے حق میں ،آسان کو پسند کیا ، بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو (الترمذی : شمائل ، ص ۳۸۹؛ ابو داؤد ، ۵: ۱۴۲ ، حدیث ۴۷۸۵ تا ۴۷۸۷ ؛ مسلم ، ۴: ۱۸۱۳ ، الفضائل ، حدیث ۲۳۲۷ ؛ الوفا ، ۲ : ۴۰۴) ۔ حضرت انس ؓ بن مالک نے دس سال تک شب و روز بطور خادم کے آپ ؐ کی خدمت میں گزارے ، وہ فرماتے ہیں : آپ ؐ نے کبھی کسی کام کو ، جو میں نے کیا ہو ، یہ نہیں فرمایا کہ یہ تو نے کیوں کیا ہے اور نہ ہی جو کام میں نے نہ کیا ہو ، اس کی بابت یہ فرمایا کہ یہ تو نے کیوں نہیں کیا (الترمذی : شمائل ، ص ۳۸۴ بمعد؛ ابن سعد (الطبقات ، ۱ : ۳۸۲) نے حضرت انس ؓ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے : میں نے آپ ؐ کی دس سال تک خدمت کی ہے ، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ ؐ (امتیازاً) اپنے ہم مجلس سے دور ہو کر بیٹھے ہوں، یا کسی مصافحہ کرنے والے سے آپ ؐ نے پہلے ہاتھ کھینچا ہو ، تا آنکہ وہ خود ہی ہاتھ نہ کھینچ لیتا ، اور یا کسی شخص نے آپ ؐ سے کھڑے ہو کر گفتگو کرنا چاہی ہو اور آپ ؐ پہلے پھر آئے ہوں ، تا آنکہ وہ خود نہ پھر جاتا . . . . یا کسی شخص نے اپنا سر (سرگوشی کے لیے) آپ ؐ کے قریب کیا ہو ، اور آپ ؐ نے اپنا سر ، اس کے اپنے سر کو ہٹانے سے پہلے ہٹا لیا ہو ؛ ایک دوسری روایت میں انہیں سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نہ تو برا بھلا کہنے والے تھے ؛ نہ فحش گو اور نہ لعن طعن کرنے والے ، جب کسی کو عتاب کرنا ہوتا تو فرماتے : اسے کیا ہو گیا اس کی پیشانی خاک آلود ہو (کتاب مذکور ، ۱ : ۳۶۹) ۔ حضرت علی ؓ ، جنھوں نے نبوت کے ۲۳ برس اور اس سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا تھا ، آپ ؐ کے خلق عظیم کی بابت فرمایا کرتے تھے : آپ ؐ خندہ جبین (دائم البشر) نرم خو اور طبعاً مہربان تھے ؛ آپ ؐ سخت مزاج اور تنگ دل قطعاً نہ تھے ؛ کوئی برا اور فحش لفظ زبان سے نہ نکالتے ، کسی کی عیب جوئی اور بدگوئی نہ کرتے ؛ جو آپ ؐ کو پسند نہ ہوتا اس سے منہ پھیر لیتے ؛ آپ ؐ نے اپنے نفس کو تین باتوں، یعنی فضول جھگڑا، تکبر اور بے معنی گفتگو سے الگ رکھا تھا ؛ دوسروں کی بابت آپ ؐ تین باتوں، یعنی کسی کی مذمت کرنے ، عیب گیری اور تجسس کرنے سے اجتناب فرماتے تھے اور وہی بات کہتے ، جو انجام کے اعتبار سے ، فائدہ مند ہوتی ؛ لوگوں کے ساتھ ہنسنے اور تعجب کرنے میں شریک رہتے ؛ مسافر اور اجنبی کی گفتگو اور سائل کے سوال کی درشتی کو نظر انداز کر دیتے . . . . آپ ؐ کو صرف سچی تعریف پسند تھی ؛ کسی کی بات کو درمیان سے کاٹنے سے گریز فرماتے (الترمذی : شمائل ، ص ۳۹۳ تا ۳۹۴) ۔ مزید فرمایا: نہایت سخی ، راست گو ، نرم طبیعت اور خوش مزاج تھے ۔ کوئی اگر اچانک دیکھتا تو ڈر جاتا ، مگر جب وہ آپ ؐ سے معاملہ کرتا تو محبت کرنے لگ جاتا

(حوالۂ مذکور) ۔ ایک اور صحابی حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ عرصۂ دراز تک آپؐ کی زیر کفالت رہے ، فرماتے ہیں : آپؐ نرم طبیعت تھے ؛ سخت گیر نہ تھے۔ کسی کی اہانت آپؐ کو کبھی منظور نہ ہوتی ؛ معمولی معمولی باتوں میں لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ؛ کسی چیز کو برا نہ کہتے ؛ کھانا ، جیسا بھی ہوتا کھا لیتے ، کبھی اسے برا نہ کہتے ؛ کبھی ذاتی معاملے میں غصہ نہ کرتے ، البتہ اگر کوئی امر حق میں مخالفت کرتا تو غضبناک ہو جاتے (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۷۰ ؛ ابن سعد ، ۱ : ۴۲۲ تا ۴۲۳)۔

حضرت عمروؓ بن العاص کو آپؐ کے انتہائی قریب رہ کر تقریباً چار سال تک اخلاق نبوی کے مشاہدے کا موقعہ ملا ۔ وہ فرماتے ہیں کہ آپؐ عام لوگوں سے گفتگو ، توجہ اور عمدہ برتاؤ کے ذریعے ایسا معاملہ فرماتے کہ اسے اپنے متعلق یہ گمان ہونے لگتا کہ اس کا درجہ آپؐ کے ہاں سب سے زیادہ ہے ۔ وہ خود اپنی بابت فرماتے ہیں کہ مجھے بھی اپنے متعلق یہ گمان ہوا تھا ؛ پھر ایک بار موقع ملا تو میں نے پوچھا : یا رسولؐ اللہ ! کیا میں (آپؐ کی نظر میں) بہتر ہوں یا ابو بکرؓ ؟ فرمایا : ابو بکرؓ ؛ پھر عرض کیا : میں بہتر ہوں یا عمرؓ ؟ فرمایا : عمرؓ ؛ پھر پوچھا : کیا میں بہتر ہوں یا حضرت عثمانؓ ؟ فرمایا : عثمانؓ ۔ آپؐ نے حقیقت واضح کر کے میری غلط فہمی دور کر دی ۔ مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں نے آپؐ سے یہ سوال نہ پوچھا ہوتا (الترمذی : شمائل ، ص ۳۸۲ تا ۳۸۳) ۔

علماے سیرت نے سیرت طیبہ کے محاسن کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے : (۱) فطری و جبلی اوصاف ؛ (۲) اکتسابی محاسن (دیکھیے قاضی عیاض : الشفا بتعریف حقوق المصطفی ، ۳۸ تا ۳۹ ، مطبوعہ بریلی ، بدون تاریخ) ۔ یہ تقسیم دوسرے انسانوں کی نسبت ہے ، ورنہ آپؐ کے لیے ان میں کوئی تفاوت نہ تھا : آپؐ کے تمام اوصاف ذاتی اور فطری تھے اور وہ آپؐ کی جبلّت و فطرت کا حصہ تھے (حوالۂ مذکور) ۔ ان تمام کی تفصیلات تو یہاں نہیں دی جا سکتیں ، البتہ ذیل میں ان میں سے چند ایک کی طرف مختصر اشارات پیش کیے جاتے ہیں :

(الف) فطری و جبلی اوصاف : (۱) جسمانی حسن و وجاہت : آپؐ کے مختلف دیکھنے والوں (مثلاً حضرت علیؓ ، انسؓ بن مالک ، ابو ہریرہؓ ، براءؓ ابن عازب ، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ ، ہندؓ ابن ابی ہالہ ، ابو حذیفہؓ ، جابرؓ بن سمرہ ، ام معبدؓ ، ابن عباسؓ ، معرضؓ بن معیقب ، ابو الطفیلؓ ، العداءؓ بن خالد ، حکیم بن حزام وغیرہ) کی یہ متفقہ شہادت ہے کہ قدرت نے آپؐ کو مردانہ حسن و وجاہت کا انتہائی حسین اور باوقار پیکر بنایا تھا ۔ حضرت براءؓ بن عازب فرماتے ہیں : میں نے کسی زلف والے کو سرخ (دھاری دار) جوڑے میں آپؐ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا (الترمذی : شمائل ، ص ۵ ، مع شرح انوار محمدی) ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہا کرتے تھے : میں نے آپؐ سے حسین کسی کو نہیں دیکھا ، لگتا تھا سورج اپنے چہرے کے ساتھ متحرک ہے ؛ جب آپؐ مسکراتے تو دیواریں کھل اٹھتی تھیں (القسطلانی : المواہب ، ۴ : ۷۳)۔ حضرت براءؓ بن عازب فرمایا کرتے تھے : آپؐ کا چہرہ تلوار کی طرح ، (پھر فرمایا) نہیں ، بلکہ چاند کی طرح چمکدار اور مدّور تھا (البخاری ، ۲ : ۳۹۲ ، المناقب)۔ حضرت کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں : جب آپؐ خوش ہوتے تو سچ مچ چاند کا ٹکڑا دکھائی دیتے (کتاب مذکور ، ۲ : ۳۹۳ ؛ قاضی عیاض : الشفا ، ۳۰) ۔ حضرت جابرؓ بن سمرہ کہتے ہیں : آپؐ کا چہرہ تلوار ، پھر کہا نہیں ، بلکہ سورج اور چاند کی طرح جگمگاتا تھا اور گولائی مائل تھا (القسطلانی ، ۴ : ۷۴) ۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ لگتا تھا

آپؐ کا بدن چاندی سے بنایا گیا (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۰۶) - اس بارے میں حضرت علیؓ کی روایت بڑی جامع ہے ؛ وہ فرماتے ہیں : جس نے آپؐ کو اچانک دیکھا، وہ دہشت زدہ ہو گیا ؛ جس نے کچھ عرصہ آپؐ کے ساتھ گزارا، وہ آپؐ سے محبت کرنے لگا - میں نے آپؐ جیسا شخص نہ کبھی پہلے دیکھا اور نہ کبھی بعد میں (الترمذی : شمائل ؛ ۱۱ ، ۱۲ ؛ مشکوٰۃ ، ۳ : ۱۳۶ ، حدیث ۵۷۹۱ نیز ص ۱۳۲ تا ۱۳۸ ؛ الزرقانی ، ۴ : ۷۰ تا ۸۰).

(۲) نظافت طبع : اس مردانہ حسن و وجاہت کے ساتھ ساتھ ، قدرت نے آپؐ کو اعلیٰ درجے کا نظیف الطبع اور نفاست پسند بنایا تھا ، آپؐ فرمایا کرتے تھے : صفائی (تو) نصف ایمان ہے (مسلم ، ۱ : ۲۰۳ ، حدیث ۲۲۳) ؛ نیز فرمایا : دین کی بنیاد ہی صفائی پر ہے (قاضی عیاض : الشفا، ص ۳۰) - آپؐ کو فطری طور پر ظاہری و معنوی گندگی سے شدید کراہت تھی ؛ اگرچہ ایک وضو [رک باں] سے متعدد نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں اور صحابہؓ کرام اکثر پڑھتے بھی تھے، مگر آپؐ اکثر ہر نماز کے لیے الگ وضو فرماتے (البخاری ، ۱ : ۶۵ ، ۶۶ ، کتاب الوضوء) - فتح مکہ کے موقع پر ایک ہی وضو سے متعدد نمازیں پڑھیں تو صحابہؓ کرام کو تعجب ہوا؛ چنانچہ حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا : یا رسول اللہ ! آپؐ نے آج وہ کام کیا ہے جو آپؐ پہلے نہیں کیا کرتے تھے - آپؐ نے فرمایا : اے عمرؓ میں نے دانستہ ایسا کیا ہے (تاکہ اس کا جواز ثابت ہو سکے) (مسلم ، ۱ : ۲۳۲ ، حدیث ۲۷۷)- ہر جمعے کو غسل کرنے کا معمول تھا - آپؐ نے صحابہؓ کرام کو بھی حکم دیا تھا کہ جمعہ کے دن غسل کر کے آیا کرو (البخاری، ۱ : ۲۲۴، کتاب الجمعۃ)- ایک روایت میں آپؐ نے اسے واجب قرار دیا (حوالۂ مذکور) - اس کے علاوہ آپؐ ہمیشہ مسواک کرنے ، کلی اور اِستنشاق کرنے کا شدت سے اہتمام فرمایا کرتے تھے (کتاب مذکور ، ص ۲۲۴ تا ۲۲۵) - جسم مبارک کو اگرچہ فطری طور پر خوشبو کی ضرورت نہ تھی ، مگر اس کے باوجود خوشبو ہمیشہ آپؐ کے استعمال میں رہی ؛ عموماً سکہ خوشبو، جو بقول علی جونپوری، بہت سی خوشبوؤں سے بنی ہوتی تھی ، آپؐ کو پسند تھی (انوار محمدی شرح شمائل ، ۲۲۶) - اگر کوئی خوشبو تحفہ دیتا تو اسے کبھی واپس نہ کرتے (حوالۂ مذکور) - آپؐ کو خوشبوؤں میں مشک ، عنبر اور عود کی خوشبوئیں زیادہ محبوب تھیں (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۵۹۲)- یوں فطری طور پر آپؐ کا جسم خوشبو کا منبع تھا اور آپؐ کے جسم اطہر سے ہمیشہ خوشبو کی لپٹیں نکلتی رہتی تھیں ؛ حضرت انسؓ کے بقول : آپؐ کے جسم مبارک کی خوشبو مشک و عنبر سے بھی زیادہ فرحت بخش ہوتی تھی (البخاری، ۲ : ۳۹۴، المناقب)- حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ جس راستے سے گزرتے تو اس راستے میں دیر تک خوشبو کی مہک بکھری رہتی (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۳۱) - حضرت علیؓ نے جب آپؐ کے جسم مبارک کو (بعد از وصال) غسل دیا - فرماتے ہیں کہ آپؐ کے بدن پر ذرہ برابر بھی میل کچیل نہ تھی ، تو میں نے کہا : آپؐ زندہ رہے تو بھی پاک اور طاہر رہے اور وصال ہوا تو بھی نظافت میں فرق نہ آیا (کتاب مذکور ، ص ۳۲) - حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ آپؐ کے پسینے کو ملا کر انتہائی نفیس خوشبو تیار کرتی تھیں (مسلم ، ۴ : ۱۸۱۵ ، حدیث ۳۳۳۱ ؛ مشکوٰۃ ، ۳ : ۱۳۴ تا ۱۳۵ ، حدیث ۵۷۸۸) - آپؐ کے کپڑے اگرچہ زیادہ قیمتی نہ ہوتے ، مگر ہمیشہ صاف ستھرے ہوتے تھے - آپؐ کا تمام زندگی ، قرآن کریم کے اس حکم : وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۷۴ [المدثر] : ۴) ، یعنی اور اپنے کپڑوں کو صاف ستھرا رکھیے ، پر عمل رہا -

سر مبارک پر تیل لگا کر کنگھی کرنے کا معمول تھا ۔ جسم کے زائد بال صاف کرنے کا آپؐ ہمیشہ اہتمام فرماتے رہے اور ان کی صفائی کو آپؐ فطرت سے تعبیر کرتے تھے (مسلم ، ۴ : ۱۸۱۹ ، حدیث ۲۳۳ ؛ ابن الجوزی : الوفا، ۲ : ۵۸۵ تا ۵۹۱؛ الترمذی : شمائل ، ۴۱ تا ۵۱) ۔ اسی نظافت پسندی کا یہ نتیجہ تھا کہ دوسرے افراد کو بھی آپؐ صاف ستھرا دیکھنا چاہتے تھے ۔ اگر کسی کو میلے کپڑے پہنے ہوے دیکھتے تو فرماتے : اس سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے (ابو داؤد ، ۴ : ۳۳۳ ، حدیث ۴۰۶۲) ۔ اگر کسی کے بالوں کو پراگندہ دیکھتے تو فرماتے : کیا یہ اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کر سکتا (حوالۂ مذکور) ۔ اگر کوئی اپنی وسعت کے مطابق مناسب کپڑے نہ پہنتا تو فرماتے : خدا نے جو نعمت دی ہے اس کا اثر بھی شکل و صورت میں واضح ہونا چاہیے (کتاب مذکور ، حدیث ۴۰۶۳) .

اسی نظافت طبع کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کو بدبو دار اشیا ، مثلاً کچے پیاز اور لہسن سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے : جو کوئی ان اشیا کو کھائے وہ مسجد میں نہ آئے (الترمذی ، ۴ : ۶۲۱ ، حدیث ۱۸۰۶، ۱۸۰۷) ۔ راستوں اور سایہ دار درختوں کے نیچے بول و براز کا عام رواج تھا ؛ آپؐ نے اسے سخت ناپسند کیا اور ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی ۔ آپؐ مسجد کی صفائی کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے ، وہاں ایک خاتون ام مہجن جھاڑو دیا کرتی تھیں مسجد میں بچوں اور ہوش وحواس سے عاری لوگوں کے جانے کی ممانعت فرما دی؛ خرید و فروخت کرنا بھی سخت منع تھا ۔ گاہے بگاہے مسجد میں بدبو کی انگیٹھیاں بھی جلائی جاتی تھیں ورک بہ مسجد

(۳) شرافت حسب و نسب : آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے حسب و نسب کے اعتبار سے نجیب الطرفین شریف النسب پیدا کیا تھا ؛ آپؐ کے ددھیالی اور ننھیالی خاندان کا ہر فرد عزت و حشمت اور عفت و عصمت کا بہترین نمونہ تھا ۔ آپؐ کے دونوں طرف کے آبا و اجداد فیاضی ، نیک نامی اور سرداری میں مرجع انام رہے ۔ آپؐ انبیا میں سے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد ، اہل عرب میں سے قریش اور قریش میں سے بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں [نیز دیکھیے اس سلسلے کا ابتدائی مقالہ]۔ حضرت ابو ہریرہؓ آپؐ سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ، سب سے بہتر زمانے میں مبعوث کیا ہے (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۳۷) ۔ حضرت عباسؓ سے ایک دوسری روایت یوں ہے کہ آپؐ نے فرمایا : اللہ تعالی نے مجھے تمام مخلوق میں سب سے افضل مخلوق (انسانوں) میں پیدا کیا ؛ بہترین زمانے میں مبعوث کیا ؛ قبیلوں میں سے سب سے بہتر قبیلہ اور گھروں میں سب سے بہتر گھر میرے لیے انتخاب کیا ؛ پس میں حسب و نسب کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوں (البیہقی).

(۴) فہم و فراست : اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فطری طور پر ذکاوت طبع ، نظافت نفس اور جودت عقل و فکر میں بے مثال پیدا کیا تھا؛ گو آپؐ نے کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا ، پھر بھی آپؐ تمام علوم و فنون کا سرچشمہ اور حقائق و معارف کا منبع تھے ۔ جتنے علوم [رک بہ علم] آپؐ کی ذات بابرکات سے نکلے ہیں ، دنیا میں آج تک کسی انسان کو اتنے علوم کی ترویج کا شرف حاصل نہیں ہوا ۔ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر جملہ علمی دنیا میں نئی سے نئی راہ پیدا کرنے کا موجب بنا ۔ آپؐ نے اپنی زندگی مبارک میں جو عظیم الشان ورثہ چھوڑا ہے چودہ صدیاں بیت جانے کے باوجود بھی کائنات کے لیے سرچشمہ ہدایت اور بنی نوع انسان کے لیے چراغ راہ ہے .

سیرت طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ ہر

معاملے کا بڑی گہرائی اور تفصیل سے جائزہ لیتے تھے اور پھر اس کے متعلق جو فیصلہ صادر فرماتے وہ اتنا درست اور صحیح ہوتا تھا کہ تمام دنیا کے انسان باہم مل کر بھی اس سے بہتر فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مختلف معاملات میں آپؐ کی اختیار کردہ حکمت عملی دور جدید میں کیے جانے والے سائنسی اکتشافات سے بہت قریب تھی۔

(۵) جودت طبع: خالق کائنات کی طرف سے آپؐ کو جو لازوال اوصاف عطا ہوے تھے، ان میں آپؐ کی طبیعت کی ذکاوت و فطانت بطور خاص قابل ذکر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپؐ کے تیز اور رسا ذہن کا ٹھیک ٹھیک بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

آپؐ نے تقریباً دس سال کے مختصر عرصے میں، جتنا عظیم الشان کام کر دکھایا وہ صدیوں میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس عرصے (از ۱۲ ربیع الاول ۱ تا ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ) میں آپؐ کو دشمنوں کے خلاف تقریباً چھوٹی بڑی ۷۴ مہمات سر کرنا پڑیں، ان میں سے ۲۷ (غزوات) میں آپؐ نے خود بہ نفس نفیس شرکت فرمائی اور بقیہ ۴۷ (سرایا) میں دیگر صحابہؓ کرام کو قیادت سونپی گئی (الواقدی، ۱: ۷ ببعد طبع Marsden James، آکسفرڈ ۱۹۶۶ء)۔ ان تمام کی نقشہ سازی اور منصوبہ بندی کا کٹھن کام آپؐ نے خود ہی انجام دیا۔ سرایا میں گو عملاً آپؐ شریک نہ ہوتے تھے، مگر ان تمام کی ضروری منصوبہ بندی آپؐ ہی فرماتے تھے۔ ان میں سے ایک مہم بھی انجام اور مآل کے اعتبار سے ناکام نہیں ہوئی۔ ان جنگی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ جن کی اوسط سالانہ ۷۴ نکلتی ہے، صحابہؓ کرام کی تعلیم و تربیت اور اسلامی حکومت کی تاسیس کا کام بھی جاری رہا۔ ان امور میں سے ہر امر اپنی جگہ اتنا اہم ہے کہ اگر اسے مدت مدید میں بھی حاصل کیا جاتا تو قابل قدر تھا۔

غزوات و سرایا میں اکثر و بیشتر آپؐ کی ذکاوت طبع کا اظہار ہوتا رہتا تھا [رک بہ غزوات]۔ آپؐ حیرت انگیز طریقے سے دشمن کی تعداد کا پتا چلا لیتے تھے، مثلاً غزوہ بدر میں دشمن کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اتفاقاً دشمن کے پانی پلانے والے (سقاء) پکڑے گئے۔ انہیں آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپؐ نے ان سے پوچھا: دشمن کے لشکر کی تعداد کیا ہے؟ انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ آپؐ نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ کہ وہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا ایک دن دس اور دوسرے دن ۹۔ آپؐ نے فرمایا کہ دشمن نو سو اور ہزار کے درمیان ہے (الواقدی، ص ۵۳)۔ غزوات و سرایا میں آپ نئی سے نئی حکمت عملی اختیار فرماتے، جس سے دشمن اپنی کثرت تعداد کے باوجود مغلوب ہو جاتا: غزوۂ بدر کے موقع پر صف بندی؛ غزوہ احد میں پہاڑ کا پشت پر رکھنا؛ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنا؛ غزوہ خیبر میں صبح سویرے اچانک دشمن کے سر پر پہنچ کر اسے حواس باختہ کر دینا؛ فتح مکہ کے موقع پر ہر قسم کی تدابیر اختیار کرکے آخر دم تک دشمن کو حملے کی خبر تک نہ ہونے دینا اور غزوہ طائف میں دبابہ اور منجنیق کا استعمال اس کی روشن مثالیں ہیں [رک بہ غزوات؛ نیز خطاب: الرسول القائد، مطبوعہ قاہرہ)۔

صحابہؓ کرام کی عملی تربیت اور ذخیرۂ احادیث کی صورت میں آپؐ نے دنیا کے لیے جو لافانی ذخیرہ چھوڑا وہ بھی آپؐ کی فطانت و ذہانت کے عملی ثبوت کے لیے کافی ہے۔ احادیث مبارکہ کا ہر جملہ اور ہر لفظ علم و حکمت، مصالح دینی و دنیوی کا منبع اور مخزن ہے۔ احادیث کی ہر ترکیب بجاے خود اتنی جامع ہے کہ اس سے فصحاے عرب پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ اسلام لانے میں تأمل نہیں کرتے تھے۔

(۶) وحی ربانی سے ہمہ وقتی تعلق: ان سب سے

مستزاد اور آپؐ کی سب سے بڑی خصوصیت، آپؐ پر وحی ربانی بالخصوص قرآن کریم کا نزول مبارک ہے۔ آپؐ کی یہ خصوصیت آپؐ کو جملہ انسانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ خصوصیت اکتساب و اجتہاد کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ محض انعام و اکرام خداوندی کے ظہور کا ثمرہ تھی (دیکھیے ۳ [آل عمرٰن]: ۱۷۹؛ ۷۲ [الجن]: ۲۶ تا ۲۸)۔ اسی وحی و الہام کے ذریعے آپؐ اللہ تعالٰی کے ہاں سے اگلی پچھلی اور دور دراز کی خبروں سے آگاہی پاتے تھے (دیکھیے ۳ [آل عمرٰن ۴۴؛ ۳۸ [ص]: ۶۹)۔

(ے) عصمت نبوی: اس کے علاوہ آپؐ کی عظمتوں اور رفعتوں کا یہ بھی ایک نہایت شاندار پہلو ہے کہ آپؐ ہر چھوٹی بڑی انسانی و بشری خطا و نسیان اور ہر کبیرہ و صغیرہ لغزش سے مبرا اور منزہ تھے؛ یوں تو قرآن کریم میں متعدد جگہ آپؐ کی سب اگلی پچھلی خطاؤں کی معافی کا ذکر ہے (مثلاً ۴۸ [الفتح]: ۲)، مگر واقعۃً آپؐ کی سیرت میں ذنب اور گناہ نام کی کوئی بھی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو دوسرے انسانوں میں موجود ملتی ہے۔

(ب) خصائل مکتسبہ: یعنی وہ عادات شریفہ جو ہر صاحب عقل و فکر یا، بقول قاضی عیاض، جمہور عقلا کے نزدیک مدح و ستائش کی مستحق ہیں اور جن کی بنا پر ان عادات کے حامل کو عزت و عظمت کا مستحق خیال کیا جاتا ہے۔ یہ عادات عموماً طویل محنت و ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔ ان عادات شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ قوای نفس افراط و تفریط کے بجائے اعتدال و اقتصاد کی راہ پر گامزن ہو جائیں اور ان میں میل اور کجی کا شائبہ بھی باقی نہ رہے (قاضی عیاض: الشفا، ص ۴۳)۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس لحاظ سے یہ امتیاز رکھتے ہیں کہ آپؐ کی ذات بابرکات میں وہ تمام اوصاف اور محاسن خلقی اور فطری طور پر جمع تھے، جن کو سلیم الطبع اور راست فکر لوگ عظمت و رفعت کا معیار سمجھتے ہیں۔ آپؐ کو ان عادات کے لیے نہ تو تربیت کی ضرورت پیش آئی اور نہ محنت و ریاضت کی، بلکہ خالق فطرت نے آپؐ کو انہیں اوصاف پر تخلیق کیا اور ان محاسن کو آپؐ کی طبیعت میں راسخ کر دیا (الزرقانی: شرح المواھب، ۴: ۲۴۳ تا ۲۵۳ بعد)۔ آپؐ خود فرمایا کرتے تھے: اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَأْدِیْبِیْ (الشفا، ص ۴۶، حاشیہ ۲۹)، یعنی اللہ تعالٰی نے میری تربیت خود فرمائی اور خوب فرمائی ہے۔ یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ زمانۂ قبل از بعثت میں بھی آپؐ محاسن و کمالات انسانیہ کا پیکر تھے؛ آپؐ نے اس وقت بھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے غلط کہا جا سکتا ہو، آپؐ کا ارشاد تھا: لمانشأتُ بُغِضتْ الیّ الاوثانُ و بغض الیّ الشعراء و لم اُھم بشیء مما کانت الجاھلیۃ تفعلہٗ (کتاب مذکور، ص ۴۴)، یعنی مجھے پیدایشی طور پر بتوں اور ان کی پوجا نیز شعرا سے نفرت تھی اور میں نے اس وقت بھی کسی ایسے کام کا ارادہ نہیں کیا جو زمانۂ جاھلیت میں لوگ کیا کرتے تھے۔

شمائل و عادات کے سلسلے میں ایک لفظ سنت [رک بآں] کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا، جس کا لفظی مفہوم تو راستہ اور طریقہ ہے، مگر اصطلاحی طور پر اس سے سیرت طیّبہ کے وہ افعال حسنہ مراد ہوتے ہیں، جو آپؐ کی تمام زندگی میں التزاماً پائے جانے کی وجہ سے گویا آپؐ کی فطرت ثانیہ بن چکے تھے اور یہ عادات و خصوصیات بغیر تکلف اور تصنّع کے آپؐ کی طبیعت مبارکہ سے صادر ہونے کی بنا پر منہاج نبوی کا مرتبہ حاصل کر چکی تھیں۔ یہ نہیں کہ کبھی تو ان کا صدور ہوا اور کبھی نہیں ہوا۔ آپؐ کو ہمیشہ ایسی عادات ناپسند رہیں جو کبھی تو ہوں اور کبھی نہ ہوں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں آپؐ کے نزدیک سب سے اچھا عمل وہ تھا جس پر مداومت ہو (البخاری،

۴ : ۲۲۲)؛ آپؐ فرمایا کرتے تھے: خدا کو تمہارا وہ عمل زیادہ پسند ہے جس پر ہمیشگی اختیار کی جائے خواہ وہ عمل تھوڑا ہی کیوں نہ ہو (کتاب مذکور، ص۲۲۳)۔ اسی بنا پر آپؐ نے جو کام بھی کیا، ہمیشہ کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی سیرت طیبہ میں ایک جیسے واقعات کی کثرت ملتی ہے ، حتّٰی کہ ایک ایک وصف پر مستقل کتب لکھی گئی ہیں اور محدّثین نے اپنی کتب کے کئی کئی ابواب قائم کیے ہیں ۔ اس لحاظ سے شمائل نبوی کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

آپؐ کی ایسی عادات مبارکہ کو ابتداءً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (الف) شخصی اوصاف؛ (ب) معاملاتی اوصاف۔

(۱) شخصی اوصاف : اوصاف ذاتیہ کی یوں تو فہرست بہت طویل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص ان کی تعریف و تکریم کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا ؛ تاہم مختصراً چند ایک خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ آپؐ کے کردار کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

(۱) عزم و استقلال : آپؐ پیکر عزم و استقلال تھے ؛ اسی بنا پر آپؐ کو اولوالعزم پیغمبروں میں شمار کیا گیا (۴۶۰ [الاحقاف] : ۳۵) ۔ اس امر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ نبوت کے بار عظیم کو جب آپؐ لے کر اٹھے تو ایک متنفس بھی آپؐ کے ہمراہ نہ تھا، مگر آپؐ کو اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں قطعاً کوئی تذبذب نہ ہوا ۔ زندگی مبارک میں کئی مواقع ایسے آئے جب آپؐ کے آہنی اور غیر متزلزل عزم و استقلال کا مظاہرہ ہوا۔ ایک موقع پر ابو طالب نے مشرکین کی مخالفت بڑھ جانے کی وجہ سے آپؐ کو مشورہ دیا کہ بت پرستی کی مذمت چھوڑ دیں ۔ آپؐ نے اشکبار آنکھوں سے فرمایا : بخدا ! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی لا کر رکھ دیں تو بھی میں دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے نہیں رکوں گا تا آنکہ یہ فریضۂ تبلیغ و رسالت پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے یا میرا دم نکل جائے (ابن ہشام، سیرۃ، ۱: ۲۸۴ تا ۲۸۵) ۔ ایک موقع پر بعض صحابہؓ نے دشمنوں کی عداوت اور ایذا رسانی سے تنگ آ کر آپؐ سے دعا کی درخواست کی تو آپؐ نے سختی سے جواب دیا : تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں ان کے جسموں پر آہنی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں اور کھال کو جسم سے الگ کر دیا جاتا تھا، مگر وہ مذہب سے برگشتہ نہ ہوے۔ بخدا ! دین اسلام اپنے منتہاے کمال کو پہنچ کر رہے گا تا آنکہ صنعاء سے حضرموت تک جانے والا مسافر خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا (البخاری، ۱/۸۹ ۳ : ۳۳۶ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۱۰۸ ، حدیث ۲۶۴۹) ۔ آپؐ کے عزم و استقلال کا اظہار اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ آپؐ نے دشمنوں کے خلاف جتنے بھی معرکے لڑے ان تمام میں (بجز غزوۂ حنین کے) آپؐ کے مقابلے میں دشمن کی طاقت کئی گنا ہوتی تھی ، مگر آپؐ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ارادے میں تردد محسوس نہیں ہوا ؛ غزوۂ احد میں بعض نوجوانوں کے مشورے پر آپؐ کی مرضی کے خلاف ، مدینہ منورہ سے باہر نکل کر دفاع کرنے کا پروگرام بنا ۔ آپؐ یہ سن کر گھر میں تشریف لے گئے اور جنگی ہتھیار پہن کر باہر تشریف لائے ؛ اب نوجوان صحابہؓ کو اپنے اصرار پر ندامت ہوئی اور آپؐ سے عرض کیا کہ کیوں نہ آپؐ کی مرضی کے مطابق مدینہ میں رہ کر دفاع کیا جائے ؟ آپؐ نے فرمایا : کہ نبی جب زرہ پہن لیتا ہے تو پھر اس وقت تک زرہ نہیں اتارتا، جب تک اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ نہیں ہو جاتا (ابن سعد، ۲ : ۳۸ ببعد) ۔ غزوۂ حنین میں بھی آپؐ کے عزم و استقلال نے جنگ کا پانسہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ایک موقع پر ایک دشمن نے آپؐ کو تنہا ایک درخت تلے استراحت فرماتے دیکھا تو تلوار سونت

لی اور کہا : اے محمدؐ ! اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا : اللہ - یہ جواب سن کر بدوی لرز گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی - آپؐ نے اسے معاف کر دیا (البخاری ، ۲: ۲۲۶).

(۲) شجاعت : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پیکر شجاعت و بسالت تھے - زندگی مبارک کے ایک ایک واقعے سے آپؐ کی شجاعت اور جوانمردی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے - آپؐ نے مادی اور ظاہری اسباب کی کمی ، بلکہ بعض اوقات فقدان کے باوجود ، اپنے مخالفین کی نہ صرف تدبیروں کو ناکام بنایا ، بلکہ ہر معرکے میں ان پر غلبہ بھی حاصل کیا - زندگی مبارک میں جتنے بھی بڑے معرکے ہوئے [بجز مؤتہ کے] آپؐ نے ان میں خود بہ نفس نفیس شرکت فرمائی - ان جنگوں میں سے ایک جنگ میں بھی آپؐ نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا - ان معرکوں میں حضرت علیؓ کے بقول آپ ہمیشہ آگے آگے ہوتے اور جب گھمسان کا رن پڑتا تو حضرت علیؓ جیسے بہادروں کو بھی آپؐ کے پہلو میں پناہ لینا پڑتی تھی (ابن الجوزی ، ۲ : ۴۴۳ ؛ احمد بن حنبل : مسند ، ۱ : ۱۲۶) - غزوۂ بدر میں ، جو حضرت علیؓ کے بقول بہت ہی سخت معرکہ تھا صحابہؓ بار بار آپؐ کی آڑ میں پناہ لیتے ، مگر آپؐ دشمن کے سب سے زیادہ قریب رہے (ابن الجوزی) - غزوہ حنین میں جب اچانک بنو ہوازن کے تیر اندازوں کی تیروں سے ہراول کے اور پھر پیچھے آنے والے لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور پلک جھپکنے میں میدان صاف ہوگیا تو میدان میں بجز آپؐ کے اور چند صحابہؓ کے کوئی موجود نہ رہا - آپؐ اپنے خچر کو آگے بڑھانا چاہتے تھے ، مگر جاں نثار مانع ہوتے تھے ؛ ادھر دشمن نے اپنے تیروں کا رخ آپؐ کی طرف پھیر لیا تھا ، مگر آپؐ کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئی - آپؐ اپنے خچر سے کود کر نیچے اتر آئے اور فرمایا : انا النبی لا کذب، انا ابن عبدالمطلب (مسلم، ۳: ۱۳۹۸، حدیث ۱۷۷۵ ؛ قاضی عیاض : الشفا ، ص ۵۰ ببعد)، یعنی میں خدا کا سچا رسول اور عبدالمطلب (جیسے شجاع) کا پوتا ہوں - آپؐ کے ثابت قدم رہنے کی وجہ سے اہل اسلام نے یہ ہارا ہوا معرکہ دوبارہ جیت لیا - حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سب سے زیادہ خوبصورت (خوب سیرت) اور سب سے زیادہ شجاع اور سخی تھے - ایک دفعہ مدینہ منورہ میں یہ افواہ پھیلی کہ کسی (ناگہانی) دشمن نے حملہ کر دیا ہے ، جس سے لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی - بعض لوگ تحقیق احوال کے لیے اس طرف گئے ، دیکھا تو رسالت مآبؐ گلے میں تلوار ڈالے حضرت طلحہؓ کے گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہیں اور واپس آ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: نہ ڈرو کوئی خطرہ نہیں (ابو داؤد ، ۵ : ۲۶۳ حدیث ۴۹۸۸ ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۰۲، حدیث ۲۳۰۷) - جنگوں میں وہی بہادر سمجھا جاتا تھا جو آپؐ کے قریب تر رہتا؛ کیونکہ آپؐ دشمن کے نزدیک ہوتے تھے (الشفا ؛ ص ۵۱)- آپؐ صرف شجاع ہی نہیں بلکہ شجاع ساز بھی تھے! آپؐ نے ہزاروں صحابہؓ میں اپنے ارشادات کے ذریعے شجاعت اور بہادری کے ایسے اوصاف پیدا کر دیے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے تھے - آپؐ کا ارشاد تھا : الجنۃُ تحتَ ظِلال السیوف ، یعنی جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے؛ نیز فرماتے تھے: ولوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیٰی فاقتل ثم احیٰی فاقتل ثم احیٰی فاقتل (البخاری ، ۳ : ۲۰۱ ، الجہاد) ، یعنی میں چاہتا ہوں کہ میں راہ خدا میں شہید ہو جاؤں؛ پھر زندگی ملے ، پھر شہید کر دیا جاؤں ، پھر زندگی عطا ہو ؛ پھر شہادت سے ہم کنار ہوں.

آپؐ کے یہ ارشادات عسکر اسلام کے حوصلے بلند کرنے اور ان کی ہمت بڑھانے کا موجب بنتے تھے - یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے ساتھیوں نے کسی

معرکے میں بھی میدان جنگ سے منہ نہیں پھیرا - غلط فہمی یا دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے اگر کبھی بھگدڑ مچی بھی تو جاں نثاران اسلام دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ جوش اور ولولے سے آپؐ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے اور اس طرح جنگ کا پانسہ پلٹ گیا [نیز رک بہ غزوات].

(۳) حزم و احتیاط : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انتہائی شجاع اور جملہ اوصاف سے متصف ہونے کے باوجود ، حزم و احتیاط کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ آپؐ جو فیصلہ کرتے ، یا جو قدم بھی اٹھاتے ، اسے ہر اعتبار سے سوچ سمجھ کر اٹھاتے اور اس میں حزم و احتیاط کو ہر صورت میں پیش نظر رکھتے - غزوۂ بدر میں مدینہ منورہ کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کرنا ، غزوۂ احد میں دوران جنگ پہاڑ کو اپنی پشت کی طرف رکھنا ، درمیانی درے پر پچاس افراد کو بطور تیر انداز مقرر فرمانا، غزوۂ احزاب میں خندق کھودنا ، اس پر جگہ جگہ حفاظت کی غرض سے عسکری دستوں کا تعینات کرنا وغیرہ آپؐ کے حزم و احتیاط کی روشن مثالیں ہیں - اگر یہ اوصاف (حزم واحتیاط) آپؐ کو کسی شخص میں دکھائی دیتے تو آپؐ اس کی تعریف فرماتے - ایک مرتبہ اشج عبدالقیس کو فرمایا: تم میں دو ایسی خصوصیات ہیں جنہیں خدا پسند کرتا ہے اور وہ ہیں بردباری اور عاقبت اندیشی (مسلم، ۱:۴۹، حدیث ۱۷)- آپؐ مزید فرمایا کرتے تھے: عجلت شیطانی امر ہے اور عاقبت اندیشی خدا کی طرف سے ہے (مشکوٰۃ ، ۲ : ۶۲۵ ، حدیث ۵۰۵۵)- ایک شخص نے کسی نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا ہر معاملے کو سوچ سمجھ کر (تدبیر سے) اختیار کر ؛ اگر اس کے انجام میں بھلائی نظر آئے تو پھر کر گزرو (کتاب مذکور ، حدیث ۵۰۵۶) - مزید فرمایا : تاخیر کرنا تمام کاموں میں بہتر ہوتا ہے، بجز آخرت کے امور کے (حدیث ۵۰۵۸) - ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے میانہ روی اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے ، نیز خاموشی اختیار کرنے کو نبوت کا چوبیسواں حصہ قرار دیا (الترمذی ، مشکوٰۃ) - حضرت ابو ذرؓ سے تدبیر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا : لیس العقل کالتدبیر، یعنی تدبیر جیسی کوئی عقل نہیں (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۲۷ ، حدیث ۵۰۶۶) - ایک اور روایت میں ہے : مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا (مسلم ، ۴ : ۲۲۹۵ ، حدیث ۲۹۹۸) .

آپؐ خود ہر کام سوچ سمجھ کر اور کامل حزم و احتیاط سے انجام دیتے تھے ، جو مسئلہ آپؐ کے سامنے ہوتا آپؐ اس کے ہر پہلو پر غور و خوض فرماتے ، پھر اس کے مطابق عمل کرتے - یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے فیصلوں کی صداقت مسلمہ رہی ہے .

(۴) عدل و انصاف : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حکم خداوندی : اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (۱۶ [النحل] : ۹۰) ، یعنی خدا تعالیٰ تم کو عدل و احسان کا حکم دیتا ہے ، کے مطابق پیکر عدل و انصاف تھے - آپؐ نے تمام زندگی ظلم و جہالت کے مٹانے اور عدل و انصاف کے عام کرنے کے لیے جد و جہد جاری رکھی (دیکھیے البخاری، کتاب المظالم) - ظلم و جہالت سے آپؐ کو کس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس دعا سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ صبح و شام مانگا کرتے تھے : اللّٰھم انی اعوذبک ان اضل اواضل او ازلّ او ازلّ او اظلم او اظلم اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ (ابو داؤد ۵ : ۳۲۷ ، حدیث ۵۰۹۴ ؛ ابن ماجہ، (الدعوات) حدیث ۳۸۸۴) ، یعنی اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ صحیح راہ سے بھٹکوں یا بھٹکا دیا جاؤں یا پھسلوں یا پھسلا دیا جاؤں ، یا کسی پر ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں - آپؐ کے عدل و انصاف کا بتقاضائے ارشاد باری : وَلَایَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ھُوَ

اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۵ [المآئدۃ] : ۸) ، یعنی کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم ان سے نا انصافی کرو ، ہر صورت میں انصاف کرو ، یہی تقوٰی کے زیادہ قریب ہے ۔ یہ عالم تھا کہ اس میں اپنے اور بیگانے ، دوست اور دشمن کی کوئی تمیز نہ تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ظلم سے بہرحال روک دیا ؛ فرمایا : اُنْصُرْ اخاک ظالماً اَو مظلوماً (البخاری ، ۲ : ۸۹) ، یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ۔ اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا ہی اس کی مدد کرنا ہے (البخاری، ۲ : ۹۸)۔ آپؐ جن لوگوں کو حکمران بنا کر بھیجتے، انھیں فرماتے : اِتَّقِ دعوۃَ المظلومِ فانّہٗ لیس بینھا و بین اللہ حجاب (کتاب مذکور ، ص ۸۹) یعنی مظلوم کی بد دعا سے بچنا ، کیونکہ اس کے اور خدا کے مابین کوئی حجاب نہیں ہوتا ۔ ارشاد باری تعالٰی ہے : وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (۵ [المائدۃ] : ۲) ، یعنی ایک دوسرے کی نیکی اور تقوٰی کے معاملے میں تو مدد کرو، مگر گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو .

آپؐ عدل و انصاف میں کسی چھوٹے بڑے کی تمیز نہ کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایک عورت فاطمہ مخزومیہ نے چوری کی ۔ خاندان کے لوگوں نے بے عزتی کے پیش نظر حضرت اُسامہؓ سے، جو آپؐ کے لاڈلے (حِبّ) تھے ، سفارش چاہی ۔ حضرت اسامہؓ نے سفارش کے لیے جونہی بات شروع کی تو آپؐ کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور فرمایا : اے اسامہ ! کیا اللہ کے حق میں تو سفارش کرتا ہے ؟ انھوں نے معافی مانگی ۔ پھر آپؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا : تم سے پہلے لوگ اسی بنا پر ہلاک ہوگئے کہ جب قوم کا کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور شخص اس کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد جاری کرتے ۔ بخدا ! اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس پر بھی حد جاری کر دیتا ۔ پھر آپؐ نے اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا (مسلم ، ۳: ۱۳۱۵، حدیث ۱۶۸۸؛ الترمذی، ۴: ۳۷۰ تا ۳۷۱ حدیث ۱۴۳۰)۔ اسی بنا پر آپؐ نے قبیلہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے خونبہا میں معادلت (= برابری) قائم فرمائی، اس سے پہلے اگر کوئی نضیری (بڑی قوم کا) کسی قریظی (چھوٹی قوم کے کسی شخص) کو ہلاک کر دیتا تو نصف دیت ادا کی جاتی اور برعکس صورت میں پوری دیت لازم سمجھی جاتی ۔ آپؐ نے اس نا انصافی کو ختم کیا ۔ (ابو داؤد ، ۳ : ۱۷ ، حدیث ۳۵۹۱ ؛ النسائی ، حدیث ۴۷۳)۔ یہود میں بھی اسی طرح اگر کوئی معزز آدمی زنا کرتا تو اسے معمولی سزا دے کر چھوڑ دیا جاتا اور غریب آدمی پر حد جاری کی جاتی ۔ آپؐ نے اس عدم مساوات کو بھی ختم کیا (مسلم ۳: ۱۳۲۶ ، حدیث ۱۶۹۹ تا ۱۷۰۴)۔

انصاف کرنے میں آپؐ کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم اپنے اور بیگانے میں کوئی فرق نہ تھا ۔ متعدد مرتبہ آپؐ نے مسلمان کے خلاف غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دیا ۔ ایک یہودی کا ایک مسلمان پر قرض تھا۔ غزوۂ خیبر کے دوران میں اس نے تقاضا شروع کر دیا۔ مسلمان نے مہلت مانگی، مگر یہودی نے مہلت دینے سے انکار کیا ۔ اس پر آپؐ نے مقروض کو فوری ادائی کا حکم دیا اور تعمیل نہ ہونے کی صورت میں قرض خواہ کو اس کے بعض کپڑے لے جانے کی بھی اجازت دی (احمد بن حنبل : مسند ، ۳ : ۴۲۳)۔ فتح خیبر کے بعد آپؐ نے کھیتی باڑی کا سارا کام یہود کے سپرد کر دیا ۔ یہودیوں نے آپؐ سے شکایت کی کہ مسلمان مساقات کے بعد بھی ان کی فصلوں اور سبزیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں ۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ معاہد قوم کا مال مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلمان سبزی وغیرہ قیمتاً خریدنے لگے (الواقدی ، ۲ : ۶۹۱).

عدل و انصاف کی حکمرانی کے لیے آپؐ خود بھی ہمیشہ جواب دہی کے لیے آمادہ رہتے ۔ اگر آپؐ کے کسی سلوک سے (نادانستہ طور پر) کسی شخص کو ایذا پہنچتی تو آپؐ اسے اپنا بدلہ لینے کی فراخ دلانہ پیش کش فرماتے۔ ایک مرتبہ مال غنیمت کی تقسیم کے دوران میں ایک شخص کے چہرے پر، جو اپنا حصہ لینے کے لیے آپؐ پر جھک آیا تھا ، آپؐ کے نیزے کا زخم لگ گیا ۔ آپؐ نے فوراً اسے بدلہ لینے کی پیش کش کی، مگر اس نے معاف کر دیا (ابو داؤد ، ۳ : ۷۶۳، حدیث ۴۵۳۶؛ النسائی، ۴۷۷۴)۔ ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے ایک شخص کی کمر پر ، (جو ادھر اُدھر کی باتیں کرکے لوگوں کو ہنسا رہا تھا) ٹھوکا دیا، جس پر اس نے بدلہ لینے کی خواہش ظاہر کی ۔ آپؐ نے اپنی کمر آگے کر دی ، اس نے کہا : میں برہنہ تن تھا جب کہ آپؐ قمیص پہنے ہوے ہیں ۔ آپؐ نے قمیص اٹھا دی ۔ اس نے آگے بڑھ کر مہر نبوت کو چوما اور کہا : میں تو صرف یہ چاہتا تھا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۹۴ ، حدیث ۵۲۲۴) ۔ اسی طرح یہودی زید بن سعیہ نے نہ صرف قبل از وقت اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا بلکہ نہایت سختی اور درشتی سے آپؐ کے خاندان کی بھی ہتک کی ۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سزا دینا چاہی، مگر آپؐ نے فرمایا : اے عمرؓ ! تمھیں چاہیے تھا کہ اسے حسن تقاضا کی تلقین کرتے اور مجھے حسن ادا کی ۔ پھر اس کو نہ صرف معاف کیا، بلکہ اس کے حصے سے زیادہ اسے معاوضہ عنایت فرمایا (ابن الجوزی، ۲ : ۴۲۵)۔ وصال مبارک سے چند روز قبل آپؐ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ جس کسی کا مجھ پر کوئی حق ہو یا تو وہ وصول کرے اور یا پھر معاف کر دے ۔ ایک شخص نے چند درہموں کا مطالبہ کیا ، جو فوراً ادا کر دیے گئے (احمد بن حنبل : مسند، ۱: ۲۰۹، حدیث ۱۷۸۴؛ آپؐ کے عدل و انصاف پر مبنی فیصلوں کے لیے دیکھیے ابن القیم : زاد المعاد ، جلد ۵ ، مطبوعہ کویت ، ۱۳۹۹ ، ص ۵ تا ۸۳۴).

(۵) فیاضی و سخاوت : حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپؐ کی سخاوت کا حال بیان کرتے ہوے آپؐ کو چلنے والی ہوا (الرّیح المرسلة) سے بھی زیادہ سخی قرار دیتے ہیں ، بالخصوص رمضان المبارک میں (البخاری ، ۱ : ۶ تا ۷ ، باب کیف کان بدؤ الوحی ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۰۳ ، حدیث ۲۳۰۸) ۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ سے جب بھی کچھ مانگا گیا آپؐ نے کبھی انکار نہیں کیا (مسلم ، ۴ : ۱۸۰۵ ، حدیث ۲۳۱۱؛ البخاری، کتاب المناقب)۔ غزوۂ حنین میں تقریباً چھے ہزار مرد و زن گرفتار ہوے ، جو عرب کے قدیم دستور کے مطابق ہمیشہ کے لیے لونڈی غلام بنائے جا سکتے تھے ، مگر آپؐ نے ان تمام کو، ان کی قوم کے بقیہ لوگوں کے مطالبے پر، باعزت طور پر رہا فرما دیا (ابن سعد، الطبقات ، ۱۵۳ تا ۱۵۵) ۔ اس کے علاوہ اس موقع پر جو مال غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی شامل تھی۔ آپؐ نے یہ تمام مال لوگوں میں تقسیم فرما دیا (الواقدی : المغازی، ۳:۹۴۹ ببعد)۔ اس موقع پر آپؐ نے بہت سے لوگوں کو، جن میں بعض نو مسلم اور بعض غیر مسلم بھی شامل تھے، سو سو اونٹ عنایت فرمائے ۔ صفوان بن امیہ کو تین سو اونٹ مرحمت فرمائے (مسلم، ۴: ۱۸۰۶، حدیث ۲۳۱۳؛ قاضی عیاض: الشفا، ص ۴۹) ۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو آپؐ نے دو پہاڑوں کے درمیان پھیلا ہوا ریوڑ عنایت فرمایا ۔ وہ اپنی قوم میں جا کر کہنے لگا کہ اسلام لے آؤ، کیونکہ حضرت محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ فقر کی پروا نہیں کرتے (مسلم ، ۴ : ۱۸۰۶ ، حدیث ۲۳۱۲) ۔ حضرت عباسؓ کو ایک مرتبہ اتنا سونا مرحمت فرمایا کہ ان سے اٹھایا نہیں جاتا تھا (قاضی عیاض : الشفا، ص ۵۰)۔ ایک مرتبہ، جب آپؐ کو ستر ہزار درہم کی رقم پیش کی گئی تو آپؐ نے اس کو مسجد میں چٹائی پر بکھیر

دیا اور پھر جو سامنے آیا اسے دیتے گئے، یہاں تک کہ وہ رقم خرچ فرما دی (ابن الجوزی ، ۲ : ۴۴۲).

آپؐ کی فیاضی و دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ اگر پاس موجود نہ ہوتا تو قرض لے کر سائل کو مرحمت فرما دیتے (قاضی عیاض : الشفا ، ۵۰) ۔ فرط سخاوت سے ، بقول حضرت انسؓ ، آپؐ کے پاس کوئی چیز ذخیرہ نہیں رہتی تھی (ابن الجوزی، ص ۴۴۲) ۔ ایک مرتبہ آپؐ نے اپنے ذاتی معتمد اور خازن حضرت بلالؓ کے پاس کچھ کھجوریں جمع دیکھیں تو پوچھا کہ اے بلالؓ ! یہ کیا ہے ؟ حضرت بلالؓ نے عرض کیا : یا رسول اللہ! کچھ ذخیرہ کر رہا ہوں تاکہ کسی برے وقت کام آ سکے۔ فرمایا : تجھے اس بات کا خوف نہیں کہ یہ جہنم کا دہکایا ہوا ٹکڑا بھی ہوسکتا ہے ؛ پھر فرمایا : اے بلال ! خرچ کر اور تنگی کا خوف نہ کر (حوالۂ مذکور) ۔ فرط سخاوت سے آپؐ سائل کے سوال کی درشتی اور کرختگی کو بھی نظر انداز فرما دیتے تھے ۔ ایک مرتبہ ایک بدّو نے نہایت درشتی سے آ کر آپؐ کی چادر کو کھینچا ، جس سے آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گیا اور پھر کہا : محمد ! یہ مال تیرا ہے اور نہ تیرے باپ کا ، میرے ان دو اونٹوں پر کچھ مال لاد دے ۔ آپؐ نے فرمایا : نہیں اور پھر تین مرتبہ استغفار پڑھا اور اسے نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کے ایک اونٹ پر جَو اور دوسرے پر کھجور لادنے کا حکم دیا اور جب اونٹوں پر کھجوریں لاد دی گئیں تو فرمایا : اللہ کی برکت کے ساتھ رخصت ہو جاؤ (ابو داؤد ، ۵ : ۱۳۴ ، حدیث ۴۷۷۵ ؛ النسائی حدیث ۴۷۸۰) ۔ النسائی نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ صحابہؓ نے جب اس کی یہ بات سنی تو اسے پکڑنے کے لیے دوڑے ، مگر آپؐ نے فرمایا : میں تمہیں پختہ حکم دیتا ہوں کہ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہ ہلو جب تک میں اس کی اجازت نہ دوں ۔ یہ ہی فرط سخاوت کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی آپؐ کے زیر استعمال بالکل نئی چیز کو آپؐ سے طلب کرتا، خواہ وہ آپؐ کو پسند ہی ہوتی، آپؐ اتار کر سائل کو سونپ دیتے (البخاری، ۴ : ۱۲۲ ، الادب) ۔ بعض اوقات جس مالک سے چیز خریدتے ، قیمت ادا کرنے کے بعد اسی کو ہبہ کر دیتے (البخاری ، ۲ : ۵ ، البیع ، باب ۳۳) ۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو ہبہ کر دیا ۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت جابرؓ بن عبداللہ کو ان کے اونٹ کی قیمت ادا کر دینے کے بعد وہ اونٹ انہیں کو لوٹا دیا (کتاب مذکور ، ص ۱۶ ، ۲۰ ، باب ۳۴ و ۴۷).

فرط سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اگر بربناے تنگی وقت کچھ مال بچ رہتا ، تو طبیعت پر گراں گزرتا اور آپؐ کا سکون و آرام ختم ہو جاتا ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک شب میں نے آپؐ کو بستر پر کروٹیں بدلتے دیکھا تو عرض کیا : یا رسولؐ اللہ ! کیا طبیعت ناساز ہے یا اللہ کی طرف سے کوئی نیا حکم ملا ہے ؟ فرمایا : یہ بات نہیں ۔ پھر اپنے تکیے کے نیچے سے تین درہم نکال کر دکھائے اور فرمایا : گزشتہ روز کچھ مال آیا تھا اور یہ درہم تقسیم ہونے سے رہ گئے تھے ؛ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اسی حال میں مجھے خدا کی طرف سے بلاوا نہ آ جائے (اعلام النبوۃ ، ص ۱۵۵) ۔ ایسے ہی ایک اور موقع پر رئیس فدک نے کچھ سامان بھیجا اور وہ رات گئے تک تقسیم ہونے سے بچ رہا تو آپؐ نے یہ رات مسجد میں گزاری (ابو داؤد، ۳: ۴۴۰ تا ۴۴۲، حدیث ۳۰۵۵) ۔ آپؐ نے یہ اعلان فرمایا ہوا تھا کہ مرنے والے کا ترکہ وارثوں کے لیے ہے اور قرضہ میرے ذمے (البخاری) .

(۶) مروّت و حیا : عرب میں شرم و حیا کا بہت کم رواج تھا ؛ لوگ ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہونے میں کوئی قباحت نہ سمجھتے تھے حتّٰی کہ کعبہ [رک بآں] کا طواف بھی بعض قبائل برہنہ کرتے

تھے ، مگر آپؐ کے متعلق حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں : کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اشد حیاء من العذراء فی خدرھا (مسلم، ۴: ۱۸۰۹ حدیث ۲۳۲۰)، یعنی آپؐ دوشیزہ لڑکی سے بھی زیادہ حیا دار تھے ۔ آپؐ حیا کو ایمان کا شعبہ قرار دیتے تھے (البخاری ، ۱: ۱۴ ، الایمان، باب ۱۶)۔ آپؐ کے نزدیک حیا ہی انسان کا اصل سرمایہ ہے ، اگر وہ نہ رہے تو انسان جو چاہے کرے : اذالم تستح فافعل ماشئت (البخاری، کتاب الادب ؛ ابو داؤد ۵ : ۱۴۹ ، حدیث ۴۷۹۷ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۳۴۱۸ ؛ احمد بن حنبل ، مسند ، ۵ : ۲۷۳)۔ عموماً رفع حاجت کے لیے اتنے دور نکل جاتے کہ دور سے بھی کسی کو دکھائی نہ دیتے ۔ فرط حیا کا یہ عالم تھا کہ بنائے کعبہ کے وقت پتھر اٹھا کر لانے والوں نے چادریں (ازار) اتار کر کندھوں پر رکھ لی تھیں ۔ انھیں دیکھ کر آپؐ نے بھی ایسا ہی کیا ، مگر فوراً آپؐ بے ہوش ہوکر گر پڑے ۔ ہوش آیا تو زبان پر "ازاری ، ازاری" (میری چادر) کے الفاظ جاری تھے (ابن سعد ، ۱ : ۱۴۵ ببعد)۔ اسی بنا پر آپؐ صحابہؓ کو اس نوع کے مسائل سمجھانے کے لیے اشاروں کنایوں سے کام لیتے (عیاض : الشفا ، ۵۲)۔ فرط حیا کی وجہ سے آپؐ نے کبھی اپنی ازواج کے سامنے بھی برہنگی اختیار نہیں کی اور نہ پسند فرمائی (حوالۂ مذکور؛ نیز ابو داؤد ، ۴ : ۳۰۲ حدیث ۴۰۱۲ ببعد)۔ عموماً میت کو غسل دیتے وقت اس قسم کی بے احتیاطی ہو جاتی ہے ، مگر آپؐ نے یہ دعا (گویا وصیت) فرمائی کہ اے اللہ ! اس کی آنکھیں پھوڑ دے جو میرا ستر دیکھے (حوالۂ مذکور) ؛ چنانچہ آپؐ کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا (ابو داؤد ، ۳ : ۲۵۰۲ ، حدیث ۳۱۴۱ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۱۴۶۴)۔

(۷) احکام الٰہی پر عمل کا اہتمام : سیرت طیبہ کے امتیازی اوصاف میں آپؐ کا یہ وصف نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ آپؐ کو اپنی تمام زندگی میں احکام الٰہی پر شدّت سے عمل کا اہتمام رہا ۔ اسی بنا پر آپؐ کے جاننے والوں نے آپؐ کی زندگی کو مجسم قرآن قرار دیا (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۳۶۴) ۔ قرآن کریم میں آپ کی طرف سے بار بار یہ اعلان دہرایا گیا ہے : اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ (۶ [الانعام] : ۵) ، یعنی میں (خود) انھی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیے جاتے ہیں ۔ دوسرے مقام پر ہے : قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۶ [الانعام] : ۱۶۲) ، یعنی آپؐ فرما دیجیے میری نماز ، میری قربانی ، میری زندگی اور موت صرف خدا ہی کے لیے ہے۔ آپؐ کی عملی زندگی کا یہ پہلو آپؐ کی صداقت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اس سے خدائی پیغام پر آپؐ کے پختہ اور غیر متزلزل یقین کا اظہار ہوتا ہے، جو کسی متنبّی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم نازل ہوتا آپؐ سب سے پہلے اس پر عمل کرتے ؛ پھر دوسروں کو عمل کی دعوت دیتے ۔ آپؐ کی طرف سے قرآن میں کہا گیا : یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱ [الصّف] : ۲)، یعنی اے اہل ایمان ! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو ۔ ایک اور جگہ یوں کہا گیا : اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (۲ [البقرۃ] : ۴۲) ، یعنی کیا تم دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھلا دیتے ہو ۔ آپؐ کے دشمنوں کو بھی یہ تسلیم تھا کہ آپؐ مجسمۂ عہد و وفا اور پیکر مہر و محبت ہیں ۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ نے اپنے پرانے دشمنوں سے، جو سر جھکائے آپؐ کے فیصلے کے منتظر کھڑے تھے، پوچھا : تمہیں اب (مجھ) سے کیا توقع ہے ؟ سب نے کہا : ہم آپؐ سے بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں، کیونکہ آپؐ ایک شریف النفس باپ کے شریف النفس بیٹے ہیں (الواقدی :

المغازی، ۲ : ۸۳۵).

آپؐ نے خود کو کبھی بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ حکم خداوندی کی تعمیل سے بالاتر خیال نہیں کیا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر سب کے ساتھ مل کر خندق کھودی (البخاری، ۴ : ۲۱۱)؛ مسجد نبوی کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر عملی طور پر حصہ لیا، بلکہ آپؐ نے فرط عبودیت سے اپنے اوپر دوسروں سے کچھ زیادہ ہی پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں، مثلاً آپؐ خود کو اور اپنے اہل و عیال کو زکوٰۃ [رک باں] کا حق دار نہیں سمجھتے تھے (مسلم ۲ : ۷۵۱، حدیث ۱۰۶۹ تا ۱۰۷۱)۔ آپؐ نے نماز تہجّد کا عمر بھر فرض نماز کی طرح اہتمام فرمایا (کتاب مذکور، ص۵۰۸، حدیث ۷۳۶ ببعد)۔ آپؐ نماز میں اس قدر طوالت فرماتے کہ قیام میں کھڑے کھڑے پاے مبارک متورم ہو جاتے۔ سجدے میں جاتے تو لگتا آپؐ کی روح ہی نکل چکی ہے۔ ذاتی معاملات میں کبھی کسی سے مؤاخذہ نہ فرماتے؛ ہاں، اگر دین کا معاملہ ہوتا تو پھر کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے (مشکوٰۃ، ۳ : ۱۹۱، حدیث ۵۷۱۷)۔ گویا آپؐ کی تمام زندگی اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، جس کی آپؐ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے۔ اس طرح آپؐ کی سیرت طیبہ کا یہ سب سے روشن پہلو ہے اور پیغمبرانہ کردار کی یہی خصوصیت ہے۔

(۸) دینی معاملات میں میانہ روی: دین اور دینی مسائل کے بارے میں اتنے اہتمام کے باوجود آپؐ کو رہبانیت (ترک دنیا) کا اسلوب قطعی ناپسند تھا۔ اگر کسی نے اپنے طبعی میلان کی وجہ سے اس کی اجازت طلب بھی کی تو آپؐ نے سختی سے منع فرما دیا۔ خود آپؐ کا جو طرز عمل تھا اسے آپؐ نے یوں بیان فرمایا: "میں خدا سے تم سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں، مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا؛ نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور اسی طرح عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں"۔ پھر فرمایا: "یہی میرا طریقہ (سنت) ہے۔ جس نے میرے طریقے کو چھوڑا وہ میری امت سے نہیں" (البخاری، ۳ : ۴۱۱، کتاب النکاح، باب ۴۱، مطبوعہ لائیڈن)۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے آپؐ سے ہمیشہ روزے سے رہنے کی اجازت مانگی تو فرمایا: "زیادہ سے زیادہ تم صوم داؤدؑ، یعنی ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھ سکتے ہو"۔ پھر فرمایا: "تیرے بدن کا بھی حق ہے؛ تیرے گھر والوں کا بھی حق ہے" (کتاب مذکور، ۱ : ۴۴۳، کتاب الصوم، باب ۵۶، ۵۷)۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور بعض دیگر صحابہؓ نے عدم استطاعت نکاح کی وجہ سے اپنے آپ کو جسمانی طور پر ازدواجی زندگی کے ناقابل بنانے کا ارادہ کیا تو سختی سے منع فرما دیا (کتاب مذکور، ۳ : ۴۱۳ تا ۴۱۴)۔ ایک صحابی نے دنیا کے تمام بندھنوں سے الگ ہو کر ایک غار میں معتکف ہو کر عبادت الٰہی کرنے کی اجازت طلب کی تو فرمایا: "میں یہودیت یا عیسائیت کی طرح رہبانیت کی تعلیم نہیں لے کر آیا، بلکہ مجھے تو آسان اور سہل دین، دین ابراہیم، ملا ہے (احمد بن حنبل: مسند، ۵ : ۲۶۶)۔

کتب احادیث و سیرت میں اس طرح کے بے شمار واقعات سے اس بات کی بخوبی شہادت ملتی ہے کہ آپؐ کو دنیا اور اس کے رشتوں سے قطع تعلق کرنا ہرگز گوارا نہ تھا۔ گویا اسے آپؐ ایک طرح کا عملی زندگی سے فرار اور قنوطیت سمجھتے تھے اور آپؐ کے نزدیک زندگی کی طرف یہ منفی رویہ کسی عالمگیر اور پائدار مذہب (اور اس کے بانی) کے شایان شان نہیں تھا۔ اس کے بالمقابل آپؐ کے رویے میں امید و رجا کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ آپؐ کا مسلک یہ رہا ہے کہ دنیا میں رچ بس کر دنیا کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے۔ اگر آپؐ کا کام رہبانیت،

یعنی خود کو برائی سے بچانے تک محدود ہوتا ، تو آپؐ کو اپنی عملی زندگی میں اتنی مشکلات اور مصائب و آلام کا سامنا ہرگز نہ کرنا پڑتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے یہ از بس ضروری تھا کہ آپؐ خود ان معاملات میں عملاً حصہ لیتے اور آپؐ نے ایسا ہی کیا۔

(۹) تواضع : بارگاہ خداوندی سے آپؐ کو وہ بلند مرتبہ ملا تھا، جو مذہبی اور سیاسی اعتبار سے دنیا کے کسی فرد کو بھی نہیں ملا ۔ با ایں ہمہ آپؐ ہمیشہ مجسّمۂ تواضع و انکسار رہے اور زبان مبارک سے ایسا لفظ کبھی نہ نکلا، جس سے کبر و غرور کا شائبہ تک محسوس ہوتا ہو ۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے، کسی کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مجھے یونس بن متّی پر فوقیت دے (مسلم ، الفضائل ۴ : ۱۸۴۶ ، حدیث ۲۳۷۷ ؛ البخاری ، ۲ : ۳۶۰ ، الانبیاء) ۔ ایک مرتبہ ایک یہودی کی ایک مسلمان سے حضرت موسیٰؑ اور آپؐ کی فضیلت کے بارے میں تکرار ہو گئی ۔ آپؐ کو پتا چلا تو فرمایا : "مجھے موسیٰؑ پر فوقیت نہ دو، کیونکہ لوگ جب قیامت کے دن بے ہوش ہوں گے تو سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گا میں دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں ۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے ہوں گے، یا ان کو بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہوگا (البخاری ۲ : ۳۵۴، الانبیاء؛ مسلم ، الفضائل، ۴ : ۱۸۴۴، حدیث ۲۳۶۳ ؛ احمد بن حنبل : مسند، ۲ : ۲۶۴) ۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپؐ کو "یا خیرَالبریّۃ !" کہہ کر پکارا ۔ آپؐ نے فرمایا: "وہ تو ابراہیمؑ تھے" (مسلم، الفضائل، ۴: ۱۸۳۹، حدیث ۲۳۶۹؛ ابو داؤد، ۵: ۵۴، حدیث ۴۶۷۲) ۔ ایک دفعہ ایک وفد آیا اور کہنے لگا : "آپؐ ہمارے سردار ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا: "تمھارا (اصلی) سردار تو اللہ تعالیٰ ہے" وفد نے عرض کیا : "آپؐ ہم میں سب سے زیادہ افضل ہیں اور عظمت کے مالک ہیں" ۔ فرمایا : "اپنی سی بات کہو، مبادا تمھیں شیطان بہکا دے" (ابو داؤد ، ۵ : ۱۵۴ تا ۱۵۵ ، حدیث ۴۸۰۱)۔ ایک دوسری روایت (احمد بن حنبل : مسند ، ۳ : ۱۵۳) میں اس کے آخر میں یہ اضافہ ہے : "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول محمد بن عبداللہ ہوں ۔ مجھے خدا نے جو رتبہ بخشا ہے ، میں پسند نہیں کرتا کہ مجھے اس سے زیادہ بڑھایا جائے"۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا : "اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی نازل فرمائی ہے کہ تم سب انکسار اختیار کرو ؛ کوئی کسی پر نہ زیادتی کرے اور نہ گالی گلوچ (ابن ماجہ، کتاب الزھد ، حدیث ۴۱۲۱؛ ابو داؤد ، ۵ : ۲۰۳ ، حدیث ۴۸۹۵) ۔ ایک دفعہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ کی وجاہت کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا ۔ آپؐ نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے فرمایا: میں بادشاہ نہیں؛ میں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت (=قدید) کھاتی تھی (ابن الجوزی، ۲: ۴۳۷ ؛ حاکم : مستدرک ، ۳ : ۴۸، ذکر فتح مکہ)۔

ایک بار آپؐ نے بنی اسرائیل کے دو افراد کا واقعہ بیان فرمایا جن میں سے ایک اپنے نیک اعمال کی وجہ سے تکبّر کرتا تھا اور دوسرا اپنی بداعمالی پر نادم اور غم زدہ رہتا تھا ؛ اللہ تعالیٰ نے مؤخرالذکر کو بخش دیا اور اول الذکر کی گرفت فرمائی (ابو داؤد، ۵ : ۲۰۷ ، حدیث ۴۹۰۱) ۔ صرف زبانی حد تک ہی نہیں بلکہ خورد و نوش اور دوسرے تمام معاملات میں بھی آپؐ عجز و انکسار کو پسند فرماتے تھے ۔ آپؐ کا ارشاد تھا : "میں ایک عبد کی طرح کھانا کھاتا ہوں اور ایک عبد کی طرح زمین پر بیٹھتا ہوں (ابن الجوزی : الوفا، ۲: ۴۳۸ [نیز دیکھیے نیچے، بذیل ضمنی عنوان : (۱۱) سادگی]).

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ یہ پسند نہ فرماتے تھے کہ اپنی علو شان دکھانے کے لیے دوسروں پر اپنی

فوقیت جتائی جائے، بلکہ آپؐ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ آپؐ کے جاں نثاروں کے سامنے دیگر انبیا اور مشاہیر عالم کے عمدہ پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے، ورنہ آپؐ کی عظمت و جلالت تو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: "انا سیّد وُلد ادم، و اول من تنشق عنه الارض، و اول شافع و اول مشفّع" (مسلم، الفضائل، ۴: ۱۷۸۲، حدیث ۲۲۷۸؛ ابو داؤد، ۵: ۵۴، حدیث ۴۶۷۳)، یعنی میں بنی آدم کا سردار ہوں اور وہ پہلا شخص ہوں، جس کے لیے زمین شق ہوگی اور جس کو سب سے پہلے شفاعت کی اجازت ملے گی اور جس کی سب سے پہلے شفاعت قبول کی جائے گی"۔ قرآن مجید میں بھی دیگر انبیا پر آپؐ کی فضیلت کا کثرت سے ذکر کیا گیا ہے (مثلاً دیکھیے ۳ [ال عمران]: ۸۱).

(۱۰) بے جا مدح سے گریز: طبیعی انکسار اور تواضع کی وجہ سے آپؐ بے جا مدح کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور ان موقعوں کے لیے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ایسے شخص کے منہ میں مٹی ڈال دی جائے (مسلم، الزھد، ۴: ۲۲۹۷، حدیث ۳۰۰۲؛ الترمذی، ۴: ۶۰۰، الزھد، حدیث ۲۳۹۴؛ ابن ماجہ، الادب، حدیث ۳۷۴۲)۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: "ہم آپؐ کے ذریعے اللہ سے اور اللہ کے ذریعے آپؐ سے شفاعت کے طلب گار ہیں کہ ہمارے علاقے پر بارش ہو"۔ یہ سن کر آپؐ کو سخت غصہ آ گیا اور فرمایا: "تیرا ناس ہو"۔ پھر تسبیح پڑھی کہ اس کا اثر صحابہؓ کے چہروں پر ظاہر ہو گیا اور فرمایا: "اللہ کی شان اس سے بلند تر ہے کہ اس کے ذریعے کسی بندے سے سفارش کی جائے" (ابو داؤد، ۵: ۹۵، حدیث ۴۷۲۶)۔ ایک مرتبہ کسی بچی نے کہا: "وَفِینا نبیٌّ یَعلَمُ ما فِی الْغَدِ"، یعنی ہمارے ہاں وہ نبی ہیں جو کل ہونے والی باتیں بھی جانتے ہیں، تو آپؐ کو ناگوار گزرا اور فرمایا "یہ کہنا چھوڑ دو اور جو پہلے کہا کرتی تھی وہی کہو" (البخاری، النکاح؛ الترمذی، ۳: ۳۳۹ حدیث ۱۰۹۰)۔ ابن ماجہ (باب الغناء والدف، حدیث ۱۸۹۷) نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ کل کی باتیں تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا: "سیدنا خیرنا و ابن خیرنا"۔ آپؐ یہ سن کر خفا ہوئے اور فرمایا: لوگو! "مجھے میرے رتبے سے زیادہ نہ بڑھاؤ" (ابن الجوزی: الوفا، ۲: ۴۳۵)۔ آپؐ فرمایا کرتے: "میری اس طرح مدح نہ کرو جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی کرتے ہیں۔ میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں" (البخاری، ۲: ۳۶۹، کتاب الانبیاء)۔ ایک مرتبہ بعض صحابہؓ نے آپؐ سے تعظیمی سجدے کی اجازت چاہی جو شام و عراق کے سرداروں میں رائج تھا تو آپؐ نے سختی سے فرمایا کہ اگر سجدہ مباح ہوتا، تو میں حکم دیتا کہ عورت اپنے خاوند کو سجدہ کرے (ابو داؤد، ۲: ۶۰۵، حدیث ۲۱۴۰؛ الترمذی، ۳: ۴۶۵، حدیث ۱۱۵۹؛ ابن ماجہ، حدیث ۱۸۵۳)۔ ایک مرتبہ ایک بدو کے اونٹ کا آپؐ کی ناقہ سے مقابلہ ہوا۔ اتفاقاً بدّو کا اونٹ جیت گیا۔ صحابہؓ کو اس سے دکھ ہوا آپؐ نے فرمایا: "جو چیز بڑھتی ہے، خدا اسے گرا بھی دیتا ہے" (البخاری، ۴: ۳۸، الجہاد؛ ابو داؤد، ۵: ۱۵۲، حدیث ۸۴۰۲)۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے دوران گفتگو یہ کہ دیا کہ جو اللہ اور اس کا رسول چاہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تم نے مجھے اللہ کا شریک اور ہمسر ٹھیرا دیا"؛ یہ کہو کہ جو خدا چاہے (البخاری: ادب المفرد).

اپنے متعلق ہی نہیں، بلکہ اپنے متّبعین کے متعلق بھی آپؐ کا یہی طرز عمل تھا۔ ایک روز آپؐ کے سامنے کسی صحابیؓ نے ایک دوسرے صحابی کی تعریف کی۔ آپؐ خفا ہوئے اور فرمایا: "تو نے اسے ہلاک کر دیا" (یا یہ کہ: تو نے اس کی گردن توڑ ڈالی)

(البخاری ۴ : ۱۲۷ ، باب الادب ، ۵۴ ؛ مسلم ، ۴ : ۲۲۹۶ ، حدیث ۳۰۰۰ ؛ ابن ماجہ ، حدیث ۲۷۴۴ ، المدح).

(۱۱) سادگی: آپؐ کو کھانے پینے ، پہننے اوڑھنے میں تکلف اور تصنع سخت ناپسند تھا - سادگی اور بے تکلفی ہمیشہ آپؐ کا معمول رہی - جو کچھ سامنے آ جاتا ، کھا لیتے ؛ جو کچھ ملتا ، پہن لیتے ؛ البتہ طبیعت میں نظافت ضرور تھی؛ چنانچہ کسی ایسی چیز کو پسند نہ فرماتے جس میں ظاہری یا معنوی طور پر نفاست نہ پائی جاتی ہو - کچا پیاز ، لہسن اور گوہ کا گوشت ، گو آپؐ نے حرام نہیں ٹھیرایا ، مگر خود کبھی نہیں کھایا (الترمذی ، ۴ : ۲۶۱ ، حدیث ۱۸۰۶ ، ۱۸۰۷) - اپنے متبعین سے بھی آپؐ یہی توقع رکھتے تھے کہ ان کے رہن سہن میں سادگی اور بے تکلفی رہے - ایک مرتبہ آپؐ حضرت فاطمۃ الزہراء کے مکان پر تشریف لے گئے ، مگر دروازے ہی سے پلٹ آئے - حضرت علیؓ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا : کسی پیغمبر کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی ایسے گھر میں داخل ہو جس میں زیب و زینت ہو (ابو داؤد ، ۴ : ۳۸۲ ، حدیث ۴۱۴۹) - ہوا یہ تھا کہ آپؐ کی صاحبزادیؓ نے گھر کی سجاوٹ کے لیے رنگین پردے دروازے پر ڈال لیے تھے ؛ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں چھت گیر لگی دیکھی تو فوراً چاک کر دی اور فرمایا : "کپڑا خود پہننے کے لیے ہوتا ہے اینٹ کو پہنانے کے لیے نہیں" (ابو داؤد ، ۴ : ۳۸۵ ، حدیث ۴۱۵۳) - ایک مرتبہ کسی نے آپؐ کو کمخواب کی بنی ہوئی بہت خوبصورت قبا بھیجی - آپؐ نے پہنی، مگر پھر اتار کر حضرت عمر فاروقؓ کو بھیج دی کہ فروخت کرکے اپنے کام میں لائیں (البخاری : ۱ : ۲۳۶ ، کتاب الجمعہ ، باب ۷ ؛ مسلم ، ۳ : ۱۶۳۸ ، حدیث ۲۰۶۸) - اسی طرح ایک موقع پر آپؐ کو کسی نے بہت خوبصورت چادر بھیجی ، جس کے حاشیے کاڑھے ہوئے تھے - آپؐ نے پہنی تو بہت بھلی معلوم ہوئی ، مگر ایک شخص کے سوال کرنے پر اتار کر اسے مرحمت فرما دی (البخاری ۴ : ۱۲۳ ، الادب ، باب ۳۹) - گو عورتوں کے لیے زیور ممنوع نہیں ، مگر آپؐ اپنی ازواج کے لیے یہ تکلف بھی پسند نہ فرماتے - ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن دیکھے تو فرمایا : "اگر تم ورس کے کنگنوں کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتی ، تو بہتر ہوتا" (النسائی : السنن، مطبوعہ قاہرہ، ۸:۱۵۹) - ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ کو سونے کی زنجیر پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا : کیا تجھے یہ بات اچھی محسوس ہوگی کہ لوگ یہ کہیں کہ رسول اللہ کی بیٹی کے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہے - پھر آپؐ بیٹھے بغیر لوٹ گئے - اس پر حضرت فاطمہؓ نے اس زنجیر کو بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا ، جس پر آپؐ بے حد خوش ہوئے (کتاب مذکور، ص ۱۵۵) - ایک بار حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ آپؐ جمعے اور وفود وغیرہ کے اجتماعات کے لیے کوئی عمدہ لباس (حلۃ سیراء) خرید لیں - فرمایا : "یہ تو وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو"(ابو داؤد ، ۱: ۶۴۹، حدیث ۱۰۷۶) - ایک مرتبہ آپؐ باہر نکلے تو ایک قبّہ بنتے ہوئے دیکھا- دریافت فرمانے پر پتا چلا کہ یہ فلاں شخص کا ہے - آپؐ یہ سن کر خاموش ہو گئے - اگلے دن جب وہ شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس سے اعراض فرمایا - اس نے اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا - انھوں نے بتایا کہ کل آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تمہارے زیر تعمیر قبے کو دیکھا تھا - اس نے یہ سن کر اپنا قبہ گرا دیا (ابو داؤد : السنن، ۵ : ۴۰۳).

آپؐ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ اگر مجلس سے گھر

جا کر واپس آنا ہوتا تو اپنی جوتیاں وہیں چھوڑ جاتے اور برہنہ پاؤں جاتے اور واپس آتے (ابو داؤد ، ۵ : ۱۸۰ ، حدیث ۴۸۵۴) - ایک مرتبہ لوگ آپؐ کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے تو آپؐ کو ناگوار ہوا اور فرمایا : "تم عجمیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ کر کھڑے نہ ہو جایا کرو (ابن ماجہ : السنن، حدیث ۳۸۳۹؛ ابو داؤد، ۵:۳۹۸، حدیث ۵۲۳۰) - گھر میں جو گدا تھا، اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی (الترمذی ، ۴ : ۲۹۸ ، حدیث ۱۷۶۱).

(۱۲) زھد و قناعت : آپؐ کی سیرت طیبہ کا ایک اور نمایاں وصف آپؐ کا زندگی کے ہر دور میں زھد و قناعت اختیار کرنا بھی ہے - آپؐ کا یہ زھد و قناعت اضطراری نہیں ، اختیاری تھا - حیات مبارکہ کے مکی اور مدنی ، دونوں ادوار میں مال و دولت کی آپؐ کے پاس ہرگز کوئی کمی نہ تھی ، مگر آپؐ مال و متاع دنیوی سے ایک حد سے زیادہ استمتاع صحیح نہیں سمجھتے تھے ؛ چنانچہ آپؐ کے زھد و قناعت کا اس دور میں بھی ، جب کہ فتوحات سے حاصل شدہ قیمتی مال و متاع کی کچھ کمی نہ تھی ، یہ عالم تھا کہ حضرت عبداللہ کہتے ہیں ، کہ ایک مرتبہ آپؐ ایک کھجور کی چٹائی (حصیر) پر آرام فرما رہے تھے اور جسم مبارک پر اس چٹائی کے نشانات بہت واضح دکھائی دے رہے تھے؛ میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپؐ اجازت دیں تو ہم اس سے زیادہ نرم چیز آپؐ کے نیچے بچھا دیا کریں"- فرمایا : "مجھے بھلا دنیا سے کیا غرض ؟ میری مثال تو اس مسافر کی سی ہے جو تپتی دوپہر میں ذرا سی دیر سستانے کے لیے کسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ جائے اور پھر آرام کرکے چل دے" (ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۷۵) - اسی طرح حضرت ابو امامہؓ نقل کرتے ہیں کہ آپؐ کے سامنے بطحاے مکہ کو سونے کا بنا کر پیش کیا گیا ، مگر آپؐ نے فرمایا : "یا اللہ ! مجھے یہ (مال و دولت) منظور نہیں - میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن کچھ کھانے کو مل جائے اور ایک دن فاقہ رہے ، تاکہ سیر ہوکر تیری تعریف اور شکر ادا کروں اور بھوکا رہ کر تضرّع اختیار کروں اور تجھ سے دعا مانگوں" (حوالۂ مذکور) - حضرت عائشہؓ نے ایک رات بستر کو نرم رکھنے کے لیے لیف اور اذخر کے دو بچھونے بچھا دیئے ، مگر آپؐ نے ناپسند فرمایا (حوالۂ مذکور).

امّ المومنین حضرت عائشہؓ، جنھوں نے آپؐ کے ساتھ دس سال گزارے، فرماتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی شکم سیر ہوکر کھانا نہیں کھایا اور نہ کبھی اپنے اس حال کی کسی سے شکایت کی ! فاقہ کرنا آپؐ کو غنا سے زیادہ پسند تھا - اگرچہ آپؐ نے تمام رات بھوک کی شدت سے کروٹیں بدلتے ہوے گزاری ہوتی، پھر بھی، آپؐ اگلے دن روزہ رکھنا نہ چھوڑتے - اگر آپؐ اللہ سے زمین کے تمام خزانے اور پھل وغیرہ مانگنا چاہتے تو آپؐ کو دے دیے جاتے (مگر آپؐ نے اسے پسند نہیں فرمایا)- میں آپؐ کی یہ حالت دیکھ کر ، فرط محبت سے ، رو پڑتی تھی - میں اپنا ہاتھ آپؐ کے شکم مبارک پر پھیرتی (کہ بھوک سے کیا حال ہوگیا ہے) اور کہتی : میری جان آپؐ پر فدا ! اگر آپؐ اتنا ہی مال دنیا قبول فرما لیا کریں جو آپؐ کی جسمانی قوت کو بحال رکھ سکے تو بہتر ہو - آپؐ فرماتے : "مجھے مال دنیا سے کیا واسطہ ؟ میرے اولوالعزم بھائیوں (سابق انبیاء) نے اپنے سخت احوال پر بھی صبر کیا - پھر وہ اپنے رب کے پاس جا پہنچے، جہاں انھیں ان اعمال کے بدلے پورا اعزاز و اکرام ملا - مجھے شرم آتی ہے کہ میں عیش دنیا میں پڑ کر ان سے کم رہ جاؤں - میرے نزدیک سب سے اچھی بات اپنے بھائیوں سے ملنا ہے"- اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد آپؐ کا وصال ہوگیا (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۶۳).

جب وصال ہوا اس وقت بھی آپؐ کی ایک زرہ

ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی جس کے عوض غلہ ادھار لیا گیا تھا (الشفا ، ص ۶۲) - کئی کئی مہینے گزر جاتے اور بیت نبوی میں چولھا گرم نہ ہوتا، صرف پانی اور کھجور پر گزران ہوتی (حوالۂ مذکور)۔ اس قسم کے واقعات کتب سیرت میں بےشمار ہیں (نیز دیکھیے ابن الجوزی ، ص ۴۷۵ تا ۴۸۳)۔

(۱۳) اپنے کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اردگرد جاں‌نثاروں کی کمی نہ تھی - یہ جاں‌نثار ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے ، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بغیر عذر کے کسی سے خدمت لینا قطعاً منظور نہ تھا - آپؐ اپنے زیادہ سے زیادہ کام خود کرنا چاہتے اور دوسروں پر کم سے کم بوجھ بننا پسند کرتے تھے۔ (یہاں یہ یاد دلایا جا سکتا ہے کہ بعض صحابہؓ سے آپؐ نے یہ عہد لیا تھا کہ وہ کسی شخص سے کسی قسم کی مدد نہیں لیں گے) - تعمیر خانہ کعبہ کے وقت آپؐ نے سب کے ساتھ مل کر مزدوروں کی طرح کام کیا (ابن سعد : الطبقات ، ۱: ۱۴۵) - مسجد نبوی اور مسجد قبا کی تعمیر اور بعد ازاں احزاب کے موقع پر خندق کھودنے میں بھی صحابۂ کرامؓ کے ساتھ شریک عمل رہے - بلکہ خندق کھودنے کے دوران میں جب کوئی مشکل مرحلہ آ جاتا تو آپؐ ہی کو بلایا جاتا (الواقدی : المغازی ، ۲ : ۴۵۰ تا ۴۵۱)۔

خانگی امور کے متعلق آپؐ کے دیکھنے والوں کا بیان یہ ہے کہ کان یخدم نفسہٗ (قاضی عیاض : الشفا ، ص ۵۸) ، یعنی آپؐ اپنے کام خود کیا کرتے تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق آپؐ گھر کے کام کاج میں اپنی ازواج کا ہاتھ بٹاتے ؛ کپڑوں میں پیوند لگاتے ، گھر میں جھاڑو دیتے ، دودھ دوہ لیتے ، بازار سے سودا سلف لے آتے ، ڈول درست کر دیتے ، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے ، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھ دیتے (البخاری : الصحیح ، ۴ : ۱۲۲ ؛ الشفا ، ص ۵۸) ، کوئی جانور بیمار ہوتا تو اسے علاج کے طور پر داغ دیتے (مسلم)؛ کوئی چیز مرمت طلب ہوتی تو اس کی مرمت کر دیتے (احمد بن حنبل: مسند ، ۳ : ۴۶۹) ؛ دوران سفر اگر صحابہؓ کام بانٹنا چاہتے تو آپؐ بھی معاونت فرماتے۔

صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کو دوسروں کے کام کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے - بعض مہمانوں کی خود خدمت گزاری کرتے (قاضی عیاض : الشفا)؛ اگر کسی صحابیؓ کے شریک جہاد ہونے کی بنا پر گھر میں کوئی ذمہ دار فرد نہ ہوتا تو آپؐ خود جا کر ان کے جانوروں کا دودھ دوہ دیتے۔

آپؐ کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کے کام کرنے میں بھی تأمل نہیں ہوتا تھا، مثلاً کسی بیوہ یا مسکین کے ساتھ مل کر ان کا کام کر دیتے (ابن الجوزی : الوفا ، ص ۴۳۷) - نیم دیوانی باندی آپؐ کو کسی کام کے لیے بلانے آتی تو آپؐ چل پڑتے اور فرماتے: "تو جس جگہ چاہے چل ، میں تیرا کام کروں گا (حوالۂ مذکور)۔ بعض بدو آتے اور آپؐ کو مسجد سے اپنے کام کے لیے لے جاتے ، ان کے بدوی لب و لہجہ کے باوجود آپؐ کو ذرا ناگواری محسوس نہ ہوتی (مسلم)۔

۲- حسن معاشرت : انسانی معاشرہ باہمی ربط و ارتباط سے تشکیل پذیر ہوتا ہے - اسی بنا پر جدید سوشیالوجی (عمرانیات) کی اصطلاح میں انسان کو Social animal کہا جاتا ہے - اس باہمی ارتباط سے جو رشتے استوار ہوتے ہیں (جن کے لیے اسلام میں رحم (۴ [النساء] : ۱) کی وسیع اور معنی خیز اصطلاح استعمال کی گئی ہے) - ان کی خوش ادائی ہی کا نام خلق [رک بہ علم اخلاق] ہے - پھر اس خوش ادائی کے بھی کئی مراحل ہیں : کسی کی نظر صرف اپنے کنبے اور خاندان تک محدود ہوتی ہے ؛ کوئی صرف اپنی ملّت یا قوم کے لوگوں کو ہی خوش خلقی کا مستحق سمجھتا ہے ، جبکہ بعض لوگ اپنے ذاتی خواہشات و

مفادات ہی کو اس کا معیار ٹھیرا لیتے ہیں ، لیکن تاریخ عالم میں ایک بزرگ ہستی ایسی بھی گزری ہے جس نے پورے انسانی معاشرے کو بحیثیت ایک کنبے، ایک قبیلے اور ایک وحدت کے تصور کیا ، بنی آدم کو بلا امتیاز رنگ و نسل ان کے جائز اور فطری حقوق عطا کیے ۔ اس کی نگاہ میں عربی اور عجمی، کالے اور گورے کی تفریق ہمیشہ بے معنی رہی ۔ یہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک و مسعود ہستی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیات طیبہ میں جس چیز نے سب سے زیادہ لوگوں کو متأثر کیا اور آپؐ کا گرویدہ بنایا وہ آپؐ کا حسن خلق اور جمیل طرز معاشرت ہی تھا ۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں آپؐ کی بے مثال کامیابی کو آپؐ کی نرمی اور شفقت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے : فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳ [آل عمرن] ۱۵۹) ، یعنی پس اللہ کی مہربانی سے آپؐ ان (لوگوں) کے لیے نرم ہوگئے اور اگر آپؐ ترش رو ، سخت دل ہوتے تو سب لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے ۔ قرآن کریم میں آپؐ کو اسی بنا پر عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹ التوبہ) : ۱۲۸) ؛ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۳۳ (الاحزاب] : ۶) ؛ اور سب سے بڑھ کر رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱ [الانبیا]: ۱۰۷) قرار دیا گیا ہے ۔ اسی سے لوگوں سے آپؐ کے سلوک کا ایک ما بہ الاشترک کلیہ استنباط کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے آپؐ کی بنی نوع انسان کے لیے پدرانہ و پیغمبرانہ محبت و شفقت ، نرمی اور عفو و درگزر ۔ یہ مابہ الاشتراک جذبہ آپؐ کی تمام حیات طیبہ کا خلاصہ ہے ؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جذبات آپؐ کے سینۂ اطہر میں ہمیشہ موجزن رہے ، دور نبوت میں بھی اور عرصہ قبل از نبوت میں بھی ۔ آپؐ چونکہ خود یتیمی اور کس مپرسی کا زمانہ گزار چکے تھے اس لیے دوسروں کے دکھ اور غم کا آپؐ بہت اچھی طرح اندازہ لگا سکتے تھے ۔

زمانۂ ما قبل از نبوت میں بھی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ [رک بآں] کی شہادت کے مطابق (دیکھیے البخاری ، ۱ : ۵) آپؐ ہمیشہ غریبوں ، محتاجوں اور بیکسوں کے ہمدرد ، مسافروں کے بہی خواہ ، بیواؤں اور ضعیفوں کے حامی و ناصر، بلکہ ان کو کما کر دینے والے رہے ۔ جنگ بُعاث [رک بآں] سے جو تباہی ہوئی ، اس نے آپؐ کے قلب اطہر پر خاص اثر کیا ؛ چنانچہ خوں ریزی کو روکنے کے لیے آپؐ نے حلف الفضول [رک بآں] کے دوبارہ احیا کے لیے انتھک کام کیا (ابن سعد ، ۱ : ۱۲۹ ، مطبوعۂ بیروت) ۔ یہ عہد نامہ مظلوم کی حمایت پر کمربستہ رہنے سے متعلق تھا ۔ دوسروں کے لیے آپؐ کے دل میں جو شفقت و محبت کا بے پناہ جذبہ تھا اس کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کے ہاں دین کی تعبیر ہی دوسروں کی خیر خواہی سے تھی ۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے: الدّین النصیحۃ (البخاری، ۱: ۲۳، کتاب الایمان، باب ۴۲ : مسلم ، ۱ : ۷۴، حدیث ۵۵، کتاب الایمان؛ بو داؤد، ۵ : ۲۳۴، حدیث ۴۹۴۴) ۔ یہ دوسروں کے لیے حد سے بڑھی ہوئی خیر خواہی ہی کا نتیجہ تھا کہ دوسروں کے ایمان قبول نہ کرنے کا غم ہمیشہ آپؐ کے لیے جان گسل رہا اور قرآن کریم کو بار بار آپؐ کی دل دہی کرنا پڑی : فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (۱۸ [الکہف] : ۶) ، یعنی کیا آپؐ اپنی جان کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے ہلاک کر ڈالیں گے۔

اسی بنا پر دوسروں سے معاملات کرنے میں ہمیشہ آپؐ کی طرف سے پیش رفت رہی۔ آپؐ کے ہاں دوسروں سے اپنے حقوق لینے پر اصرار کے بجائے ہر شخص کو اس کے حقوق دینے کا اصول کارفرما تھا ۔

قرآن کریم کی یہ آیت آپؐ کے اس جمیل طرز معاشرت پر بخوبی روشنی ڈالتی ہے : وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (۴۱ [حٰمٓ السجدة] : ۳۴) ، یعنی بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ آپؐ (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھوگے) کہ جس شخص میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ اسی بنا پر آپؐ گفتگو کرنے ، سلام و مصافحہ کرنے اور عمدہ برتاؤ کرنے میں ہمیشہ پہل فرماتے تھے۔

آپؐ کی معاشرتی زندگی کا تفصیلی بیان نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اس کی گنجائش ہے، البتہ آپؐ کی حسین و دلآویز طرز معاشرت کے چند خصائص ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں، تاکہ آپؐ کے حسن معاشرت کا کچھ اندازہ ہو سکے :

(۱) جذبۂ اخوت و ہمدردی : دوسروں کے لیے آپؐ کے دل میں ہمیشہ ہمدردی اور مہربانی کے جذبات موجزن رہے۔ اس مسئلے میں آپؐ کے نزدیک اپنے بیگانے ، آزاد اور غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے : "میرے سامنے دوسروں کی ایسی باتیں نہ کیا کرو جنھیں سن کر میرے دل میں ان کے متعلق کوئی کدورت پیدا ہو جائے ، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں سب سے صاف دل (سلیم الصدر) کے ساتھ ملوں (ابو داؤد : سنن ، ۵ : ۱۸۳، حدیث ۴۸۶۰؛ الترمذی : ۵: ۷۱۰، حدیث ۳۸۹۶، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۶۵ء) ۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے دو افراد کے متعلق آپؐ کو کوئی شکایت پہنچائی ۔ یہ سن کر آپؐ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو کنایۃً فرمایا کہ اس طرح کی باتیں مجھے نہ پہنچایا کرو" (الترمذی ، حوالۂ مذکور؛ البخاری ، ۴ : ۱۲۷) ۔ اس کے برعکس آپؐ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو ترغیب دلایا کرتے تھے کہ دوسروں کے حق میں اچھی باتیں کیا کرو ۔ ایک موقع پر فرمایا : "لوگوں کی میرے سامنے سفارش کرو تاکہ تم اجر پاؤ اور اللہ اپنے نبیؐ کی زبان پر جو چاہے فیصلہ جاری کر دے (البخاری، الادب ؛ مسلم (البر) ، ۴ : ۲۰۲۶ ، حدیث ۲۶۲۷) ۔ یہی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ تھا کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے خدا سے پختہ عہد لے رکھا ہے، اگر بتقاضاے بشریت میری زبان سے کسی کے حق میں کوئی غیر مفید دعا یا جملہ نکل بھی جائے تو متعلقہ فرد کو اس کے بدلے میں رحمت ، دل کی پاکیزگی اور روز قیامت کے لیے ذریعہ قربت بنا دے (مسلم، ۴ : ۲۰۰۰ ، حدیث ۲۶۰۰ تا ۲۶۰۴)؛ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اخلاق کی بلندی یہ نہیں کہ تم اس کے ساتھ نیکی کرو جو تمھارے ساتھ نیکی کرے اور اس کے ساتھ برائی کرو جو تمھارے ساتھ برائی کرے ، بلکہ صحیح اخلاق تو یہ ہے کہ ہر شخص سے نیک سلوک کرو خواہ وہ تم سے برے طریقے ہی سے پیش آئے یا تم پر زیادتی کرے ۔ اسی بنا پر آپؐ کے نزدیک نیکی کا مفہوم ہی حسن خلق، یعنی دوسروں سے اچھا برتاؤ تھا ۔ آپؐ کا ارشاد ہے : البِرُّ حسن الخلق (مسلم، ۴ : ۱۹۸۰، حدیث ۲۵۵۲)۔ یہ بھی آپؐ ہی کا ارشاد ہے : اکمل المؤمنین ایماناً احسنہم خلقاً (الترمذی : السنن: ۳، ۴۶۹، حدیث ۱۱۶۲؛ ابو داؤد، ۵ : ۶ ، حدیث ۴۶۸۲) ، یعنی ایمان کی تکمیل اخلاق اور طرز معاشرت کی تکمیل کے بغیر نہیں ہو سکتی ؛ انّ خیارکم احاسنکم اخلاقاً (البخاری، ۴ : ۱۲۱، کتاب ۷۸، باب ۳۹)، یعنی تم میں وہی بہتر ہے جس کا اخلاق دوسروں سے اچھا ہو ۔ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ اچھے اخلاق والے کو اچھے اخلاق کی وجہ سے روزے دار اور قائم اللّیل کا درجہ مل جاتا ہے (ابو داؤد : السنن ، ۵ : ۱۴۱، حدیث ۴۷۹۸) آپؐ کے نزدیک حسن خلق سے مراد چہرے کی بشاشت ، اچھائی کا پھیلانا اور

لوگوں سے تکلیف دہ امور کا دور کرنا ہے (الترمذی ، ۴ : ۳۶۳، حدیث ۲۰۰۵)؛ صرف یہی نہیں، آپؐ اس جذبے کو پورے معاشرے میں رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے ، ارشاد تھا : تم اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک دوسروں کے لیے بھی وہی پسند نہ کرنے لگو جو خود اپنے لیے پسند کرتے ہو (مسلم ، ۱ : ۶۷ ، حدیث ۴۵ ؛ احمد بن حنبل : مسند ، ۳ : ۲۷۲)۔ ایک موقع پر فرمایا : "ایک دوسرے پر بغض و حسد نہ کرو ، نہ ایک دوسرے سے رو گردانی اختیار کرو اور نہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات کی خواہ مخواہ ٹوہ لگاؤ اور اے اللہ کے بندو! سب بھائی بھائی ہو جاؤ" (مسلم، ۴ : ۱۹۸۵، حدیث ۲۵۶۳؛ البخاری ۴ : ۱۲۸ ، کتاب الادب) ۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی آپؐ کے در دولت سے پوری طرح مستفید ہوتے رہے ۔

(۲) حلم و بردباری : لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے میں اکثر حوصلہ شکنی ہوتی ہے ، ایسے مواقع پر آپؐ کا طرز عمل ہمیشہ عفو و بردباری کا رہا ؛ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں : "آپؐ نے تمام زندگی اپنے اوپر کی گئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیا ، بجز اس کے کہ خدائی حرمت کو پامال کیا گیا ہو ، پس اس صورت میں آپؐ سختی سے مؤاخذہ فرماتے تھے (البخاری ، ۳ : ۳۹۵ کتاب المناقب ، ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۱۲ ، کتاب الفضائل ، حدیث ۲۳۲۷ - آپؐ کا یہ بھی فرمان تھا : طاقتور وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ اصل طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت خود پر قابو رکھے" (البخاری ، ۴ : ۱۳۹، کتاب الادب ؛ مسلم، حدیث ۲۰۱۴) ۔ ایک شخص نے ایک موقع پر نصیحت سننے کی خواہش کی تو فرمایا : "غصہ نہ کیا کر اور اسے تین مرتبہ دہرایا (البخاری ، ۴ : ۱۳۹) - ایک مرتبہ ایک بدو آیا اور پیچھے سے آپؐ کی چادر پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا، کہ گردن مبارک پر نشان پڑ گیا ۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے نہایت درشتی سے کہا : "میرے ان اونٹوں پر کچھ مال لاد دے ، کیونکہ تو نہ اپنے مال سے لادے گا اور نہ اپنے باپ کے مال میں سے"۔ آپؐ نے فرمایا : "نہیں" اور تین مرتبہ استغفراللہ کہا - پھر آپؐ نے نہ صرف اسے معاف کر دیا بلکہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر کھجوریں لادنے کا حکم دیا (ابو داؤد ، ۵ : ۱۳۴ ، حدیث ۴۷۴۵ ؛ النسائی ، کتاب القسامہ، ۸ : ۳۳ و ۳۴، حدیث ۴۷۸۰) ۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے اس سے پوچھا : "تجھے کس چیز نے اس گستاخی پر ابھارا ؟" اس نے فوراً کہا : "آپؐ کے حلم اور بردباری نے"۔

ایک قبیلہ مسلمان ہوتے ہی قحط کا شکار ہو گیا ۔ وسائل کی کمی کے پیش نظر آپؐ نے ایک یہودی زید بن سعیہ سے اسّی دینار قرض لے کر انہیں خوراک مہیا کر دی ۔ ابھی اس کی ادائی کا وقت نہیں آیا تھا کہ زید آپؐ کی خدمت میں پہنچا اور نہایت درشتی اور کرختگی سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا اور کہا : "بخدا تم بنو عبدالمطلب بڑے ہی نادہند ہو"۔ حضرت عمرؓ اس کی اس گستاخی پر برافروختہ ہوگئے اور اس کا سر قلم کرنے کی اجازت چاہی ، مگر آپؐ نے فرمایا : "اے عمرؓ ! تمھیں چاہیے تھا کہ مجھے حسن ادا کی تلقین کرتے اور اسے حسن طلب کی"۔ پھر نہ صرف اس کے قرض کی فوری واپسی کا حکم دیا ، بلکہ بیس صاع (تقریباً دو من) زیادہ کھجوریں دینے کا حکم دیا ۔ یہ سلوک دیکھ کر وہ مسلمان ہوگیا (خفاجی : شرح شفا ؛ ابن الجوزی : الوفا ، ۲ : ۴۲۵ ببعد)۔

(۳) عفو و کرم : آپؐ جس طرح اپنوں کے لیے پیکر حلم و بردباری تھے اسی طرح دشمنوں کے لیے سراپا جود و کرم تھے ۔ آپؐ نے حیات

مبارک میں کسی ذاتی دشمن سے انتقام نہیں لیا (الترمذی : شمائل) ۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کا اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کو معاف کر دینا ، اپنے قتل کے لیے آنے والے قاتلوں کو بار بار چھوڑ دینا ، اس سلسلے کی روشن مثالیں ہیں (دیکھیے سطور بالا ؛ [نیز رک بہ غزوات نبوی)].

مدینہ منورہ میں ایک بہت بڑی تعداد منافقوں کی تھی ، جن کے رئیس عبداللہ ابن ابّی بن ابی سلول نے نہ صرف ہمیشہ در پردہ دشمنوں کی حمایت کا جرم کیا تھا ، بلکہ مختلف اوقات میں وہ آپؐ کے خلاف بغاوت ، افک وغیرہ کے واقعات میں براہ راست ملوث بھی رہا ، مگر آپؐ نے نہ صرف اسے معاف کیا بلکہ مرنے کے بعد اسے اپنی قمیص پہنائی اور ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے کا وعدہ فرمایا (البخاری ، ۱ : ۳۴۳ ، کتاب الجنائز) ۔ متعدد مرتبہ صحابہؓ نے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی ۔ مگر آپؐ نے سختی سے منع فرمایا (دیکھیے مفتی محمد شفیع: معارف القرآن، بذیل سورۃ المنافقون).

ایک بدوی نے ایک مرتبہ مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا ۔ صحابہؓ اسے مارنے کے لیے دوڑے ، مگر آپؐ نے روکا اور اسے اپنی حاجت سے فارغ ہونے دیا ۔ پھر آپؐ نے اس جگہ کو دھونے کا حکم دیا اور اسے نرمی سے سمجھا دیا (ابو داؤد ، ۴ : ۲۶۳ تا ۲۶۵، حدیث ۳۸۰؛ الترمذی، ۱: ۲۷۶، حدیث ۱۴۷؛ البخاری ، ۱ : ۷۶ ؛ مسلم ، ۴ : ۲۳۶) ۔ آپؐ کے خدام سے اکثر غلطیاں ہوجاتیں مگر آپؐ انھیں معاف فرما دیتے (مسلم ، ۴ : ۱۸۰۴، حدیث ۲۳۱۰) ۔ اس سلسلے میں بے شمار واقعات مروی ہیں.

(۴) دوسروں کے جذبات کا احترام : آپؐ دوسروں سے معاملہ کرنے میں ہمیشہ دوسروں کے جذبات کا احترام فرماتے ؛ کبھی کسی پر زبردستی اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے تھے.

حضرت عائشہؓ جب آپؐ کے عقد میں آئیں ، ابھی نوعمر تھیں ۔ اس عمر میں کھیل کود کی طرف ان کے فطری میلان کا آپؐ کو بخوبی احساس تھا ۔ اس بنا پر آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو اپنے کھیل کود کے مشاغل جاری رکھنے سے منع نہ فرمایا ۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں : "میرے ساتھ کھیلنے کے لیے میری ہمجولیاں میرے گھر آ جایا کرتی تھیں ۔ جب آپؐ تشریف لے آتے تو باہر نکل جاتیں ؛ جب آپؐ چلے جاتے تو پھر چلی آتیں (البخاری ، کتاب الادب ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۹۰، کتاب الفضائل ، حدیث ۲۴۴۰؛ ابو داؤد: السنن، ۵ : ۲۲۶، حدیث ۴۹۳۱) ۔ ایک مرتبہ کسی غزوے سے واپسی کے موقع پر جس ہودج میں حضرت عائشہؓ سوار تھیں ، ہوا کی وجہ سے اس کا پردہ ذرا سا اٹھ گیا ۔ آپؐ نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس گڑیاں ہیں اور ان میں ایک گھوڑا بھی ہے ، جس کے دو پر ہیں ۔ پوچھا : "اے عائشہؓ یہ کیا ہے" ؟ کہا : "میرے کھلونے ہیں"۔ فرمایا : "درمیان میں کیا ہے" ؟ کہا : "گھوڑا" ۔ فرمایا : "یہ اس پر کیا دکھائی دے رہا ہے ؟" کہا : "یہ دو پر ہیں"۔ آپؐ نے تعجب ظاہر فرماتے ہوئے پوچھا : "گھوڑا اور اس کے دو پر" ؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا : "آپؐ نے نہیں سنا کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جو گھوڑا تھا اس کے کئی پر تھے"۔ یہ سن کر آپؐ اتنا ہنسے کہ آپؐ کی داڑھیں دکھائی دینے لگیں (ابو داؤد : السنن، ۵: ۲۲۷، حدیث ۴۹۳۲) ۔ دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے معاملات کرتے وقت بھی آپؐ ان کے جذبات کا خیال رکھتے تھے ۔ ایک مرتبہ آپؐ حضرت سعدؓ بن عبادہ (رئیس قبیلہ خزرج) کو ملنے کے لیے تشریف لے گئے اور اپنے معمول کے مطابق تین مرتبہ جا کر بلند آواز سے سلام کیا اور واپس پلٹنے لگے۔ حضرت سعدؓ، جو دانستہ پست آواز سے جواب دیتے جاتے تھے تاکہ آپؐ کی یہ دعا زیادہ

ہو، پیچھے گئے اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپؐ کیوں لوٹ رہے ہیں"؟ فرمایا: "تم نے تینوں مرتبہ سلام کا جواب نہیں دیا تھا اس لیے واپس جا رہا ہوں"۔ حضرت سعدؓ نے کہا: "یا رسول اللہ! میں اس لیے آہستہ جواب دے رہا تھا تا کہ آپؐ ہمارے حق میں اور دعا مانگیں"۔ آپؐ نے یہ سنتے ہی فرمایا: "اے اللہ! سعدؓ بن عبادہ کے اہل و عیال پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرما"۔ واپسی پر انھوں نے سواری کے لیے آپؐ کو گھوڑا پیش کیا اور خود پیدل چلنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: "یا تو تم بھی سوار ہو جاؤ اور یا پھر واپس پلٹ جاؤ"۔ حضرت سعدؓ نے آپؐ کے برابر بیٹھنا سوے ادب خیال کیا اور واپس پلٹ گئے (ابو داؤد، ۵: ۳۷۲ تا ۳۷۴، حدیث ۵۱۸۵)۔

آپؐ اپنے جاں نثاروں کے جذبات کا اس حد تک احترام فرماتے تھے۔ ارشاد تھا: میں نماز لمبی کرنا چاہتا ہوں، مگر پیچھے سے مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو اس کی ماں کا خیال کرکے نماز مختصر کر دیتا ہوں (مسلم، ۱: ۳۴۲، حدیث ۴۷۰؛ النسائی، حدیث ۸۲۶)۔ لوگوں کی مشقت اور تکلیف کا خیال کرکے آپؐ نہایت مختصر وعظ فرماتے (ابو داؤد، ۱: ۶۶۳، حدیث ۱۱۰۷) اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے (کتاب مذکور، ۱: ۶۶۲، حدیث ۱۱۰۶)۔ جب کسی کو بطور حاکم مامور کرکے کسی جگہ بھیجتے تو فرماتے: "لوگوں کو خوشخبری دے کر اسلام سے مانوس کرنا اور انھیں (ڈرا دھمکا کر) متنفّر نہ کرنا؛ ان کے لیے آسانی پیدا کرنا، مشکل نہیں (مسلم، ۳: ۱۳۵۸، حدیث ۱۷۳۲؛ ابو داؤد، ۵: ۱۷۰، حدیث ۴۸۳۵)۔

(۵) مرتبہ دانی: آپؐ کی معاشرتی زندگی کی ایک اور خصوصیت مرتبہ دانی تھی۔ آپؐ کے ہاں ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا اصول کارفرما نہ تھا، (مگر یاد رہے کہ اس عزت افزائی میں بھی: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ، ۴۹ [الحجرات]: ۱۳، کا اصول پیش نظر رہتا تھا)۔ آپؐ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے: انزلو النّاس مَنَازِلَھُمْ (ابو داؤد، ۵: ۱۷۳، حدیث ۴۸۴۲)، یعنی لوگوں سے ان کے مرتبے کے مطابق سلوک کرو۔ آپؐ کا یہ فرمان بھی تھا: "سفید مو (بزرگ) مسلمان، وہ حامل قرآن جو اس میں نہ غلو کرتا ہو اور نہ اس سے کنارہ، نیز انصاف دوست بادشاہ کا اکرام کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اکرام کرنا ہے" (ابو داؤد، ۵: ۱۷۸، حدیث ۴۸۴۳)۔ جب بنو قریظہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے حَکم ہونے پر اپنے قلعوں سے نکلنا منظور کر لیا اور حضرت سعدؓ بلاوے پر وہاں پہنچے تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: قوموا الی سید کم او خیر کم (البخاری، ۴: ۷۵ الاستئذان، باب ۳۶؛ مسلم (الجہاد)، ۳: ۱۳۸۸، حدیث ۱۷۶۸)، یعنی اپنے سردار کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ مگر قانون اور حقوق میں آپؐ کے نزدیک چھوٹے بڑے سب برابر تھے؛ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "تمام مسلمانوں کی ذمہ داری برابر ہے۔ ان میں سے ادنیٰ شخص بھی اگر چاہے تو کسی کو پناہ دے سکتا ہے" (الترمذی: السنن، ۴: ۱۴۲، حدیث ۱۵۸۰) آپؐ نے یہاں تک فرمایا کہ ایک عورت بھی کسی کو پناہ دینے کی مجاز ہے (حوالۂ مذکور)؛ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ کی چچا زاد بہن حضرت ام ہانیؓ نے اپنے خاندان کے دو آدمیوں کو پناہ دے دی؛ آپؐ کے سامنے ذکر ہوا تو فرمایا: "جسے تو نے امان دی اسے ہم نے بھی امان دے دی" (حوالۂ مذکور)۔

اسی طرح کسی بڑے آدمی کی خاطرداری کے لیے آپؐ کو اپنے کسی ادنیٰ خادم کی دل شکنی بھی گوارا نہ تھی۔ ایک دفعہ مشرکین نے کہلا بھیجا کہ ہم اس شرط پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار ہیں کہ آپؐ اپنی مجلس سے چھوٹی قوم کے لوگوں

کو اٹھا دیں ۔ اس موقع پر آپؐ کی طرف سے قرآن کریم میں یہ جواب دیا گیا : وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاوَةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶ [الانعام] : ۵۲) ، یعنی جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو خاص اس کی رضا کے لیے پکارتے ہیں ان کو اپنے پاس سے مت نکالو.

(۶) دوسروں کے متعلق حسن ظن : آپؐ ہمیشہ دوسروں کے متعلق حسن ظن رکھتے تھے ۔ اسی بنا پر آپؐ کو کسی سے کوئی ایسی بات سننا گوارا نہ تھی جس سے آپؐ کے دل میں کسی کے خلاف کوئی کدورت پیدا ہونے کا احتمال ہو (الترمذی، ۵: ۱۰۷، حدیث ۳۸۹۶)۔ آپؐ کا ہمیشہ اس آیۂ کریمہ پر عمل رہا : يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (۴۹ [الحجرات] : ۱۲) ، یعنی اے اہل ایمان (دوسروں کے متعلق) بہت بدگمانی کرنے سے بچو کہ بعض گمان محض گناہ ہیں ۔ آپؐ کا ارشاد تھا : "حسن ظن اچھی عبادت ہے" (ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۶ ، حدیث ۴۹۹۳) ۔ ایک مرتبہ ایک شخص حاضر ہو کر کہنے لگا : "یا رسول اللہ ! میری بیوی کے ہاں سیاہ رنگ کا لڑکا پیدا ہوا ہے" (یعنی شک کا اظہار کیا) ۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تیرے پاس ایک کوہان والے اونٹ ہیں"؟ اس نے کہا : "ہاں"۔ فرمایا : "ان کا کیا رنگ ہے ؟" کہا: "سرخ"۔ فرمایا: "کیا ان میں مٹیالے رنگ کے بھی ہیں؟" کہا: "ہاں"۔ فرمایا: "وہ کہاں سے آئے؟" اس نے کہا : "شاید یہ کسی عرق نے اس کی طرف کھینچ لیا ہو"۔ فرمایا: "اپنے ہاں بھی یہی سمجھ لو" (الترمذی ، ۴ : ۴۳۹ ، حدیث ۲۱۲۸) ؛ آپؐ کا فرمان تھا : "تم خاص طور پر بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بہت ہی بری بات ہے" (مسلم، البر، ۴: ۱۹۸۰، حدیث ۲۵۶۳؛ الترمذی، البر، ۴ : ۳۵۶ ، حدیث ۱۹۸۸)۔ بدگمانی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے سے خواہ مخواہ بدظنی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ ایک ایسی بیماری ہوتی ہے جس کی لپیٹ میں آنے سے کوئی شخص بھی نہیں بچ سکتا ۔ آپؐ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے ۔ اسی بنا پر خود بھی آپؐ بدگمانی سے بچتے اور دوسروں کو بھی بدگمانی سے بچنے کی تلقین فرماتے.

اس کے ساتھ ہی آپؐ کا یہ بھی فرمان تھا کہ ان مواقع سے بھی بچو کہ جن سے دوسروں کو بدگمانی کا موقع مل سکتا ہے ۔ اسی بنا پر آپؐ عورت کو تنہا سفر کرنے ، یا کسی اجنبی مرد کے ساتھ خلوت کرنے سے روکتے تھے (البخاری ، ۳ : ۴۵۳ ، النکاح ، باب ۱۱۱ و ۱۱۲ ؛ ابو داؤد ، ۲ : ۳۴۶ ، ۳۴۷، حدیث ۱۷۲۳ ، ۱۷۲۴) ؛ آپؐ خود بھی ایسے مواقع سے بچتے تھے ، مثلاً ایک مرتبہ شام کو اپنی ایک بیوی کے ساتھ مصروف گفتگو تھے کہ دو صحابہؓ وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتے گزرنے لگے ۔ آپؐ نے فرمایا : "ٹھیر جاؤ ، یہ میرے ساتھ میری بیوی صفیہؓ ہے"! انھوں نے عرض کیا : "یا رسول اللہ ! معاذ اللہ کیا آپؐ کے متعلق بھی کسی کو بدگمانی ہو سکتی ہے" ؟ فرمایا : "شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے ۔ کیا خبر وہ تمھیں میرے متعلق بدگمانی میں مبتلا کر دے" (کتاب مذکور ، ۵ : ۲۶۷ ، حدیث ۴۹۹۴).

(۷) مکافات : معاملات میں انسانی فطرت عموماً بدلہ و مکافات کی طلب گار رہتی ہے ۔ آپؐ کو اس کا بخوبی احساس تھا ۔ اسی بنا پر آپؐ اپنے ملنے جلنے والوں کی ہمدردی کا ہمدردی سے جانثاری کا جانثاری سے اور احسان کا احسان سے بدلہ دیتے۔ غزوۂ احد میں جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ آپؐ کی طرف سے مدافعت میں تیر اندازی کر رہے تھے تو آپؐ ان کا ان الفاظ سے حوصلہ بڑھاتے: "ارم فداک ابی و امی" (البخاری ، ۳ : ۱۵۶ ؛ مسلم ، ۴ : ۱۸۷۶ ، حدیث ۲۴۱۱) ، یعنی تیر اندازی کر ، تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں ۔ ہدایا کے بارے میں آپؐ کا یہ

التزامی معمول بیان کیا گیا ہے: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یقبل الھدیۃ و یثیب علیھا (ابو داؤد، ۳: ۸۰۶، حدیث ۳۵۳۶)، یعنی آپؐ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر بدلہ بھی مرحمت فرماتے۔ اس بارے میں آپؐ کا فرمان تھا: تَھَادُوا تَحَابُّوا (مشکوٰۃ، ۲: ۵۵۰، حدیث ۴۶۹۳؛ مالک: موطأ) یعنی ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، اس سے باہمی الفت بڑھتی ہے۔ بدلہ دینے میں آپؐ یہ لحاظ نہ فرماتے کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے؛ چنانچہ ایک بدوی صحابیؓ زاھرؓ دیہاتی اشیا لا کر آپؐ کی خدمت میں پیش کرتے، آپؐ اس کو شہری چیزیں عنایت فرمایا کرتے اور کہا کرتے: ان زاھرًا بادینا ونحن حاضروہ (مشکوٰۃ، ۲: ۵۹۱، حدیث ۴۸۸۹؛ ابن الجوزی، الوفا، ۲: ۴۴۴)، یعنی زاھر ہمارا دیہاتی دوست ہے اور ہم اس کے شہری دوست ہیں۔

آپؐ کے نزدیک شکر گزاری بھی مکافات کی ایک صورت تھی؛ آپؐ کا ارشاد تھا: اگر تم میں سے کوئی کسی کو کچھ دے تو اسے اول تو اس کا بدلہ دینا چاہیے؛ اگر اس کی گنجائش نہ ہو تو اسے ہدیہ دینے والے کی تعریف کرنی چاہیے؛ جس نے ہدیہ دینے والے کی تعریف کی اس نے اس کا شکریہ ادا کر دیا اور جس نے اسے چھپایا اس نے اس کی ناشکری کی (ابو داؤد، ۵: ۱۵۸، حدیث ۴۸۱۳)۔ آپؐ کا یہ بھی ارشاد تھا کہ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا بھی شکرگزار نہیں ہو سکتا (ابو داؤد، ۵: ۱۵۷، حدیث ۴۸۱۱؛ الترمذی)۔ ایک مرتبہ یمن کے ایک حکمران نے آپؐ کو ایک قیمتی حلّہ بھیجا، جو ۳۳ اونٹوں کے عوض خریدا گیا تھا؛ آپؐ نے قبول فرمایا اور پھر آپؐ نے ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹوں سے خریدا ہوا حلہ اسے ارسال فرمایا (ابو داؤد، ۴: ۳۱۶، حدیث ۴۰۳۴)۔ اگر کوئی شخص ہدیہ دے کر اس کا بدلہ لینے سے ہچکچاتا تو آپؐ کو سخت تکلیف ہوتی؛ چنانچہ ایک بار ایک اعرابی نے آپؐ کو ایک اونٹ (ناقہ) دیا۔ تو آپؐ نے اسے اس کے بدلے میں چھ دو دو سال کے اونٹ (بکر) دینا چاہے اس نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ آپؐ نے اس موقع پر خطبہ دیا اور فرمایا: اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بجز قریشی، انصاری، ثقفی اور دوسی شخص کے کسی کا ہدیہ قبول نہ کروں گا (الترمذی، ۵: ۷۳۰، حدیث ۳۹۴۵)۔

(۷) خوش معاملگی: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم معاملات کو اس خوش اسلوبی سے نبھاتے کہ معاملہ کرنے والا شخص ہمیشہ کے لیے آپؐ کا گرویدہ ہو جاتا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے مجھ سے کچھ ادھار لیا۔ وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ آپؐ نے وہ قرضہ ادا فرمایا، بلکہ اس سے بھی زیادہ دیا (النسائی (البیوع)، ۷: ۲۸۳ تا ۲۸۴؛ ابو داؤد، ۳: ۶۴۲، حدیث ۳۳۴۷)۔ حضرت جابرؓ کی ایک دوسری روایت سے مزید آپؐ کی خوش معاملگی پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران سفر میں ان کا اونٹ ذرا سست رفتاری سے چل رہا تھا، آپؐ نے دیکھا تو پوچھا کہ اے جابرؓ! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ یہ اونٹ سست چل رہا ہے۔ آپؐ نے دعائے خیر فرمائی جس کی برکت سے سست رفتار اونٹ تیز چلنے لگا۔ پھر فرمایا کہ کیا تو اپنے اس اونٹ کو بیچنا چاہتا ہے؟ کہا ہاں؛ آپؐ نے کچھ اوقیہ چاندی پر خرید لیا۔ مدینہ پہنچنے پر قیمت بھی ادا فرما دی اور اس اونٹ کو بھی واپس لوٹا دیا (البخاری، ۲: ۱۶، البیوع، ۴۴)۔ اسی قسم کا واقعہ حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی پیش آیا (دیکھیے کتاب مذکور، باب ۴۴)۔ ایک مرتبہ ایک شخص سے آپؐ نے ایک اونٹ لیا جو بکر یعنی چھوٹی عمر کا تھا۔ بعد میں اونٹ آ گئے۔ تو آپؐ نے اپنے خادم کو اس اونٹ کی واپسی کا حکم دیا۔ خادم نے آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان اونٹوں میں چھوٹی عمر کا (بکر) کوئی اونٹ نہیں

ہے ، سارے بڑے (یعنی چھ سات سال کے) ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا : وہی دے دو ، کیوں کہ لوگوں میں سب سے اچھا وہی ہے جو دُوسروں کو ادائیگی اچھے طریقے سے کرتا ہو (ابو داؤد ، ۳ : ۶۴۲ ؛ حدیث ۳۳۴۶ ؛ مسلم، حدیث ۱۶۰۰ ؛ الترمذی (البیوع) حدیث ۱۳۱۸)۔ ایک مرتبہ آپؐ کے ایک پرانے شریک کار حضرت سائبؓ مجلس میں آئے ۔ لوگ ان کی تعریفیں کرنے لگے ۔ آپؐ نے فرمایا : میں انھیں بخوبی جانتا ہوں یہ میرے شریک کار رہ چکے ہیں ؛ انھوں نے کہا : کنتَ لا تُدارِی و لاتُمارِی (ابن ماجہ، (تجارات) حدیث ۲۲۸۷) یعنی آپؐ کسی کو شک و شبہے کا کوئی موقع نہ دیتے تھے (بلکہ معاملہ صاف رکھتے تھے) ۔ اسی خوش معاملگی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپؐ نے جس سے بھی معاملہ کیا ، اس نے آپؐ کی تعریف کی اور وہ آپؐ کے اخلاق کا گرویدہ ہوگیا.

(۸) پاس وعدہ و امانت : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے وعدے اور امانت کا ہمیشہ خیال رہتا اور کسی نازک سے نازک گھڑی میں بھی اپنی اس ذمہ داری سے خود کو سبکدوش نہ سمجھتے تھے ۔ حضرت عبداللہ بن الحمساء زمانۂ ما قبل از بعثت کا واقعہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے معاملہ کیا ، مگر میری طرف سے کچھ بقایا رہ گیا ۔ میں نے کہا کہ میں ابھی گھر سے بقایا رقم لے کر آتا ہوں ، مگر گھر میں آ کر اپنا یہ وعدہ بھول گیا اور تین دن کے بعد مجھے اپنا وعدہ یاد آیا تو اس جگہ پہنچا جہاں آپؐ سے وعدہ کیا تھا ۔ میں جب وہاں پہنچا تو آپؐ کو اپنا منتظر پایا ۔ آپؐ نے مجھے دیکھا تو فرمایا : اے نوجوان ! تو نے مجھے بڑی مشقت میں ڈالا ہے ، میں تین دن سے تیرا منتظر ہوں (ابو داؤد ، ۵ : ۲۶۸ ، حدیث ۴۹۹۵) ۔ قبل از بعثت کے دور میں خاندان بنو ہاشم اور بعض دیگر نیک دل لوگوں کے درمیان معاہدہ حلف الفضول [رک بآں] طے پایا ، آپؐ کو اس معاہدے کی اہمیت کا جس طرح احساس تھا اس کا اندازہ ابن سعد (الطبقات ۱: ۱۲۹، مطبوعۂ بیروت) کی اس صراحت سے ہوتا ہے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اس سے کنارہ کش رہنے کے لیے کوئی اعلیٰ نسل کے سو اونٹ بھی دے تو تب بھی اسے قبول نہ کروں اور اگر اب بھی مجھے کوئی اس معاہدے کا نام لے کر پکارے تو میں ضرور اس کی آواز پر لبّیک کہوں.

اہل مکہ آپؐ کی صداقت و امانت پر اس درجہ یقین رکھتے تھے کہ انھوں نے نہ صرف آپؐ کو الصادق اور الامین کے القاب دے رکھے تھے ، بلکہ دشمنی کے سخت ترین ایام میں بھی وہ اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھ جاتے تھے ؛ چنانچہ جس وقت آپؐ نے ہجرت کی، اس وقت مکے کے بہت سے گھرانوں کی امانتیں آپؐ کے گھر میں رکھی ہوئی تھیں جن کا لحاظ کرکے آپؐ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کو پیچھے چھوڑا ، جنھوں نے تین دن رہ کر یہ امانتیں لوگوں کو واپس کیں [رک بہ علیؓ ؛ ہجرت].

(۹) صحابہؓ کرام کی حوصلہ افزائی : ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ آپؐ کے اخلاق عالیہ کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ گو آپؐ کو منہ پر تعریف پسند نہ تھی کہ اس سے دل میں بڑائی کے احساس پیدا ہونے کا امکان ہوسکتا ہے تاہم آپؐ حسب موقع اپنے متوسلین کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے؛ چنانچہ آپؐ نے اپنے دس ساتھیوں کو نام بنام جنت کی خوش خبری سنائی [رک بہ عشرہ مبشرہ]۔ غزوۂ موتہ [رک بآں] سے جب لشکر واپس آیا تو لوگوں نے اسے میدان جنگ سے فرار کا طعنہ دیا ، مگر آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو کرّار، یعنی لوٹ کر حملہ کرنے والے ، ہیں ۔ حضرت طلحہؓ کے گھوڑے پر ایک مرتبہ سواری کی تو فرمایا : ہم نے اسے سمندر پایا ہے اور فی الواقع وہ سمندر ہے (البخاری (الجہاد)؛ مسلم (الفضائل)، ۴ : ۱۸۰۲، حدیث ۲۳۰؛ الترمذی،

(الجہاد) ؛ ۴ : ۱۹۹، حدیث ۱۶۸۴، ۱۶۸۶، وغیرہ) حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا : تم میری امت میں سے سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگے (مشکوٰۃ، ۳ : ۲۲۳ ، حدیث ۶۲۴) اورگوکہ تمہاری چادر (نادانستہ طور پر) ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتی ہے ، مگر تم ان (اہل کبر) میں سے نہیں ہو (البخاری ، ۴ : ۱۲۷) - حضرت عمرؓ کو فرمایا : بخدا ، شیطان تمہیں دیکھ کر اپنا راستہ بدل دیتا ہے (مسلم، ۴ : ۱۸۶۳، حدیث ۲۳۹۶) - حضرت زبیرؓ کی بابت فرمایا: ہر نبی کا کوئی خاص حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیرؓ ہے (کتاب مذکور ، ۴ : ۱۸۷۹ ، حدیث ۲۴۱۵) - حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو "امین ہذہ الامۃ" قرار دیا (کتاب مذکور ، ۴ : ۱۸۸۱ ، حدیث ۲۴۱۹) - حضرت بلالؓ کو فرمایا : تیرے جوتوں کی آہٹ میں نے جنت میں اپنے آگے سنی ہے (کتاب مذکور، ۴ : ۱۹۱۲، حدیث ۲۴۵۸) - حضرت عبداللہ بن سلام کی بابت فرمایا کہ وہ دنیا میں چلتے پھرتے جنتی ہیں (البخاری ، مطبوعہ لائیڈن ، ۴ : ۱۲۷) - ایک انصاری کے گھر میں تشریف لے گئے اور ان کے لیے میں دعاے خیر فرمائی (کتاب مذکور ، ص ۳۱).

(۱۰) عدم تجسس : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دوسروں کے خفیہ حالات کا تجسس سخت ناپسند تھا، گویا قرآنی حکم: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹ [الحجرات] : ۱۲)، یعنی اے اہل ایمان ! بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ نہ لگاؤ ، پر آپؐ کا شدت سے عمل تھا - ایک موقع پر آپؐ نے تجسس کی مذمت کرتے ہوے فرمایا : مسلمانوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ نہ لگاؤ ، کیونکہ جو دوسروں کے حالات کی ٹوہ لگاتا ہے ، اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو ظاہر کر دیتا ہے اور جس کے عیوب کو خدا تعالیٰ ظاہر کرنے پر آمادہ ہوجائے اسے دوسروں کے سامنے رسوا کر دیتا ہے (ابو داؤد : السنن، ۵:۱۹۴، حدیث ۴۸۸۰)- ان امرا کی آپؐ نے یوں مذمت کی کہ جو لوگوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ لگاتے ہیں ، کہ جب کوئی امیر لوگوں کی خفیہ باتوں کی ٹوہ میں لگا رہے تو وہ لوگوں (معاشرے) کو فاسد کر دیتا ہے (البخاری (النکاح) ؛ مسلم (البر) ؛ الترمذی ، ۴ : ۳۵۶ حدیث ۱۹۸۸) ؛ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص دروازے کی درزوں سے اندر جھانکنے لگا ، آپؐ ایک لمبا تیر لیے ہوے تیزی سے اس کی آنکھوں کی طرف مارنے کے لیے بڑھے (ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۶، حدث ۵۱۷۱) - الترمذی (۵ : ۶۴ ، حدیث ۲۷۰۹) کے مطابق آپؐ نے اس موقع پر فرمایا: اگر مجھے تیرے دیکھنے کا علم ہوتا تو تیری آنکھیں پھوڑ دیتا ؛ تیرا ناس ہو، اجازت مانگنے کا حکم آنکھوں کے لیے ہی تو ہے (نیز مسلم ، الادب ، حدیث ۲۱۵۷) - اسی بنا پر آپؐ کا اپنا بھی یہی معمول تھا اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیتے تھے کہ اجازت طلب کرنے کے لیے دروازے کے بالکل سامنے کھڑے ہونے کے بجاے ذرا ہٹ کر کھڑے ہونا چاہیے (ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۷ ، حدیث ۵۱۷۴)،

(۱۱) چشم پوشی : دوسروں کے خفیہ حالات کا تجسس کرنے کے بجاے آپؐ ہمیشہ دوسروں کے عیوب سے چشم پوشی فرماتے اور اسی کا دوسروں کو حکم دیتے تھے - آپؐ کا فرمان تھا : جو کوئی کسی مسلمان کے عیب کو دیکھ کر چشم پوشی کرتا ہے وہ گویا کسی زندہ دفن کی جانی والی بچی کو زندگی بخشتا ہے (ابو داؤد ، ۵ : ۲۰۰ ، حدیث ۴۸۹۱) ؛ مزید فرمایا : جو کسی مسلمان کے عیب سے چشم پوشی کرے گا خدا تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا (مسلم ، البر ، حدیث ۲۵۸۰؛ الترمذی، ۴ :

۳۵، حدیث ۱۴۲۷)۔

آپؐ اگر خود بھی کسی کا عیب دیکھتے تو حتی الوسع چشم پوشی فرماتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص حاضر ہوا اور بدکاری کا اعتراف کرتے ہوئے حد جاری کرنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے اس سے اعراض فرمایا۔ اس نے مکرر درخواست کی؛ آپؐ نے مکرر اعراض کیا، تا آنکہ اس نے چار مرتبہ اقرار کر لیا، پھر آپؐ نے اس سے پوچھا: کیا تجھے جنون ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تب آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم جاری فرمایا (مسلم، ۳: ۱۳۱۸، حدیث ۱۶۹۱ ببعد)؛ اسی طرح ایک عورت (الغامدیہ) کے بارے میں جب تک آپؐ نے مکرر تحقیق نہ کر لی، حد کا حکم جاری نہ کیا (کتاب مذکور، ۳: ۱۳۲۲، حدیث ۱۶۹۵)۔ تاہم جب جرم اچھی طرح ثابت ہو جاتا تو پھر آپؐ سزا دینے میں کوتاہی نہ فرماتے تھے تاکہ دوسروں کے لیے اسے عبرت بنایا جائے (حوالۂ مذکور)۔ مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں خواہ مخواہ ایک دوسرے سے متعلق بدگمانیاں نہ پنپنے پائیں؛ ہاں اگر صریحاً کوئی جرم ثابت ہو جائے تو سزا دیکر اسے دوسروں کے لیے عبرت کا ذریعہ بنا دیا جائے۔

(۱۲) ایذا رسانی سے گریز: آپؐ ہمیشہ اس بات کا شدت سے اہتمام فرماتے تھے کہ آپؐ کی کسی بات یا کسی طرز عمل کی وجہ سے کسی کو دلی تکلیف نہ پہنچے؛ آپؐ کا ارشاد تھا: سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے اس کے مسلمان بھائی محفوظ رہیں (البخاری)۔ اسی بنا پر آپؐ نے اگر کسی شخص میں موجود برائی کا ذکر کرنا ہوتا تو اس کا نام کبھی نہ لیتے، البتہ یہ فرماتے: لوگوں کا کیا حال ہے؟ کہ وہ یہ کہتے یا کرتے ہیں (ابو داؤد، ۵: ۱۴۳، حدیث ۴۷۸۸)۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے برا شخص وہ ہے کہ جس کی برائی کے ڈر سے لوگ اسے چھوڑ دیں (البخاری (الادب)؛ مسلم (البر) ۴: ۲۰۰۲، حدیث ۲۵۹۱؛ مالک: موطأ، (حسن الخلق)؛ احمد بن حنبل، مسند)۔ آپؐ اپنے متوسلین کی بابت بھی یہ التزام فرماتے تھے کہ ان کی زبان اور کلام سے بھی کسی کا دل مجروح نہ ہو۔ ایک موقع پر امّ المؤمنین حضرت زینبؓ نے بتقضائے بشریت ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کو یہودیہ کہہ دیا۔ آپؐ کو اس سے سخت صدمہ ہوا اور کئی دن تک حضرت زینبؓ سے کلام نہ فرمایا (ابو داؤد، ۵: ۹، حدیث ۴۶۰۲)۔ ایک مجلس میں ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ان کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ خاموش تھے، لیکن جب وہ حد سے بڑھا تو حضرت ابوبکرؓ نے اسے جواب دیا۔ یہ دیکھ کر آپؐ مجلس سے اٹھ کر چل دیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: پہلے تمہاری طرف سے ایک فرشتہ مأمور تھا، مگر جب تم نے جواب دیا تو وہ چلا گیا اور اس کی جگہ شیطان نے لے لی اور میں کسی ایسی مجلس میں نہیں ٹھیر سکتا جہاں شیطان ہو (ابو داؤد، ۵: ۲۰۴، حدیث ۴۸۹۶)۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ذرؓ نے ایک صحابیؓ کو اس کی ماں کی غلامی کا طعنہ دیا۔ آپؐ کو پتا چلا تو فرمایا: اے ابو ذر! ابھی تم میں جاہلی عادات باقی ہیں اور پھر اس سے معاملہ صاف کرنے کا حکم دیا (ابو داؤد، ۵: ۳۵۹، حدیث ۱۵۵۷)۔ لوگوں کی دل آزاری سے آپؐ کتنا گریز فرماتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کا یہ ارشاد تھا کہ اگر تین آدمی کسی مجلس میں ہوں تو دو الگ ہو کر باہم سرگوشی نہ کریں اس سے تیسرے آدمی کا دل دکھے گا (مسلم (تحریم مناجات)، ۴: ۱۷۱۸، حدیث ۲۱۸۴؛ ابن ماجہ (الادب) ۳۷۷۵؛ ابو داؤد، ۵: ۱۷۸، حدیث ۴۸۵۱)۔ اسی طرح آپؐ دوگفتگو کرنے والے افراد

کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر بیٹھنے سے منع فرماتے تھے (الترمذی، ۵: ۸۹، حدیث ۳۷۵۲)؛ کسی مسلمان کو گالی دینا آپؐ کے نزدیک فِسق (بد عملی) (کتاب مذکور، ۵: ۲۱، حدیث ۲۶۳۴، ۲۶۳۵) اور اسے کافر کہنا کفر کے مترادف ہے (کتاب مذکور، ۵: ۲۲، حدیث ۲۶۳۶ ببعد).

آپؐ غیبت کرنے کی بھی اسی بنا پر سخت مذمّت فرماتے تھے کہ اس سے دوسروں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ فرمایا: جنت میں چغلخور کبھی داخل نہیں ہو سکے گا (البخاری (الادب)؛ مسلم (الایمان) ۱۵۰؛ الترمذی (البر))، ۴: ۳۷۵، حدیث ۲۰۲۶) اور آپؐ کے نزدیک غیبت کا مفہوم یہ تھا ذکرکُ اخاکَ بما یکرہ (الترمذی، ۴: ۳۲۹، حدیث ۱۹۳۴) یعنی کسی کا اس انداز سے پس پشت ذکر کرنا کہ اگر وہ سنے تو ناپسند کرے۔ اس کے برعکس ہر کام میں نرمی اور ملائمت، خوش گوئی اور مسلمان بھائی سے نیکی کے کاموں میں تعاون آپؐ کا معمول تھا (البخاری، ۴: ۱۱۹).

۱۔ مختلف طبقوں سے آپؐ کا حسن سلوک: اولاد سے محبت و شفقت: یوں تو آپؐ کے دل میں تمام بنی نوع انسانی کے لیے محبت و شفقت کے جذبات پائے جاتے تھے، مگر چونکہ فطری طور پر انسان اپنے اہل و عیال اور قبیلہ کی نسبت سے پہنچانا جاتا ہے، اسی بنا پر آپؐ نے اپنی اولاد سے محبت و شفقت کا ایک اعلیٰ نمونہ قائم کیا؛ اہل عرب اپنے بچوں کو چومنا، ان سے لاڈ پیار کرنا، اپنی سرداری کے منافی سمجھتے تھے، مگر آپؐ نے ہمیشہ اس رسم بد کی مذمت فرمائی۔ آپؐ اپنے بچوں کو گود میں اٹھا لیتے، بعض اوقات کندھے پر بٹھا لیتے؛ سواری پر ہوتے تو اپنے آگے پیچھے انھیں سوار کر لیتے؛ ان کی پیشانی کو چومتے اور انھیں خیر و برکت کی دعا دیتے (البخاری، ۲: ۴۴۳، باب ۲۲)؛ آپؐ انھیں جنت کے گلدستے قرار دیتے، انھیں سونگھتے اور اپنے سینے سے چمٹا لیتے۔ ایک سردار (اقرعؓ بن حابس) نے آپؐ کو بچوں سے پیار کرتے دیکھا تو کہا: میرے دس بیٹے ہیں، میں نے آج تک ان سے پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے یہ سنا تو فرمایا: جو کسی پر رحم نہیں کرتا، اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (مسلم، ۴: ۸۰۸ حدیث ۲۳۱۸؛ الترمذی، (البر)، ۴: ۳۱۸، حدیث ۱۹۱۱)، یا اگر خدا نے ہی تیرے دل سے رحم کا جذبہ نکال دیا ہے تو میں کیا کروں (البخاری، ۴: ۱۱۴، الادب، باب ۱۸)۔ آخری عمر میں جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک بیٹا عطا کیا تو آپؐ کو از حد مسرت ہوئی۔ آپؐ نے اس کا نام ابراہیمؑ رکھا۔ ان کی دودھ پلائی ایک لوہار کی بیوی امّ سیف (امّ بردہ بنت المنذر، ابن سعد: الطبقات، ۱۳۱ تا ۱۳۷) تھیں۔ آپؐ وقتاً فوقتاً اپنے لخت جگر کو دیکھنے کے لیے ان کے ہاں تشریف لے جاتے اور دھویں سے معمور مکان میں بیٹھ کر اپنے بیٹے کو پیار کرتے، جب ان کا وصال ہوا تو آپؐ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کسی نے پوچھا: آپؐ رو رہے ہیں، حالانکہ آپؐ تو رونے سے منع کیا کرتے ہیں۔ فرمایا: یہ تو فرط محبت (رحم) ہے، جبکہ میں نوحہ کرنے (النیاحۃ) سے منع کرتا ہوں۔ پھر دفن کرتے وقت فرمایا: دل غمگیں ہے اور آنکھیں اشکبار، مگر ہم وہی کہتے ہیں جو خدا کو پسند ہے۔ پھر فرمایا: اے ابراہیمؑ ہم تیرے جدا ہونے پر افسردہ ہیں۔ (ابن سعد، ۱: ۱۳۸ تا ۱۳۹).

آپؐ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی؛ البتہ چار صاحبزادیاں زندہ رہیں اور شادی شدہ ہونے کے بعد واصل بالحق ہوئیں۔ آپؐ نے ان سے اور ان کی اولاد سے جو محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت زینبؓ [رک بآں] کی صاحبزادی اُمامہؓ سے آپؐ بے حد شفقت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ اس حال میں نماز پڑھائی کہ حضرت امامہؓ آپؐ کے

کندھے پر سوار تھیں ، جب رکوع کرتے تو نیچے اتار دیتے ، جب قیام فرماتے تو دوبارہ اٹھا لیتے (البخاری ، ۱ : ۱۴۰، الصلوٰۃ ، باب ۱۰۶) ۔ [حضرت فاطمہؓ کے سوا سب صاحبزادیاں آپؐ کی زندگی میں اور وفد نجران کی آمد سے پہلے وفات پا چکی تھیں] .

آپؐ کی چھوٹی اور سب سے آخر میں وفات پانے والی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے آپؐ کو بے حد محبت تھی ۔ آپؐ انھیں اپنے دل کا ٹکڑا قرار دیتے (البخاری ، مناقب ، ۲ : ۵۲۶ ؛ الترمذی ، ۵ : ۶۹۹ ، حدیث ۳۸۶۹) ۔ آپؐ سفر کرنے سے پہلے سب سے آخر میں اور واپسی پر سب سے پہلے انھیں سے ملتے (احمد بن حنبل : مسند، ۵ : ۲۷۵، حدیث ثوبان) ۔ وہ جب آپؐ کو ملنے تشریف لاتیں تو اٹھ کر ان کا استقبال فرماتے اور شفقت سے ان کا ہاتھ چومتے اور انھیں اپنی جگہ بٹھاتے (الترمذی ، ۵ : ۷۰۰ ، حدیث ۳۸۷۲) ؛ ان کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حسینؓ سے بھی آپؐ بے حد محبت آمیز برتاؤ فرماتے ؛ انھیں گود میں اٹھاتے ، چومتے اور دعا فرماتے : اے اللہ جس طرح میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت رکھ (البخاری ، ۲ : ۴۴۳) ۔ ایک مرتبہ عین خطبۂ جمعہ کے دوران میں یہ دونوں صاحبزادے گرتے پڑتے مسجد میں جا پہنچے ۔ آپؐ نے انھیں دیکھا تو سلسلۂ کلام منقطع کرکے نیچے اترے اور انھیں اپنی گود میں اٹھا لیا اور فرمایا : اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے کہ تمھاری اولاد اور تمھارے مال تمھارے لیے آزمائش ہیں (۶۴ [التغابن] : ۱۵) ، میں نے انھیں آتے دیکھا ، تو ضبط نہ کر سکا (ابو داؤد ، ۱ : ۶۹۳ تا ۶۹۴ ، حدیث ۱۱۰۹ ؛ الترمذی، ۵ : ۶۵۸ ، حدیث ۳۷۷۴) ۔ آپؐ انھیں چادر میں لپیٹ لیتے اور اٹھائے رکھتے (الترمذی ، ۴ : ۶۵۲ ، حدیث ۳۷۶۹) ۔ ایک مرتبہ آپؐ انھیں اسی طرح اٹھا کر نکلے تو کسی نے کہا : اے لڑکے ! تم کتنے خوش قسمت ہو کہ تمھیں کتنی عمدہ سواری ملی ہے ۔ آپؐ نے فرمایا: اور سوار بھی تو کتنا اچھا ہے (الترمذی ، ۵ : ۶۶ ، حدیث ۳۷۸۴) ۔ آپؐ ایک ران پر حضرت حسنؓ کو اور دوسری پر حضرت امامہؓ کو بٹھا لیتے اور پھر انھیں ملاتے اور فرماتے : اے اللہ جس طرح میں ان پر شفقت کرتا ہوں تو بھی شفقت فرما (البخاری ، ۴ : ۱۱۵، ببعد).

۲- رشتہ داروں سے مروّت و احسان : گو آپؐ کی نظروں میں خاندانی اور قبائلی حد بندیاں بے معنی تھیں، مگر پھر بھی آپؐ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ خاندان اس بڑے معاشرے کا ایک حصّہ ہیں جو پوری بنی نوع انسان سے عبارت ہے ، اس بنا پر آپؐ نے ان تعلقات کی خوش ادائی ، یعنی صلہ رحمی پر زور دیا اور آپؐ خود بھی ان تعلقات کا حق ادا فرماتے رہے .

خاندان ابو طالب سے جو محبت و شفقت تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس خاندان کے ہر فرد سے آپؐ نے آخر تک مروّت واحسان کا سلوک جاری رکھا ۔ حضرت علیؓ کی والدہ محترمہ حضرت فاطمہؓ بنت اسد، جو اسلام لے آئی تھیں ، جب فوت ہوئیں تو آپؐ نے تبرّک کے لیے اپنی قمیض اتار کر پہنائی اور قبر میں کچھ دیر تک لیٹے رہے [رک بہ علیؓ]؛ حضرت علیؓ کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنایا ہوا تھا؛ حضرت ام ہانی [رک بآں] اور ان کی والدہ (ابن سعد ، ۸ : ۲۲۲) کے گھر میں آپؐ اکثر تشریف لے جاتے اور وہیں استراحت فرماتے ۔ معراج [رک بآں] کے موقع پر بھی ایک روایت کے مطابق ، آپؐ انھیں کے گھر میں استراحت فرما تھے۔ ایک مرتبہ جب حضرت ام ہانیؓ آپؐ کے ہاں آئیں ، تو آپؐ نے انھیں مرحبا کہا (البخاری ، ۴ : ۱۵۴) ۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کئی برسوں کے بعد حبشہ [رک بآں] سے لوٹے ۔ اس وقت آپؐ خیبر کی مہم سر کر رہے تھے ۔ آپؐ نے اس موقع پر خوشی کا یوں اظہار فرمایا : میں نہیں جانتا فتح خیبر کی خوشی زیادہ ہے یا جعفرؓ کے آنے

کی (ابن سعد)؛ ایک مرتبہ حضرت جعفرؓ آئے تو آپؐ نے اٹھ کر ان کو گلے لگایا اور ان کی پیشانی کو چوما (ابو داؤد، ۵ : ۳۹۲، حدیث ۵۲۲۰)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ (آپؐ کے چچا زاد بھائی) کو آپؐ سینے سے لگا لیتے اور فرماتے: اے خدا! اسے علم و حکمت عطا فرما (البخاری، ۲ : ۴۴۵، المناقب، باب ۲۴)؛ اپنے رضاعی ماں باپ کو ہمیشہ اپنے اصلی والدین کی نظر سے دیکھتے؛ فتح مکہ کے بعد جب آپؐ مقام جعرانہ میں قیام فرما تھے تو آپؐ کے رضاعی والد تشریف لے آئے، آپؐ نے اپنی چادر بچھا دی اور اس پر باعزت طریقے سے بٹھایا۔ وہیں ان کی رضاعی ماں (یا کوئی اور رضاعی رشتہ دار خاتون) آئیں۔ آپؐ نے اسی کپڑے کے دوسرے کونے پر انھیں بٹھایا، پھر آپؐ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن الحارث آئے، آپؐ نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور انھیں اپنی جگہ بٹھایا (ابو داؤد، ۵ : ۳۵۴، حدیث ۴۱۴۵)۔

۳۔ دوست احباب سے سلوک: آپؐ اپنے دوستوں [صحابہؓ؛ رک بآں] سے بہت مہربانی اور لطف و محبت سے پیش آتے تھے۔ ان سے جب ملتے تو مصافحہ کرتے اور بعض اوقات محبت سے انھیں اپنے سینے سے لگا لیتے (ابو داؤد، ۵ : ۳۸۰، حدیث ۵۲۱۴)؛ انھیں دیکھ کر ہمیشہ آپؐ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی (مسلم، ۴ : ۱۹۱۵، حدیث ۲۴۷۵، مناقب جریر بن عبداللہ)؛ آپؐ کا فرمان تھا کہ آدمی کا کسی کو خندہ پیشانی (وجہ طلق) سے ملنا بھی نیکی ہے (الترمذی، ۴ : ۳۴۷، حدیث ۱۹۷۰)۔ اگر کوئی دوست ہدیہ دیتا تو اسے قبول فرماتے اور اس کا حسب توفیق بدلہ بھی دیتے: (ابو داؤود، ۳ : ۸۰۶، حدیث ۳۵۳۶؛ البخاری؛ ۳ : ۲۰۶؛ الترمذی، ۴ : ۳۳۸، حدیث ۹۹۵۳)۔ آپؐ فرماتے: باہم ہدیہ لینے دینے سے دل کی کدورت دور ہوتی ہے اور یہ کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز، خواہ بکری کے پایے ہی ہوں، ہدیہ دینے میں حقیر نہیں سمجھنا چاہیے (الترمذی، ۴ تا ۴۴، حدیث ۲۱۳۰)۔

بعض اوقات اپنے دوستوں سے آپؐ بے تکلفی فرماتے، ان کی آنکھوں پر پیچھے سے جا کر ہاتھ رکھ لیتے (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۴۴۴)؛ اپنے ایک دیہاتی دوست حضرت زاہرؓ کو آپؐ نے ایک مرتبہ بازار میں دیکھا تو پیچھے سے جا کر ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمانے لگے اس عبد (بندے) کو کون لے گا؟ حضرت زاہرؓ نے کہا: بیچوگے تو کھوٹا پاؤگے، فرمایا: تم خدا کے ہاں تو کھوٹے نہیں ہو (مشکوٰۃ، ۲ : ۵۹۱، حدیث ۴۸۸۹، باب المزا)۔

اپنے صحابہ کو آپؐ ہمشہ اپنے مشوروں میں شریک رکھتے، حضرت عائشہؓ کے بقول: آپؐ سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا (ابن الجوزی: الوفا، ۲ : ۲۶۷)۔ مجلس میں ان کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے کہ باہر سے آنے والے کو کوئی امتیاز محسوس نہ ہوتا، جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے؛ مجلس کے ہر شریک پر اپنی پوری توجہ دیتے کہ کوئی شخص خود سے زیادہ کسی کو آپؐ کے ہاں مقرب نہ سمجھتا (کتاب مذکور، ۴۶۷)۔ کوئی مشورہ طلب کرتا تو اسے صحیح مشورہ دیتے؛ کوئی مدد مانگتا تو اس کی حسب توفیق مدد فرماتے؛ کوئی سرگوشی کرنا چاہتا تو اس کی طرف کان جھکا دیتے اور اس وقت تک اپنا سر اس سے نہ ہٹاتے جب تک وہ اپنی بات مکمل کرکے اپنا سر پیچھے نہ ہٹا لیتا (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۶ تا ۱۴۷، حدیث ۴۷۹۴)۔ مصافحہ کرتے وقت اپنا پورا پنجہ استعمال فرماتے اور تاوقتیکہ دوسرا شخص خود اپنا پنجہ نہ چھڑا لیتا آپؐ اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتے (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۶، حدیث ۴۷۹۴)۔

اپنے تمام دوستوں سے ایسا محبت بھرا سلوک کرتے کہ ان کو یہ گمان گزرتا کہ وہی آپؐ کے

نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہیں (البخاری، ۲:۴۱۹)؛ اگر کوئی غلطی پر ہوتا تو بڑے پیار سے اسے سمجھا دیتے ۔ ایک مرتبہ آپؐ ایک مجلس میں تشریف لائے جہاں ایک شخص ادھر ادھر کی باتیں کرکے دوسروں کو ہنسا رہا تھا ۔ آپؐ نے اس کی کمر پر لکڑی چبو دی ، وہ کہنے لگا آپؐ مجھے اس کا بدلہ دیجیے ، آپؐ نے اپنی قمیص اٹھا دی اس نے اٹھ کر آپؐ کی کمر کو بوسہ دیا اور کہا کہ میں تو صرف یہ چاہتا تھا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۹۴ ، حدیث ۵۲۲۴).

کوئی جان نثاری کرتا تو اس کا احسان یاد رکھتے اور اس کے حق میں دعاے خیر فرماتے۔ حضرت سعدؓ کو غزوۂ احد میں جان نثاری کرنے پر ارم فداک ابی و امّی، یعنی تیراندازی کرو ، تم پر میرا باپ اور میری ماں قربان ہوں کہا (البخاری ، ۴۷ : ۱۵۶) ؛ حضرت قتادہؓ نے ایک رات پہرہ دیا ، صبح ہوئی تو فرمایا : جس طرح تم نے اپنے نبیؐ کی حفاظت کی ہے ، خدا تمہاری حفاظت فرمائے (مسلم ، ۱:۴۷۲، حدیث ۶۸۱) ؛ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے متعلق کوئی نا زیبا بات سننے میں آئی تو فرمایا: اللہ نے مجھے تمہاری طرف مبعوث کیا تو تم نے تکذیب کی، مگر ابوبکرؓ نے تصدیق کی اور اپنے جان و مال سے میری غمخواری کی۔ بس کیا تم میرے لیے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑو گے؟ (البخاری، ۲ : ۴۱۹ ، مناقب)۔ کوئی دوست بیمار ہوتا تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتے؛ کوئی مانے جلنے والا فوت ہو جاتا ہے تو اس کے جنازے میں شریک ہوتے اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے [رک به نجاشی] یا قبر پر کھڑے ہو کر دعاے مغفرت کر آتے .

آپؐ اپنے ملنے جلنے والوں کو وفات یا شہید ہو جانے کے بعد بھی یاد رکھتے ۔ گاہے بگاہے قبرستان جاتے اور ان کے حق میں دعاے خیر فرماتے ۔ عمومی اجتماعات میں بھی ان کا ذکر آتا تو اشکبار ہو جاتے اور ان کی وفاداری اور جذبہ و خلوص کی تعریف فرماتے ؛ اگر کوئی دوست تنگدست ہوتا تو اس کی مدد فرماتے ، اگر کوئی اسے پسند نہ کرتا تو اس سے کوئی چیز خرید کر اسے یا اس کے کسی عزیز کو لوٹا دیتے (البخاری ، البیوع ، باب ۳۳ ، ۳۴، ۲ : ۱۵ تا ۱۶) .

۴- غریبوں اور مسکینوں سے ہمدردی: آپؐ کو غربا اور مساکین کے ساتھ بہت ہمدردی تھی ۔ حضرت خدیجہؓ (البخاری ۱ : ۵ ببعد) کے بقول آپؐ غریبوں کے بھی خواہ اور ان کو کما کر دینے والے تھے۔ آپؐ کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو بے حال ہو جاتے؛ جب تک اس کا بندوبست نہ ہوتا آپؐ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھنے میں نہ آتی (مسلم، الصدقات، ۲ : ۴۰۵ تا ۷۰۵، حدیث ۱۰۱۷) ؛ اگر کوئی شخص غربا پر اپنی تعلّی ظاہر کرتا تو آپؐ فرماتے : تمھیں جو کچھ بھی میسر ہے انہیں محنت کشوں کی وجہ سے ہے (ابو داؤد ، ۳ : ۷۳ ، حدیث ۲۵۹۴ ؛ احمد بن حنبل : مسند ، ۵ : ۱۹۸ ؛ الترمذی ، ۲ : ۱۷) ۔ کہیں سے لونڈی غلام آتے تو آپؐ اپنے رشتہ داروں حتّٰی کہ اپنے جگر گوشہ بتول جنت سے بھی زیادہ غریبوں کا حق سمجھتے (ابو داؤد : السنن ، ۵ : ۳۱۰ حدیث ۵۰۶۶)۔ آپؐ کو یہ منظور تھا کہ آپؐ کی بیٹی چکی پیسے ، اپنی کمر پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے ، مگر یہ منظور نہ تھا کہ غریبوں (یتامٰی بدر) سے پہلے ان کو آنے والے مال سے حصہ ملے (ابن الاثیر : اسد الغابة، ترجمہ اُمّ حکیم)۔ آپؐ ظاہر سے زیادہ باطن پر زور دیتے اور فرماتے کہ اگر تمام روے زمین بد باطن امیروں سے بھر جائے تب بھی وہ ایک پاک باطن غریب کے برابر نہیں ہو سکتے (البخاری ؛ مسلم ؛ مشکوٰة ، ۲ : ۶۶۴ ، حدیث ۵۴۳۶) ۔ اگر کوئی کسی غریب کو برا بھلا کہتا تو آپؐ سخت ناراض ہوتے اور اسے جاہلیت قرار دیتے (ابو داؤد، ۵ : ۳۵۹، حدیث ۱۵۵۷)۔

اگر حضرت ابوبکرؓ جیسے با اثر افراد بھی حضرت بلالؓ اور حضرت صہیبؓ جیسے غربا کو آزردہ کرتے تو آپؐ انھیں ان سے معافی مانگنے کی تلقین فرماتے اور ان کی ناراضگی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر فرماتے (مسلم، ۴ : ۱۹۴۷، حدیث ۲۵۰۴)۔ اگر کوئی غریب فوت ہو جاتا اور آپؐ کی اطلاع کے بغیر اسے دفن کر دیا جاتا تو معلوم ہونے پر خفا ہوتے اور قبر پر کھڑے ہو کر نماز جنازہ ادا فرماتے (النسائی : السنن، کتاب الجنائز؛ البخاری، ۱ : ۳۳۵)۔

خود آپؐ کا غریبوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا اس کا اس ارشاد سے اندازہ ہو سکتا ہے : اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرما (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۶۵، حدیث ۵۲۴۴)؛ آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا : اے عائشہؓ ! کسی مسکین کو اپنے دروازے سے خالی ہاتھ نہ پھیر، خواہ چھوہارے کا ٹکڑا ہی دو؛ کبھی فرماتے کہ تم ظاہر کی طرف نہ دیکھا کرو؛ بعض اوقات ایک پراگندہ حال شخص خدا کے ہاں یہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اگر وہ کوئی قسم کھا لے تو خدا اسے پورا کر دے (مسلم، ۴ : ۲۰۲۴، حدیث ۲۶۲۲)۔ کبھی فرماتے جنت میں داخل ہونے والے اکثر فقرا ہی ہوں گے (مسلم، ۴ : ۲۰۹۶)؛ آپؐ غریبوں کی ہمدردی کا یوں سبق دیتے: اے عائشہؓ! غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو نزدیک کرو خدا بھی نزدیک ہوگا (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۶۵، حدیث ۵۲۴۴)۔ آپؐ مسجد نبوی میں تشریف لاتے تو نہایت خستہ حال غربا کے ساتھ جسم سے جسم ملا کر بیٹھتے اور فرماتے : تم کو بشارت ہو، تم دولتمندوں سے ۴۰ برس پہلے جنت میں داخل ہوگے۔ یہ ارشاد سن کر ان کے چہرے خوشی سے جگمگا اٹھتے (مشکوٰۃ، ۲ : ۶۶۸، حدیث ۵۲۵۸)۔ کبھی فرماتے: خدا نے مجھے تم میں بیٹھنے کا حکم دیا ہے (ابن الجوزی، ۲ : ۴۳۸)۔

آپؐ کی نظروں میں غریب اور امیر کی تفریق بے معنی تھی؛ اصل قدر و قیمت کی چیز انسان کا جذبہ اور اس کا خلوص تھا؛ چنانچہ غربا کے خلوص کی اس حد تک حوصلہ افزائی فرماتے کہ بعض اوقات ان کے معمولی صدقوں کو امیروں کے بڑے بڑے عطیوں پر اس خیال سے پھیلا دیتے کہ اس کی برکت سے وہ بڑے عطیات بھی قبول کیے جائیں۔

بایں ہمہ آپؐ غریبوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے اور دوسروں کے مال پر نظر رکھنے کے بجائے جدوجہد اور محنت کی تلقین فرماتے۔ آپؐ کا ارشاد تھا : دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے (مسلم، ۲ : ۷۱۷ ببعد، نیز حدیث ۱۰۳۳ تا ۱۰۳۴)؛ نیز فرمایا : بہترین روزی وہی ہے جو انسان اپنی محنت سے کمائے اور اللہ کے نبی حضرت داؤدؑ اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ غریبوں کو اشد ضرورت کے سوا مانگنے سے سخت منع فرماتے اور اسے قیامت کے دن کی رسوائی قرار دیتے۔ حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے مجلس میں موجود چند صحابہ کرامؓ سے اس پر بھی بیعت لی کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے (مسلم، ۲ : ۶۲۱، حدیث ۱۰۴۳)۔ آپؐ سوال کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے اور بازار میں فروخت کر کے روزی کمانے کی ترغیب دلاتے (البخاری، ۱ : ۳۷۳ (الزکوٰۃ)، باب ۵۰؛ [نیز رک بہ مسکین، فقیر]۔

۵۔ بیوہ اور یتیموں سے خصوصی شفقت : یتیموں اور بیواؤں سے آپؐ خصوصی شفقت فرماتے اور آپؐ ہمیشہ ان کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے : الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ او کالذی یصوم النھار و یقوم اللیل (الترمذی، ۴ : ۳۳۷، حدیث ۱۹۵۱)، یعنی جو کوئی کسی بیوہ یا مسکین کی بہتری کے لیے کوشاں رہتا ہے، وہ اللہ کے راستے

میں جہاد کرنے والے مجاہد یا دن کو روزہ رکھنے اور رات بھر نوافل پڑھنے والے عابد کی طرح ہے؛ مزید فرمایا : یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں میرے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح ہاتھ کی دو انگلیاں (کتاب مذکور ، ص ۳۲۱ ، حدیث ۱۹۱۸) .

آپؐ نے بیواؤں کے ساتھ جس ہمدردی کا سلوک فرمایا ، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اہل عرب بیواؤں سے نکاح کرنا پسند نہ کرتے تھے اور انہیں معاشی اور سماجی تحفظ سے محروم رکھتے تھے، مگر آپؐ نے نہ صرف اس کی ترغیب دی ، بلکہ خود بھی ، بجز حضرت عائشہ صدیقہؓ کے تمام نکاح بیوہ عورتوں سے کیے اور اس طرح نکاح بیوگان کی [illegible] و عملی ترغیب دے کر تاریخ میں ایک مثال [illegible]

۶- بیماروں کی تیمارداری : آپؐ کو بیماروں کا بڑا خیال رہتا تھا اور اگر کسی دوست یا کسی عزیز کی بیماری کی خبر ملتی تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے (البخاری ، ۴ : ۴۲ (المرضی) ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۱ ببعد ، حدیث ۳۰۹۲ ببعد) اور اس میں اپنے اور بیگانے کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، حتّٰی کہ یہودیوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے (البخاری، ۴ : باب ۴۴ ، عیادۃ المشرک) اور بیماری خواہ تھوڑی ہوتی ، مثلاً آشوب چشم (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۷، حدیث ۳۱۰۲) یا زیادہ ، نیز فاصلہ تھوڑا ہوتا کہ پیدل جانا ممکن ہوتا، یا زیادہ، کہ سواری درکار ہوتی، آپؐ اس اہتمام میں فرق نہ آنے دیتے (البخاری ، ۳ : ۲۲۴ ، تفسیر سورۃ النساء، باب ۴؛ ابو داؤد، ۳ : ۴۷۴، حدیث ۳۰۹۶)- حضرت سعدؓ بیمار ہوے تو علاج اور عیادت کی آسانی کے لیے آپؐ نے مسجد ہی میں ان کا خیمہ لگوا دیا تھا (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۷ ، حدیث ۳۱۰۱)- آپؐ فرمایا کرتے تھے: جس کسی نے اپنے بیمار بھائی کی عیادت کی ، ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارتا ہے کہ تو خوش و خرم زندہ رہے اور خوش و خرم جنت میں جائے (الترمذی ۳۰ : ۳۶۵ ، حدیث ۲۰۰۸) - ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جو کوئی باوضو حالت میں کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرے ، وہ جہنم سے ستر سال دور کر دیا جاتا ہے (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۵ ، حدیث ، ۳۰۹۷) - آپؐ بیماروں کو جا کر تسلی دیتے ، ان کا حوصلہ بڑھاتے اور فرماتے : اے اللہ کے بندو ! اپنی بیماریوں کی دوا کرو ، کیونکہ اللہ تعالی نے ہر بیماری کا علاج مقرر کیا ہے (الترمذی ، ۴ : ۳۸۳ ، حدیث ۲۰۳۸) - آپؐ خود بھی لوگوں کو مختلف سادہ علاج بتلایا کرتے تھے (دیکھیے الترمذی، کتاب الطب ، ص ۳۸۳ تا ۴۱۲) - آپؐ بیماروں سے نفرت کرنے اور ان کو الگ تھلگ رکھنے کے بھی مخالف تھے ؛ چنانچہ بعض اوقات آپؐ بیمار کے ساتھ شریک ہو کر کھانا تناول فرماتے (الترمذی ، ۴ : ۲۶۶ ، حدیث ۱۸۱۷) - تاہم آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو جان بوجھ کر وبائی علاقے میں جانے اور یوں کسی متعدی مرض کا شکار ہونے سے منع فرمایا (ابو داؤد ، ۳ : ۴۷۸ ، حدیث ۳۱۰۳).

آپؐ بیمار کے چہرے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے ! اے اللہ فلاں کو شفا دے (البخاری، ۴ : ۴۴) - آپؐ بیماروں کی تسلی کے لیے فرماتے : لا بأس طہور انشاء اللہ (کتاب مذکور ، ص ۴۵) یعنی کوئی بات نہیں انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے - کبھی ارشاد ہوتا : جب کسی مسلمان کو کوئی بیماری یا تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں ، جس طرح سردی میں درختوں کے پتے (حوالۂ مذکور) - آپؐ کا ارشاد تھا کہ کسی مریض کی موت کا وقت نہ آیا ہو تو اس کے پاس یہ دعا سات مرتبہ پڑھنے سے اسے شفا ہو جاتی ہے - اسل اللہ رب العرش العظیم ان یشفیک (ابوداؤد، ۳ : ۴۷۹، حدیث ۳۱۰۶؛ الترمذی ، ۴ : ۴۱۰ ، حدیث ۲۰۸۳) - آپؐ بیماری کی شدت میں بھی موت کی تمنا کرنے سے منع فرماتے

تھے ۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ اگر بیماری زیادہ ہی سخت ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے : اللھم اَحْیِنی ما کانت الحیاۃ خیرا لی و توفنی ما کانت الوفاۃ خیرا لی (البخاری ، ۴ : ۴۸ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۴۸۰ ، حدیث ۳۱۰۸) .

۷۔ غلاموں سے سلوک : معاشرے کے پسماندہ طبقوں کا آپؐ کو خصوصی طور پر خیال رہتا تھا ۔ جن میں غلام خاص طور پر شامل ہیں ۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ آپؐ نے غلاموں کو ان کے جائز اور فطری حقوق عطا کیے جانے کی تبلیغ فرمائی [رک بہ غلامی] ۔ متعدد عبادتوں میں غلاموں کی آزادی کو شامل کیا [رک بہ کفارہ] اور غلاموں کو اپنے جیسا انسان سمجھنے اور ان کی جائز ضروریات پورا کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ، حتّٰی کہ اپنی آخری وصیت میں اسے پھر دھرایا [دیکھیے بالا مقالہ (حضرت) محمدؐ] .

آپؐ فرمایا کرتے تھے : یہ غلام بھی تمہاری طرح کے انسان اور تمہارے بھائی بند ہیں، جن کو خدا نے تمہارا مطیع کر دیا ہے ، ان غلاموں کو اپنے جیسا کھانا دو، اپنے جیسا کپڑا پہناؤ اور انھیں ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو ، اگر ایسی صورت ہو تو پھر خود ان کی مدد کرو (ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۰ ، حدیث ۵۱۵۸ ؛ مسلم (الایمان)، ۳ : ۱۲۸۲، حدیث ۱۶۶۱؛ الترمذی (البر) ، ۴ : ۳۴۴ ، حدیث ۱۹۴).

آپؐ نے خود اپنے غلام حضرت زیدؓ کو آزاد کرکے اپنا متبنّٰی کر لیا تھا ۔ ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ سے اس قدر آپؐ پیار فرماتے کہ اپنے کسی رشتہ دار بچے سے بھی اتنا پیار دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ ایک ران پر ان کو اور دوسری پر حضرت حسنؓ کو بٹھاتے اور فرماتے : اے خدا جس طرح مجھے ان پر شفقت ہے تو بھی ان پر شفقت فرما (البخاری ، ۴ : ۱۱۵) ۔ ایک مرتبہ جب لوگوں کو آپؐ کی بارگاہ میں سفارش کی ضرورت ہوئی، تو انھیں اسامہؓ سے زیادہ کوئی آپؐ کے قریب تر نظر نہ آیا (الترمذی ، ۴ : ۳۷۰ تا ۳۷۱ ، حدیث ۱۴۳۰) ۔ انھیں صحابہؓ حبّ رسول (آپؐ کے لاڈلے) کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ اپنی خادمہ حضرت ام ایمنؓ کو آپؐ ہمیشہ یا امہ (اے امی) کہہ کر پکارتے (ابن سعد ، ۸ : ۳۳۶، ذکر ام ایمن) ۔ انھیں اپنے اہل بیت میں سے شمار کرتے اور انھیں خاتون جنت قرار دیتے (کتاب مذکور)؛ انھیں آزاد کرکے آپؐ نے اپنے آزادہ کردہ غلام حضرت زیدؓ سے بیاہ دیا تھا ۔ آپؐ کو غلاموں کی فلاح و بہبود کا اس قدر خیال تھا کہ آپؐ کو ان کے حق میں لفظ غلام کا استعمال بھی پسند نہ تھا۔ آپؐ فرماتے تھے: تم میں سے کوئی اپنے غلام کو میرا غلام اور میری لونڈی نہ کہے اور نہ ہی غلام اپنے آقا کو میرے دیوتا اور میری دیوی کہا کرے، بلکہ آقا کہے : میرے بچے یا بچی ، اور غلام کہے: اے میرے سردار (ابو داؤد، ۵ : ۲۵۶ ، حدیث ۴۹۷۵)۔ ان کو مارنے کی آپؐ سختی سے مذمت فرماتے اور حکم دیتے : جس نے اپنے لونڈی غلام کو تھپڑ مارا ، یا کوئی اور ضرب لگائی تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے (مسلم، (الایمان) ، ۳ : ۱۲۷۸ ، حدیث ۱۶۵۷؛ ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۴، حدیث ۵۱۶۶) ۔ نیز فرماتے کہ اگر دن میں ستر مرتبہ بھی خادم غلطی کرے تو اسے معاف کر دیا جائے (الترمذی ۴ : ۳۳۶ ، حدیث ۱۹۴۹) ۔ اگر کسی خادم کی پٹائی کا آپؐ کو علم ہوتا تو آپؐ اس کے مالکان کو اسے آزاد کر دینے کی ترغیب دیتے (مسلم ، الایمان والنذور ، ۳ : ۱۲۷۹ ، حدیث ۱۷۵۸ ؛ الترمذی ، النذور، ۴: ۱۱۴ تا ۱۱۵ ، حدیث ۱۹۵۸) ۔ اگر آپؐ کسی مالک کو اپنے کسی خادم کو مارتے دیکھتے تو فرماتے : یاد رکھو خدا تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی تم اس غلام پر رکھتے ہو (مسلم، ۳:۱۲۸۱، حدیث ۱۶۵۹ ؛ ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۱، حدیث ۵۱۵۹؛ الترمذی ، ۴ : ۳۳۵ ، حدیث ۱۹۴۸).

آپؐ نے غلاموں کو ان کے جائز حقوق دلانے کے سلسلے میں جو اہم انتظامی اقدامات فرمائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپؐ نے ان کے نکاح کی ترغیب دلائی اور ان کے مابین جبری تفریق کو بالکل باطل ٹھیرایا (ابن ماجہ، سنن (الطلاق)) ۔ انھیں مال غنیمت میں سے حصہ دیا جاتا رہا (ابو داؤد، ۳ : ۱۶۹، حدیث ۲۷۲۷) ۔ آپؐ ان کی آزادی کو بہت بڑی عبادت قرار دیتے اور فرماتے جو کوئی غلام آزاد کرے، خدا اس کے ہر عضو کو جہنم سے آزاد کر دے گا (مسلم، ۲ : ۱۱۴۷، حدیث ۱۵۰۹) ۔ ان کے جذبات کا احترام فرماتے، ان کا ہدیہ قبول کرتے، (مسلم، ۲ : ۱۱۴۴، حدیث ۱۵۰۴) ۔ اگر کسی غیر مسلم کا غلام بھاگ کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تو آپؐ اسے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوے آزاد فرما دیتے احمد بن حنبل (مسند، ۱ : ۲۴۳ ابوداؤد، ۳: ۱۴۸، حدیث ۲۷۰۰)۔ آزاد شدہ غلاموں کی آباد کاری اور ضروریات زندگی کی فراہمی آپؐ کے نزدیک دوسرے کاموں سے مقدم ہوتی تھی ۔ آپؐ کو غلاموں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت کا بہت خیال رہتا تھا ۔

۸- مہمانوں کی خدمت : آپؐ اپنے جدامجد حضرت ابراہیمؑ کی طرح بہت فیاض اور مہمان نواز واقع ہوے تھے ۔ آپؐ مہمان نوازی کو جزو اسلام قرار دیتے تھے (مسلم، ۱ : ۶۸، حدیث ۴۷ تا ۴۸ بعد)۔ آپؐ کا گھر اچھا خاصا مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔ ان سرکاری مہمانوں کو زیادہ تر مسجد نبوی میں ٹھیرایا جاتا اور آپؐ بنفس نفیس ان کی تواضع فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ دو انصاری خواتین رملہ وام شریک کے مکانات بھی دارالضیوف کا کام دیتے تھے (الزرقانی، جلد ۴ : ۱ تا ۸۰، ذکر وفود ؛ مسلم، ۲ : ۵۱۹) اور اس بارے میں مسلم یا کافر کی کوئی تمیز نہ تھی ۔ آپؐ کے پاس غیر مسلم مہمان بھی آتے رہتے تھے، جو بعض اوقات بڑی بھاری ضیافت سے شکم سیر ہوتے، مثلاً ایک مرتبہ ایک غیر مسلم مہمان نے سات بکریوں کا دودھ پی لیا (الترمذی، ۴ : ۲۶۷، حدیث ۱۸۱۹)۔ اکثر مہمان نوازی سے آپؐ کو اور آپؐ کے گھر والوں کو فاقہ کرنا پڑتا، مگر آپؐ کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار نہ ہوتی (احمد بن حنبل : مسند، ۶ : ۳۹۷) ۔ آپ کا یہ طرز عمل دیکھ کر کافر مشرف باسلام ہو جاتے (حوالہ مذکور) ۔ آپؐ رات کو اٹھ اٹھ کر مہمانوں کی خبرگیری فرماتے ۔ اگر گھر میں گنجائش نہ ہوتی تو آپؐ مہمانوں کو صحابہؓ میں تقسیم فرما دیتے اور فرماتے : جس کے گھر میں دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ تین کو لے جائے، چار کا ہو تو پانچ چھ کو لے جائے (مسلم، ۳ : ۱۶۲۷، حدیث ۲۰۵۷) ۔ مہمان بعض اوقات غلط حرکتیں کر بیٹھتے، آپؐ ان کو شفقت اور محبت سے سمجھا دیتے ۔ ایک مرتبہ ایک مہمان نے آپؐ کا حصہ بھی تناول کرلیا۔ آپؐ نے بجز دعاے خیر کے کچھ نہ کہا (کتاب مذکور، ۱۶۲۳، حدیث ۲۰۵۴) ۔ ایک بدوی نے ایک مرتبہ صحن مسجد میں پیشاب کر دیا، صحابہؓ مارنے کے لیے دوڑے، مگر آپؐ نے منع فرما دیا (ابو داؤد، ۱ : ۲۶۳ تا ۲۶۴، حدیث ۳۸۰) ۔ کئی کئی روز قیام کے بعد جب مہمان رخصت ہونا چاہتے تو آپؐ حضرت بلالؓ کو فرماتے : اجزهم كما تجيز الوافد (ابن سعد، ۱ : ۴۹۸)، یعنی ان کو اسی طرح سامان دو، جس طرح آنے والے مہمان کو دیا جاتا ہے ۔ دستور کے مطابق بوقت رخصت عام طور پر فی کس پانچ اوقیہ چاندی دی جاتی تھی (کتاب مذکور، ص ۳۱۷)۔

آپؐ کی مجلس میں بعض غیر مسلم مہمان آداب مجلس ملحوظ نہ رکھتے مگر آپؐ انھیں معاف فرما دیتے ۔ بعض یہودی مجلس میں آ کر السلام علیکم کے بجاے (معاذ اللہ) السام علیکم کی بد دعا دیتے، مگر آپؐ درگزر فرماتے ۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے

جواب میں و علیکم السام کے الفاظ کہے ، آپؐ نے ناپسند کیا (ابو داؤد ، ۵ : ۳۸۴ ، حدیث ۵۲۰۶)۔ یہودی اس کے علاوہ بھی طرح طرح کی بد زبانیاں کرتے (۴ [النساء] : ۴۶)۔ بعض لوگ انھیں ترکی بترکی جواب دینا چاہتے ، مگر آپؐ تحمل اور بردباری کا سلوک فرماتے (الترمذی ، ۴ : ۱۵۵، حدیث ۱۶۰۳).

آپؐ کے گھر میں اگر کوئی غیر مسلم مہمان آتا تو اس کی خاطر مدارت میں کمی نہ کی جاتی ؛ آپؐ خود بنفس نفیس ان کی خدمت فرماتے (دیکھیے بالا)۔ نصارائے نجران کو نہ صرف مسجد میں ٹھیرایا، بلکہ ان کو اپنے طریقے کے مطابق مسجد ھی میں عبادت کرنے کی اجازت فرما دی (ابن القیم : زاد المعاد ، نیز دیکھیے البخاری کتاب الادب، باب حق الضیف، اکرام الضیف و خدمتہ ایاہ بنفسہ ، ۴ : ۱۴۲ ببعد).

۹۔ بچوں سے الفت : آپؐ تمام بچوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے اور ان سے الفت بھرا سلوک فرماتے اور یہی تعلیم دوسروں کو دیتے ، آپؐ کا ارشاد ہے : مَن لَّم یرحم صغیرنا و یعرف حق کبیرنا فَلَیْسَ منا (ابو داؤد، ۵ : ۲۳۳ ، حدیث ۴۹۴۳)، یعنی جو کوئی چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا اور بڑوں کا حق نہیں پہچانتا وہ ہم میں سے نہیں ؛ مزید فرماتے : رحمت تو بد قسمت لوگوں کے دلوں سے ہی نکالی جاتی ہے (الترمذی ، ۴ : ۳۲۴ ، حدیث ۱۹۲۳)۔ راستے میں کھیلنے والے بچوں پر سے گزر ہوتا تو مسکرا کر سلام فرماتے (البخاری ۴ : ۱۷۱ ؛ مسلم ۴ : ۱۷۰۸ ، حدیث ۲۱۶۸ ؛ الترمذی ۵ : ۵۷ ، حدیث ۲۶۹۶)۔ اگر آپؐ سواری پر سوار ہوتے ، تو اپنے آگے اور پیچھے بچوں کو سوار کر لیتے اور اسی حال میں گھر تشریف لاتے (مسلم ، الفضائل ، ۴ : ۱۸۸۵ ، حدیث ۲۴۲۸ ؛ ابن ماجہ (الادب) ۳۷۷۳).

آپؐ بچوں کو چومنا، ان سے لاڈ پیار کرنا، ان کا حق سمجھتے تھے۔ اور اسے دل میں موجود جذبۂ شفقت و رحمت کا نتیجہ قرار دیتے (الترمذی، (البر)، ۴:۳۱۸، حدیث ۱۹۱۱)۔ ان والدین کی تعریف فرماتے جو اپنی اولاد، بالخصوص بچیوں، کے لیے تکالیف جھیلتے اور انھیں آسائش پہنچانے کی سعی کرتے ھیں (الترمذی ، ۴ : ۳۱۹ ، حدیث ۱۹۱۵ ؛ البخاری ، ۲ : ۱۱۴ ، باب ۱۸)۔ آپؐ تمام بچوں کو سلوک اور مروّت میں یکساں سمجھنے کی تلقین فرماتے ، اگر کوئی صحابیؓ کسی ایک کو دوسروں پر بلاوجہ ترجیح دیتا تو اسے ظلم قرار دیتے (النسائی ، حدیث ۳۷۱۸ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۸۱۵ ، حدیث ۳۵۴۴ ، ۳۵۴۵).

آپؐ کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا ھمیشہ خیال رھتا تھا۔ آپؐ ان والدین کو ، جو بالخصوص تین (یا دو) بچیوں کی تعلیم و تربیت کا اچھی طرح حق ادا کرکے ، ان کا مناسب گھرانوں میں نکاح کر دیتے ھیں جنت میں داخلے کی بشارت سناتے تھے۔

آپؐ کے نزدیک بچوں کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے افضل تھا (الترمذی ، ۴:۳۳۷ ، ۱۹۵۱)۔ اگر کسی بچے سے غلطی ہو جاتی، تو نہایت محبت اور پیار سے اسے سمجھا دیتے اور پھر شفقت سے سر پر ھاتھ پھیر کر دعا دے کر رخصت فرماتے۔ آپؐ کا طریق تربیت بڑا مشفقانہ اور حکیمانہ تھا۔ (ابو داؤد کتاب الجہاد)، اگر کوئی بچہ بغیر سلام کیر اور اجازت مانگے اندر چلا آتا تو آپؐ اسے نہایت نرمی سے فرماتے : پہلے باھر جا کر سلام کرو اور کہو کیا میں اندر آ سکتا ھوں۔ جب اجازت مل جائے تو پھر اندر آنا (الترمذی ، الاستیذان ، ۵ : ۶۵، حدیث ۲۷۱۰ ؛ ابو داؤد ، ۵ : ۳۶۸ ، حدیث ۵۱۷۶).

آپؐ کے پاس بہت چھوٹی عمر کے بچے لائے جاتے؛ آپؐ انھیں اٹھاتے ، پیار کرتے ، خیر و برکت کی دعا دیتے اور تحنیک فرماتے یعنی کھجور وغیرہ چبا کر ان کے منہ میں ڈالتے (ابوداؤد، ۵ : ۳۳۳، حدیث ۵۰۰۶)۔ بعض بچے آپؐ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتے، مگر آپؐ

ان کو کچھ نہ کہتے اور پانی منگوا کر کپڑے صاف فرما لیتے (البخاری، ۴ : ۱۱۵ ، باب ۲۱)؛ بعض بچے آپ کی مہر نبوت [رک بہ شمائل و اخلاق نبوی] سے کھیلنے لگ جاتے ؛ لوگ منع کرنا چاہتے ، مگر آپؐ روک دیتے (کتاب مذکور، ۷۸/۱۷، ۴ : ۱۱۳، باب من ترک صبیة غیرہ حتّٰی تلعب) ۔ بچوں سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق بات کرتے ۔ حبشہ سے آنے والی ایک بچی کو اسی کے زبان میں حسنہ کے بجائے سَنَہ سَنَہ فرماتے (حوالۂ مذکور) ۔ کہیں سے کوئی تحفے آتے تو ان میں بچوں کا حصہ مخصوص رکھتے؛ ایک مرتبہ سیاہ دھاری دار کپڑا آپؐ کی خدمت میں آیا تو آپؐ نے ام خالد نامی بچی کو بلایا اور اپنے ہاتھ سے پہنا کر فرمایا : پہن اور بوسیدہ کر، پہن اور بوسیدہ کر (البخاری ، ۷۷/۳۲، ۴ : ۸۶)۔کوئی میوہ ہوتا تو سب سے کم عمر بچے کو کھلاتے (الطبرانی: معجم صغیر، بذیل میم)

بچوں کو بلانا ہوتا تو یَا بُنَیَّ (اے پیارے بچے) کہہ کر بلاتے (ابو داؤد ، ۵ : ۲۴۸ ، ۴۹۶۴) ۔ بچوں سے دل لگی فرماتے : حضرت انسؓ کو بعض اوقات اے دو کانوں والے (یا ذَالاذنین) کہ کر پکارتے (الترمذی، ۴ : ۳۵۸ ، ۱۹۹۲ ؛ ابو داؤد ۵:۲۷۲ ، حدیث ۵۰۰۲) ۔ ان کے چھوٹے بھائی عمیر کی ایک پالتو چڑیا مر گئی تو آپؐ دل لگی کے طور پر فرماتے ، یا عمیر ما فعل النغیر ، یعنی اے عمیر تیری نغیر نے کیا کیا (البخاری ، ۷۸/۱۱۲ ، ۴ : ۱۵۹ ؛ الترمذی (الصلاہ) ۲ : ۱۵۴ ، حدیث ۳۳۳).

القصہ آپؐ بچوں سے لاڈ پیار ، شفقت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتے تھے ۔

۱۰۔ دشمنوں سے سلوک : آپؐ صرف اپنوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دشمنوں کے لیے بھی مجسمہ رحمت و شفقت تھے ۔ آپؐ نے کبھی کسی دشمن سے اپنی ذاتی عداوت کا انتقام نہیں لیا (ابو داؤد، ۵ : ۱۴۲، حدیث ۴۷۸۶) ؛ آپؐ سے متعدد مرتبہ مشرکین کے حق میں بددعا کرنے کی درخواست کی گئی؛ آپؐ نے ایسے موقعوں پر فرمایا: اے اللہ ! میری قوم کو ہدایت فرما؛ کیوں کہ وہ نہیں جانتے (البخاری) ۔ ایک دوسرے موقعے پر بنو دوس کے حق میں اسی قسم کی بد دعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا : اے اللہ ! بنو دوس کو ہدایت دے اور انہیں مسلمان کر کے لا (مسلم ، ۴ : ۱۹۵۷ حدیث ۲۵۲۴) ۔ ایک اور موقع پر فرمایا : میں ذریعہ لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (مسلم ، ۴ : ۲۰۰۷ ، حدیث ۲۵۹۹)۔ ہجرت کے بعد مکے والوں پر کوئی قدرتی وبا (مثلاً قحط) آتی اور وہ آپؐ کے پاس دعا کے لیے حاضر ہوتے تو آپ ان کی دشمنی کے باوجود ان کے حق میں دعاے خیر فرماتے ۔ (البخاری ، ۳ : ۳۲۸ ، تفسیر (الدخان))۔ بنو ثقیف کے حق میں بددعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا : اے اللہ ! بنو ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو مسلمان بنا کر لا (ابن سعد، ۲ : ۱۵۹).

جہاں تک مروت و احسان کا تعلق تھا تو اس میں آپؐ اپنے اور بیگانے میں تمیز روا نہ رکھتے ۔ آپؐ مشرکین کے تحفے تحائف قبول فرماتے اور انہیں بدلہ بھی دیتے (الترمذی، ۴ : ۱۴۰، حدیث ۱۵۷۷) ۔ آپؐ کی اسی وسعت قلبی کا نتیجہ تھا کہ خیبر کی ایک یہودیہ عورت نے آپؐ کو گوشت میں زہر ملا کر پیش کر دیا ، گو آپؐ نے کم کھایا ، مگر ایک صحابیؓ اس کو کھانے کے نتیجے میں انتقال کر گئے (البخاری ، ۳ : ۱۳۲ ، غزوۂ خیبر).

آپؐ بعض یہودیوں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جاتے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے (البخاری، ۷۵/۱۱ ، ۴ : ۴۴ ، عیادۃ المشرک) ۔ اگر کوئی یہودی رضاکارانہ طور پر آپؐ کی خدمت کرنا چاہتا تو اسے منع نہ فرماتے (حوالۂ مذکور) ۔ اگر کسی یہودی کا

کسی مسلمان سے ، حتیٰ کہ آپؐ اور حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کے بارے میں بھی ، جھگڑا ہو جاتا تو آپؐ نرمی سے مسلمان کو سمجھا دیتے (البخاری ، ۲ : ۳۵۴) - بعض یہودی آپؐ کی شان میں گستاخی کرتے ، مگر آپ ہمیشہ درگزر اور تحمل سے کام لیتے.

۱۱- حیوانات پر مہربانی : آپؐ کے قلب اطہر میں بنی نوع انسان کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام جانداروں کے لیے بھی شفقت و رحمت کا جذبہ موجزن رہتا تھا - اسی بنا پر آپؐ صحابہؓ کو جانوروں کی عمدہ دیکھ بھال کرنے کی تلقین فرماتے - اگر کسی جانور کو بدحال دیکھتے تو فرماتے : ان بے زبانوں کے بارے میں خدا سے ڈرو ؛ ان پر سواری بھی اچھے طریقے سے کرو اور ان کو کھانا بھی عمدہ طریقے سے دو (ابو داؤد ، ۳ : ۴۹ ، حدیث ۲۵۴۸) - اگر کسی جانور کے منہ پر داغ لگے نظر آتے تو سخت خفا ہوتے اور فرماتے : کیا تمھیں میری بات نہیں پہنچی کہ میں نے بے زبانوں کے منہ پر داغ لگانے اور ان کی شکلیں بگاڑنے سے منع کیا ہے (مسلم ، اللباس ، ۳ : ۱۶۷۳ ، حدیث ۲۱۱۷ ؛ ابو داؤد ، ۳ : ۵۷ ، حدیث ۲۵۶۴) - اگر کسی کو مرغ کی سحر خیزی کی وجہ سے شکایت پیدا ہوتی ہو تو فرماتے : مرغ کو برا بھلا نہ کہو، کیوں کہ وہ نماز کے لیے جگاتا ہے، مزید فرمایا: جب تم مرغ کی بانگ سنو تو خدا سے اس کا فضل مانگو ، کیوں کہ وہ کسی رحمت کے فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے (ابو داؤد ، ۵ : ۳۳۱ ، حدیث ۵۱۰۱ ، ۵۱۰۲؛ البخاری، (بدؤ الخلق)، ۴ : ۱۵۵ ؛ مسلم، الذکر ، ۴ : ۲۰۹۱، حدیث ۲۷۲۹ ، الترمذی، الدعوات ، ۵ : ۵۰۸ ، حدیث ۳۴۵۹) - مزید فرمایا : اگر کسی کے لگائے ہوئے کھیت یا پودے کو کوئی جانور یا پرندہ چر جائے تو لگانے والے کو صدقے کا اجر ملے گا (البخاری ، ۷۸/۲۷ ، ۴ : ۱۱۷).

رحمت دو عالمؐ نے نہ صرف جانوروں کے ساتھ مہربانی کے سلوک کی تعلیم دی، بلکہ دور جاہلی کی وہ رسمیں بھی ختم کرائیں جو جانوروں کو ایذا پہنچاتی تھیں ، مثلاً زندہ جانور کا گوشت یا ان کی دم یا ایال کے بال کاٹنا ان کو باہم لڑانا، ان پر نشانہ بازی کرنا وغیرہ ، ان تمام امور کو آپؐ نے بے رحمی سے تعبیر کیا اور ان کی ممانعت کی.

پرندوں کے انڈوں کو چرا لینا ، یا ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ لینا عرب میں عام طور پر رائج تھا - آپ کے سامنے ایک دو مرتبہ ان کو دھرایا گیا تو آپ نے ہر بار سختی سے منع فرمایا (ابو داؤد ، ۳ : ۴۶۹ ، حدیث ۳۰۸۹).

خلاصہ یہ کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ، تمام موجود و غیر موجود ، اپنوں اور بیگانوں ، انسانوں اور جانوروں سبھی کے لیے مجسمۂ رحمت و شفقت تھے - آپؐ کی شفقت اور مہربانی بلا امتیاز رنگ و نسل ہر شخص کے لیے تھی- آپؐ کے پاکیزہ اخلاق کا یہ بیان اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے بڑی سے بڑی ضخامت بھی ناکافی ہے، یہ مختصر بیان جو اس مقالے میں ہوا ، صرف آپؐ کے اخلاق عالیہ کی طرف مجمل اشارات پر مشتمل تھا ، تفصیل کے لیے متن میں مذکور حدیث و سیرۃ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے .

مآخذ : متن میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ دیکھیے مآخذ و کتب سیرت [محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا].

(ادارہ)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم بحیثیت مبلّغِ اعظم : (لغوی اور اصطلاحی بحث کے لیے رک بہ مبلّغ/ تبلیغ)، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں جو انبیاے کرام مبعوث ہوے ان تمام کا امتیازی وصف یہ ہوتا تھا : مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ (۵ [المآئدۃ] : ۹۹) ، یعنی رسول کے ذمے تو فقط (احکام خداوندی کا) پہنچانا (بلاغ) ہی ہے - اس

لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبی بنیادی طور پر ایک داعی اور ایک مبلّغ قوم ہی ہوتا تھا جو اِنذار (ڈر سنانے) اور تبشیر (بشارت دینے) کے ذریعے اقوام و ملل کو گمراہی کی دلدل سے نکالنے کی سعی بلیغ کرتا تھا (۶ [الاعراف] : ۴۸) - ان کی تبلیغ نذیر عریان کی مانند ہوتی تھی جو کسی بہت بڑے خطرے کو مسلط ہوتا ہوا دیکھ کر اپنی قوم کو خواب غفلت سے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور جو لوگ اس کی آواز پر کان دھرتے ہیں وہ نجات پا جاتے ہیں اور جو لوگ مخالفت کرتے ہیں تباہ ہو جاتے ہیں (البخاری : الجامع الصحیح، کتاب الرقاق، باب ۲۶، ۴ : ۲۲۷، مطبوعہ لائیڈن).

نبوت و رسالت بجائے خود تبلیغ ہے اور اس لحاظ سے جملہ انبیا اصولاً مبلّغ ہی تھے، لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کامیاب ترین مبلغ ثابت ہوے ہیں، جنھوں نے اپنے خاص الخاص طریق تبلیغ سے وہ انقلاب برپا کیا، جو تاریخ عالم میں بے مثال ہے (سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی، ۴ : ۳۹۸ تا ۴۰۳)۔ آپؐ کی تمام زندگی ایک بے مثال داعی اور کامیاب مبلّغ کی زندگی ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد، گو آپؐ کو مدینہ منورہ میں حکمران کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، مگر آپؐ پھر بھی ایک مبلّغ ہی رہے (Sir Thomas Arnold : *The Preaching of Islam*، ص ۵۱، ترجمہ عنایت اللہ، کراچی ۱۹۶۴ء) - حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کی بے مثال کامیابی کا راز صرف اور صرف آپؐ کی کامیاب اور با اصول تبلیغ میں مضمر ہے.

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تبلیغی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : پہلا دور مکّی ہے جو تقریباً تیرہ سال کے عرصے پر محیط ہے؛ دوسرا مدنی دور ہے جو تقریباً دس سال کے زمانے پر حاوی ہے - ان دونوں عرصوں میں آپؐ یکساں جذبے اور وفور انہماک سے مصروف تبلیغ رہے، مگر ان دونوں ادوار میں آپؐ کی تبلیغ اور اس کا اسلوب قدرے مختلف رہا - مکی زندگی میں تبلیغ زیادہ تر نجی اور انفرادی سطح پر کی جاتی رہی، جب کہ مدنی دور میں انفرادی سطح پر تبلیغ کے علاوہ خطوط اور وفود کی صورت میں بھی تبلیغ کی گئی.

مکی زندگی میں آپؐ کی تبلیغ کے تین درجے تھے: (۱) تبلیغ بہ نفس خود : یعنی وہ عرصہ جو آپؐ نے غار حرا میں تحنث کرتے ہوے گزارا (البخاری، ۱ : ۵، باب کیف کان بدؤ الوحی)؛ تحنث کے معنی ہیں ایک قسم کا غور و فکر، جو آپؐ کائنات کے متعلق اور خود اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے (شبلی : سیرۃ النبی، ۱ : ۲۰۲) یا تزکیۂ باطن کے لیے گناہوں سے اجتناب، ملت حنیفی، یعنی دین ابراہیمی کی اتباع میں عبادات یا پھر کائنات میں گہرا غور و فکر (الزرقانی : شرح المواہب، ۱ : ۲۱۰)؛ (۲) تبلیغ بہ خویش و اقارب : اپنوں کو تبلیغ، آپؐ کو اس کا حکم (۲۶ [الشعراء] : ۲۱۴) میں دیا گیا؛ چنانچہ تقریباً تین سال تک آپؐ نہایت خاموشی سے اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب میں تبلیغ فرماتے رہے، جس کے نتیجے میں تقریباً چالیس مرد و زن مشرف باسلام ہوے - یہ عرصہ جو فترۃ وحی کا عرصہ کہلاتا ہے، مکی دور میں تبلیغ نبوی کے کامیاب ترین ادوار میں سے ہے - اس عرصے میں ایسی نیک فطرت ہستیوں نے اسلام قبول کیا جنھوں نے مستقبل میں نہایت اہم کام سرانجام دیے - یہ چالیس نفوس قدسیہ السابقون الاولون (۹ [التوبہ] : ۱۰۰) کا مصداق ہیں (دیکھیے *The Preaching of Islam*، مترجمہ، عنایت اللہ، ص ۲۹ تا ۲۰۷؛ محمد یوسف: حیاۃ الصحابہ، ۱ : ۴۸ تا ۶۱؛ اس عرصے میں اسلام قبول کرنے والے افراد کے ناموں کے لیے ابن ہشام: سیرۃ، ۱ : ۲۵۰ تا ۲۹۰، مطبوعۂ قاہرہ ۱۳۹۶ء)۔ آپؐ کا یہ انداز تبلیغ نفسیات انسانی کے عین مطابق تھا، اس لیے کہ دوسروں کو تبلیغ کرنے سے

پہلے خود کو ، اپنے رشتہ داروں کو اور اپنے دوست احباب کو ساتھ ملانا اور اپنی کاوش کے عملی نمونے پیش کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے ۔ ورنہ کج طبع لوگ بہانہ بسیار تلاش کر لیتے ہیں ؛ اور ویسے بھی انسان اپنی نجی زندگی میں سب سے زیادہ اپنے قریبی لوگوں کو متأثر کرتا ہے۔

۳۔ تبلیغ عام یا بعثت عامّہ : اس کے اختتام پر آپؐ کو سورہ ۱۵ [الحجر] : ۹۴ کے ذریعے حکم دیا گیا کہ آپؐ تبلیغ کے حلقے کو وسیع کر دیں اور خاص و عام کو پیغام حق پہنچائیں ۔ آپؐ نے تبلیغ عامہ کا آغاز قریش مکہ کو کوہ صفا کے پاس "یا آل غالب" کہہ کر جمع کرنے اور اپنے خاندان والوں کو کھانے کی دعوت پر بلانے سے کیا (البخاری : الصحیح، ۲ : ۷۰۲ ؛ ابن ہشام : السیرۃ ، ۱ : ۲۵۰ تا ۲۸۰)۔ آپؐ نے امر خداوندی پر عمل پیرا ہوتے ہوے فریضۂ تبلیغ ادا کیا ۔ جس میں آپؐ بڑی حد تک کامیاب رہے ۔

بہرحال ۱۳ سالہ مکی دور میں آپؐ نے تبلیغ کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرمائے : (۱) انفرادی تبلیغ : آپؐ نے تبلیغ کا آغاز انفرادی اور نجی سطح سے فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے امّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ کو تبلیغ فرمائی وہ اسلام لے آئیں ، اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکرؓ کو تبلیغ کی انھوں نے اسلام قبول کیا ، اپنے ابن عمّ حضرت علیؓ کو دعوت اسلام دی وہ مشرف باسلام ہوگئے اور اپنے غلام زیدؓ بن حارثہ کو تبلیغ کی اور وہ اسلام لے آئے ؛ حضرت ابوبکرؓ کی انفرادی سطح کی کوششوں سے تقریباً پانچ افراد نے اسلام سے قبول کیا ، تین سال کے عرصے میں چالیس افراد کا اسلام قبول کرنا اس طریقۂ تبلیغ کی خصوصی نوعیت (پر امن ترغیبی روحانی طریق) کی کامیابی کی روشن دلیل ہے (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۱۹۹ تا ۲۰۱ ، بیروت ۱۹۶۰ء و ابن ہشام) ؛

(۲) اجتماعی تبلیغ : آپؐ نے مختلف مواقع پر اجتماع کی صورت میں بھی تبلیغ حق فرمائی ۔ سب سے پہلے آپؐ نے پہاڑی والے وعظ سے اس کا آغاز فرمایا ؛ پھر آپؐ نے اپنے خاندان کو کھانے کی دعوت پر بلایا ، جس میں کم و بیش چالیس نفوس تھے ، ان کے سامنے اسلام کی تبلیغ فرمائی (السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۱۶۵ تا ۱۷۰ ، قاہرہ ۱۹۱۴ء ؛ شبلی نعمانی : سیرۃ النبی ، ۱ : ۱۱۰ ، مطبوعہ اعظم گڑھ)۔ اسی طرح حج کے موقع پر سارے عرب سے زائرین مکہ مکرمہ آتے تھے ۔ اس لیے اس موسم میں کہی ہوئی بات بہت جلد اطراف و اکناف عرب تک پھیل جاتی تھی اور دوسرے ان دنوں آپؐ کو تبلیغ حق سے کوئی ممانعت نہ ہوتی تھی ۔ شعب ابی طالب میں محصوری (۷ تا ۱۰ نبوی کے دوران میں صرف انھی دنوں میں آپؐ کو باہر نکلنے کی اجازت ملتی تھی ۔ بنابریں ان دنوں میں آپؐ کی سرگرمیاں عروج پر ہوتیں ۔ آپؐ مختلف قبائل کی خیمہ گاہوں میں تشریف لے جاتے ۔ ان کے سامنے نہایت پیار اور ہمدردانہ لہجے میں دعوت پیش فرماتے ۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک حجاج حج سے فارغ ہوکر اپنے اپنے گھروں کو نہ لوٹ جاتے ۔ گو ابتدا میں اس طریقہ تبلیغ کو بہت کم پذیرائی ہوئی ، مگر ۱۱ نبوی میں اسی موقع پر یثرب کے چھے حق پرست افراد کے قبول اسلام سے بالآخر یثرب (= المدینۃ المنورہ) اسلام کا مرکز بن گیا (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۱۶ تا ۲۱۸ ؛ البلاذری : انساب الاشراف) ۔ اجتماعی تبلیغ کی غرض سے ہی آپؐ عرب کے مشہور میلوں اور منڈیوں (مثلاً مجنہ ، عکاظ و ذوالمجاز) میں تشریف لے جاتے اور وہاں پر آئے ہوے تمام افراد کو تبلیغ اسلام فرماتے (شرح المواہب ، ۱ : ۳۰۹) ۔ ایسے موقعوں پر ابو لہب [رک بآں] اور کبھی کبھار

ابو جہل [رک بآں] آپؐ کا تعاقب کرتا ۔ اور چلا چلا کر لوگوں کو آپؐ کی بات اور تبلیغ سننے سے منع کرتا رہتا (ابن ہشام : سیرۃ، ۲ : ۶۴، ۶۵؛ ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۱۶؛ سیرۃ النبی ، ۱ : ۲۵۲-۲۵۳) ؛ (۵) تبلیغ کے لیے دور دراز کے شہروں کا سفر : آپؐ نے تبلیغ حق کے لیے دور دراز کے سفر بھی اختیار فرمائے ؛ چنانچہ اہل طائف کی تبلیغ کے لیے کئی روز کے پر مشقت سفر کے بعد طائف تشریف لے گئے، جہاں کے باشندوں نے آپؐ سے روح فرسا سلوک کیا اور نہایت بیدردی سے آپؐ پر پتھر برسائے اور آپؐ کو شہر سے نکال دیا (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۶۰)؛ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ و دعوت کے لیے دور دراز کے قبیلوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو اسلام کی دعوت پہنچائی ۔ (دیکھیے محمد یوسف : حیاۃ الصحابہ ۱ : ۱۰۸ ؛ سیرۃ النبی ۱ : ۲۵۲ - ۲۵۳)۔ جن قبائل کے پاس آپؐ تشریف لے گئے ان میں بنو عامر بن صعصعہ ، بنو محارب بن خصفہ ، بنو فزارہ (=غطفان) ، بنو غسان ، بنو مرہ ، وغیرہ بنو سلیم ، بنو کندہ ، بنو کلب ، بنو حارث ، بنو کعب، بنو عبس ، بنو نضر ، بنو البکاء ، بنو عذرۃ ، وغیرہ کے متعدد قبائل شامل ہیں ، مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول حق کی توفیق نہ ملی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۱۶ ؛ ابن ہشام (۲ : ۶۳ تا ۶۵) اور ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفی ، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶) نے یہ تصریح کی ہے کہ آپؐ ان قبائل کو تبلیغ فرمانے کے لیے ان کے قیام گاہوں (منازلہم) میں تشریف لے جاتے تھے ۔ تبلیغ کا یہ فریضہ رنج ہو یا راحت ، ہر حالت اور ہر صورت میں جاری رہتا ؛ شعب ابی طالب میں تین سال کی فاقہ کشی کے باوجود جب بھی آپؐ کو موقع ملا آپؐ نے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کیا ۔ سفر ہجرت میں آپؐ کی تبلیغ سے کئی افراد نے اسلام قبول کیا ۔ (شرح المواہب، ۱ : ۳۲۵ تا ۳۵۰) ؛ (۶) تبلیغ کے لیے سفیروں کا تقرر : مکی دور ہی میں آپؐ نے دور دراز کے لوگوں کی طرف مختلف افراد بطور سفیر نامزد کرکے بھیجے تاکہ وہ آپؐ کی طرف سے اپنی قوموں کو خدائی پیغام پہنچائیں ، چنانچہ حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی کو ان کی قوم پر اور حضرت مصعبؓ بن عمیر کو یثرب کے علاقے میں اپنی طرف سے مبلغ نامزد کرکے بھیجا (ابن ہشام ، ۲ : ۲۱ تا ۲۵ ، ۷۵ تا ۷۶).

مکی دور کی کامیاب اور پرعزم تبلیغ کے باعث اب آپؐ اس لائق ہوگئے تھے کہ اپنے جانثاروں پر اعتماد کرتے ہوئے یثرب (مدینہ منورہ) کو اپنا مستقل مرکز اور مستقر قرار دے لیں ۔ چنانچہ ۱۳ نبوی ۴ ربیع الاول کو آپؐ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت [رک بآں] فرمائی ۔ یہاں سے آپؐ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو ایک داعی حق کے ساتھ ساتھ آپؐ کی حکمرانی کا دور بھی ہے ، مگر اس دور میں بھی آپؐ کی داعی کی حیثیت تبدیل نہیں ہوئی ، البتہ طریقہ تبلیغ میں کسی قدر عمومیت اور وسعت پیدا ہوگئی ، جو زمانی و مکانی تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ تھی ۔ اس عرصے میں انفرادی تبلیغ کے علاوہ (جو تمام زندگی آپؐ کا شعار رہی) تبلیغ حق کے لیے آپؐ نے مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرمائے :

(۱) تبلیغی وفود کی ترسیل : اس دور میں افراد کے علاوہ آپؐ نے وفود کو بھی تبلیغ اسلام کے لیے مأمور فرمایا ۔ جن میں سے دو تبلیغی وفود کے ساتھ مشرکین نے دھوکہ کیا اور فریب کاری سے قتل کر دیا ۔ ان میں سے ایک وفد کو ، جو ستر تربیت یافتہ قاری حضرات (=قراء) پر مشتمل تھا ۴ھ/۶۲۵ء میں، ابو براء الکلابی رئیس قبیلہ کی درخواست پر قبیلہ کلب کی طرف بھیجا، گیا مگر عامر بن طفیل الکلابی نے بئر معونہ [رک بآں] کے مقام پر ان تمام افراد کو شہید کر دیا ۔ صرف ایک صحابی بمشکل جان بچا سکے؛ دوسری

جماعت کو، جو کم و بیش دس افراد پر مشتمل تھی، قبائل عَضل وقارہ کی طرف اسی سال بھیجا گیا جنھیں مقام رجیع [رک بہ الرجیع] پر بنو لحیان کی مدد سے شہید کر دیا گیا (الواقدی : المغازی ، ۱ : ۳۴۶ ، آکسفرڈ ، ۱۹۶۶ء؛ السہیلی : روض الانف ، ۲ : ۱۷۴)۔ آپؐ کی بعض تبلیغی رسالتیں کامیاب بھی رہیں اور ان کے نتیجے میں متعدد افراد کو قبول حق کی توفیق ہوئی۔

(۲) میدان کار زار اور فریضہ تبلیغ : مدنی دور میں غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہوا جس کو مخالفین اسلام بہت زیادہ اچھالتے ہیں ، مگر واقعہ یہ ہے کہ آپؐ نے ناگزیر صورت کے سوا کبھی جنگ کو پسند نہیں فرمایا اور اسی لیے آپؐ کے واضح احکام تھے کہ عین لڑائی کی حالت میں پہلے مخالفین کو تبلیغ کی جائے۔

سریۂ مؤتہ کے موقع پر جب آپؐ نے عسکر اسلام کو الوداع کہا تو سالار جیش حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مندرجہ ذیل نصیحت فرمائی : جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کے سامنے اولاً تین باتیں پیش کرنا؛ اگر وہ ان میں سے کوئی ایک بھی قبول کر لیں تو لڑائی سے رک جانا : (۱) ان کو قبول اسلام کی دعوت دینا ؛ (۲) جزیہ ادا کرنے پر صلح کی ترغیب (۳) تیسری اور ناگزیر صورت لڑائی کی ہے ، (الواقدی : کتاب المغازی، ۲ : ۷۵۵ ببعد)۔ اسی طرح غزوۂ احزاب میں حضرت علیؓ نے عمرو بن عبدود (ایک مشرک سردار) کے سامنے یہی تین شرائط پیش کیں (ابن ہشام : سیرۃ)۔ غرضیکہ ہر معرکے میں آپؐ کی یہ اصول پرستی دیکھنے میں آئی۔

(۳) مذہبی اجتماعات : مدنی دور میں تبلیغ نبوی کے لیے ایک سازگار ماحول میسر آیا ؛ چنانچہ آپؐ مذہبی اجتماعات کے مواقع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس ضمن میں جمعہ ، و عیدین کے علاوہ ، حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے جو وعظ فرمایا وہ تبلیغ کے باب میں اہم دستاویز ہے۔

(۴) عورتوں کے اجتماعات میں تبلیغ : البخاری (الصحیح ، کتاب ۳ ، باب ۳۲ ، ۳۷) کے مطابق عورتوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک الگ دن مقرر کیا جائے جس میں صرف عورتیں ہی شریک مجلس ہو کر آپؐ کے ارشادات سن سکیں۔ اس پر آپؐ نے ان کے لیے ایک الگ دن مقرر فرمایا۔ اس روز آپؐ حضرت بلالؓ کی معیت میں خواتین کے اجتماع میں تشریف لے جاتے اور عورتوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔

(۵) تبلیغی خطوط کی ترسیل : اس کے بعد آپؐ نے مختلف ممالک کے حکمرانوں اور اہل اقتدار کو تبلیغی مکتوبات ارسال فرمائے جن میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا۔ بعض کا جواب نفی کی صورت میں ملا۔ تبلیغی خطوط کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ والی یمامہ ہوذہ بن علی الحنفی، قاصد حضرت سلیط بن عمرو العامری ؛ ۲۔ والی بحرین منذر بن ساوی بن الاخنس التمیمی العبدی ، قاصد حضرت علاء بن الحضرمی ؛ ۳۔ والی عمان جیفر بن جلندی ابن عامر و عبد بن جلندی ابن عامر ، قاصد حضرت عمرو بن العاص ؛ ۴۔ والی دمشق حارث بن ابی شمر، قاصد شجاع بن وہب الاسدی ؛ ۵۔ شہنشاہ حبش نجاشی اصحم بن ابجر ، قاصد حضرت جعفر طیار و حضرت عمرو بن امیہ الضمری ؛ ۶۔ حاکم مصر مقوقس (جریج بن مینا) قاصد حضرت حاطب بن ابی بلتعہ القرشی ، اللخمی ؛ ۷۔ شہنشاہ فارس کسریٰ خسرو پرویز ابن ہرمز ابن نوشیروان ، قاصد حضرت عبداللہ بن حذافہ القرشی ، السہمی ؛ ۸۔ قیصر روم ہرقل ، قاصد حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی ؛ ۹۔ پاپائے روم ضغاطر الاسقف ، قاصد نا معلوم ؛ (الزرقانی : شرح المواہب ، ۳ : ۳۳۴ تا ۳۷۰؛ محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ،

مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۶ء، ص ۴۲ تا ۱۷۵، نیز Leone Caetani : *Annali dell, Islam*، ۶ : ۵۰، نیز بمدد اشاریہ؛ A. Sprenger : *Das Leben uud die Lepre des Mohammad*، ۳ : ۲۶۹، نیز بمدد اشاریہ)۔ اس کے علاوہ عرب میں آباد مختلف قبائل کے شیوخ کو بھی آپؐ نے اسی قسم کے تبلیغی خطوط ارسال کیے (الوثائق السیاسیہ؛ نیز حفظ الرحمن سیوہاروی: بلاغ مبین، مطبوعہ بجنور ص، ۲۹ - ۲۴۶)۔

اس موقع پر معاندین اسلام کے ان حربوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن کا مقصد آپ کو تبلیغ حق سے روکنا اور اشاعت کی تحریک کو مسدود کرنا تھا، مگر آپ نے ان تمام مصائب کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا: ۱- سبّ و شتم: معاندین اسلام کی طرف سے آپؐ کو وقتاً فوقتاً (معاذ اللہ) برا بھلا کہا جاتا تھا جس کا مقصد آپؐ کو پریشان و ہراساں کرنا اور آپؐ کو اپنے مشن کی تکمیل سے روکنا تھا۔ اس کا آغاز اسی وقت سے ہوگیا تھا جب کہ آپؐ نے کوہ صفا سے اپنی رسالت حقہ کا اعلان فرمایا تھا۔ اس موقع پر ابو لہب نے کہا: تبا لک الھذا جمعتنا (ابن کثیر: تفسیر، بذیل ۱۱۱ (اللھب)؛ ابن سعد: طبقات، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء، ۱ : ۱۹۹ ببعد) یعنی (معاذ اللہ) تو ہلاک ہو، کیا تو نے ہمیں اس لیے بلایا تھا۔ اس کے علاوہ مشرکین آپؐ کو ساحر، مجنون، مفتون اور محمد کی بجائے مذمم کے نام سے پکارتے تھے (سیرۃ النبی، ۱ : ۲۵۴ تا ۲۵۵)؛

۲- اِستھزا: استھزائیہ جملے سب و شتم کے جملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ حربہ جس شدت کے ساتھ آپؐ کے خلاف آزمایا گیا اس کی تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔ آپ جس طرف جاتے، لوگ استھزا کے زہریلے جملوں سے آپ کا استقبال کرتے۔ قرآن کریم میں ہے: وَ اِذَا رَاَوْکَ اِنْ یَّتَّخِذُوْنَکَ اِلَّا ھُزُوًا ط اَھٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰہُ رَسُوْلًا ط (۲۵ [الفرقان]: ۴۱)، یعنی وہ جب آپؐ کو دیکھتے ہیں تو آپؐ سے تمسخر کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہی ہے جس کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ سنہ ۱۰ نبوی میں جب آپؐ طائف تشریف لے گئے تو سرداران طائف میں سے ایک نے کہا کہ کیا خدا کو تیرے سوا نبی بنانے کے لیے کوئی اور ملا ہی نہ تھا؟ دوسرے نے کہا کہ اگر خدا نے تجھے نبی بنا کر بھیجا ہے تو کعبے کا پردہ چاک کر دیا ہے (السھیلی: روض الانف، ۱ : ۲۶۰ تا ۲۶۳)۔ بعض لوگوں، مثلاً اسود بن عبد یغوث وغیرہ نے آپؐ کا مذاق اڑانے میں بہت نام پیدا کیا تھا (حوالۂ مذکور، ص ۲۵۵)۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: انا کَفَیْنٰکَ المستھزءِیْنَ (۱۵ [الحجر]: ۹۶)، یعنی ہم آپ کے لیے تمسخر کرنے والوں کے مقابلہ میں کافی ہیں۔

۳- جسمانی ایذائیں: اس کے علاوہ رحمت دو عالمؐ کو مختلف موقعوں پر جسمانی اذیتیں بھی پہنچائی گئیں۔ جب آپؐ نے پہلے پہل بیت اللہ شریف کے سامنے تبلیغ کی تو مشرکین نے آپؐ پر ہلہ بول دیا۔ آپؐ کو بچانے کی غرض سے حارث بن ابی ہالہ آگے بڑھے، مشرکین نے مار مار کر انھیں شہید کر دیا یہ اسلام کے پہلے شہید تھے (ابن حجر: الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ، ذکر حارث بن ابی ہالہ)؛ ایک دفعہ غلاظت سے بھری ہوئی اوجھ عین حالت نماز میں جسم اطہر پر رکھ دی گئی (سیرۃ النبی، ۱: ۲۵۵)۔ ام جمیل زوجہ ابی لہب [آپ کی چچی] آپؐ کے راستے میں کانٹیں بکھیرتی اور آپؐ پر غلاظت پھینک دیتی تھی (مفتی محمد شفیع: معارف القرآن، ۸ : ۸۴۰-۸۴۱)۔ ۱۰ نبوت میں آپ طائف میں بغرض تبلیغ تشریف لے گئے اور دس روز تک بنو ثقیف کو دعوت حق دیتے رہے، لیکن ان ظالموں نے آپ کو اتنا مارا کہ جسم اطہر لہولہان ہوگیا اور جوتے پاؤں سے چپک کر رہ گئے

(ابن سعد: طبقات، ۱ : ۲۱۲ ؛ السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۶۰ ؛ الزرقانی : شرح المواہب ، ۱ : ۲۹۶) .

۴۔ دنیاوی منافع کا لالچ : ان سب طریقوں کے باوجود ، جب آپؐ تبلیغ رسالت سے نہ رکے تو مشرکین کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ نے آپؐ کو دعوت حق سے دستبردار ہونے کی صورت میں مکہ مکرمہ کی ریاست ، بڑے گھرانوں کی خوبصورت عورتوں سے شادی اور مال و دولت کے ذخیروں کی پیشکش کی ، لیکن آپؐ نے جواب میں حم ، السجدۃ کی آیات تلاوت فرما کر ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا (ابن ہشام : سیرۃ النبویۃ، ۱ : ۲۱۳) ۔ ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے فرمایا : بخدا اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی لا کے رکھ دیں ، تب بھی میں تبلیغ حق سے نہ رکوں گا (حوالۂ مذکور ، ۱ : ۲۸۲ ببعد).

۵۔ اہل اسلام پر ظلم و ستم : اس پر بھی جب اسلام کی اشاعت نہ رکی تو آپؐ کے ماننے والوں پر ظلم و ستم اور جور و تعدی کی انتہا کر دی گئی۔ مشرکین کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے بیکس مسلمانوں میں حضرت خبابؓ بن الارت (م ۳۷ھ) ، حضرت بلالؓ حبشی (م ۱۷ھ یا ۱۸ھ یا ۲۱ھ) ، حضرت عمار بن یاسرؓ (م ۳۷ھ-۶۵۷ء) اور ان کی والدہؓ حضرت سمیہؓ ، حضرت صہیبؓ رومی ، حضرت ابو فکیہہ (م تقریباً ۲ھ) ، حضرت لُبینہ ، زنیرہ وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جن کو روح فرسا طریقوں سے مارا پیٹا گیا ۔ (السہیلی : روض الانف ، ۱ : ۲۰۲ ؛ شبلی نعمانی : سیرۃ النبی ، ۱ : ۲۲۹ تا ۲۳۱) .

۶۔ معاشی و معاشرتی عدم تعاون : اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو بالآخر ۷ نبوی میں رؤسائے قریش کی باہمی مشاورت سے ایک معاہدہ ترتیب دیا گیا جس کے مطابق قریش اور ان کے حلیفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے حلیفوں سے معاشی و معاشرتی عدم تعاون کرنے کا فیصلہ کرلیا ۔ اس ضمن میں تین باتوں پر تمام اہل مکہ سے حلف لیا گیا : (۱) ان سے مناکحت نہ کی جائے ؛ (۲) ان کو کوئی چیز فروخت نہ کی جائے ، (۳) ان سے کوئی چیز نہ خریدی جائے (ابن الجوزی : الوفا باحوال المصطفیٰ ، ۱ : ۱۹۷) ۔ اسے باقاعدہ معاہدے کی صورت میں لکھ کر بیت اللہ شریف پر لٹکا دیا گیا اور یہ سلسلہ تین سال (از ۷ھ تا ۱۰ھ) تک جاری رہا ۔ اس دوران میں بنو ہاشم کے لوگوں ، بالخصوص بچوں ، کی حالت نہایت نازک رہی ۔ یہ لوگ سوکھے چمڑے کھا کھا کر گزارا کرتے رہے ، مگر دشمنوں کو اس پر ذرا رحم نہ آیا (السہیلی : روض الانف، ۱ : ۲۱۹ و ببعد، ۲۳۱ و ببعد) ۔ اندازہ کیجیے جب آپؐ اپنے خاندان کے معصوم بچوں کو بھوک سے بلبلاتا ہوا دیکھتے ہوں گے ، تو آپؐ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی.

۷۔ تذلیل و تحقیر : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اور صحابہؓ کرام کی ہر ممکن طریقے سے تذلیل و تحقیر کی کوشش کی جاتی تھی ، یہاں تک کہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ۔ چنانچہ مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی ۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں دو بدترین ہمسایوں ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط میں گھرا ہوا تھا اور وہ دونوں اپنے گھر کی غلاظت اور گندگی لا کر میرے دروازے پر ڈال دیتے تھے ۔ آپؐ برآمد ہو کر صرف یہ فرماتے : اے عبد مناف کی اولاد ! یہ کس قسم کی ہمسائیگی ہے ؟ پھر آپؐ اسے راستے سے ہٹا دیتے (ابن سعد : الطبقات ، ۱ : ۲۰۱ ؛ ابن کثیر : تفسیر ، ۴ : ۵۶۳ ، بذیل سورہ ابی لہب).

۸۔ ذات نبویؐ کا تعاقب : اس کے باوجود جب روز بروز اسلام ترقی کرتا رہا تو مخالفین نے اس کی

اشاعت کو روکنے کے لیے ایک یہ تدبیر اختیار کی کہ تبلیغ کے مواقع پر ابولہب اور بعض اوقات ابوجہل آپؐ کے تعاقب میں لگا رہتا؛ آپ جس علاقے میں تشریف لے جاتے، وہ چلّا چلّا کر لوگوں کو آپؐ کی باتیں سننے سے روکتا (ابن الجوزی: الوفا، ۲۱۵ تا ۲۱۶، حاکم: مستدرک، ۱: ۱۵، مطبوعہ حیدر آباد دکن، بقول مفسّرین قرآن کریم (۴۱ [حٰم السجدۃ] ۲۶) میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۸- بے سر و پا سوالات: مشرکین مکہ نے جب یہ تمام حربے ناکام ہوتے دیکھے تو بے سروپا سوالات کرنے شروع کر دیے؛ چنانچہ ایک موقع پر یہ مطالبہ کیا کہ ہم اس صورت میں آپؐ کو نبی مان سکتے ہیں کہ آپ (۱) مکہ مکرمہ کی خشک پہاڑیوں سے میٹھے پانی کے چشمے جاری کر کے دکھائیں؛ (۲) آپؐ اس سر زمین میں اپنے لیے کھجوروں، انگوروں کا باغ اگا کر دکھائیں جس کے درمیان نہریں چلتی ہوں؛ (۳) آسمان کا کوئی ٹکڑا بطور عذاب ہم پر گرا کر دکھائیں؛ (۴) خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نمودار کرکے دکھائیں؛ (۵) یا اپنے لیے کوئی موتیوں کا محل بنا کر پیش کردیں اور یا پھر (۶) ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور ہم سب کے نام خدا تعالیٰ کی طرف سے لکھے لکھائے خطوط لا کے پیش کریں۔ ان تمام باتوں کے جواب میں آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ کہ دیں کہ میں تو رسول بشر ہوں (۱۷ [بنی اسرائیل]: ۹۰ تا ۹۴، آلوسی: روح المعانی، بذیل آیات مذکورہ؛ ابن کثیر: البدایۃ والنہایہ، ۳: ۵۰، ۵۱ وغیرہ)۔

۹- بڑے پائے کے علمی سوالات: مشرکین کی ان باتوں کا بھی اثر نہ ہوا اور آپ اپنے موقف پر قائم رہے تو انہوں نے یہود یثرب سے کچھ ایسے علمی سوالات دریافت کیے جو انبیا کے سوا کسی کو نہ آتے ہوں؛ چنانچہ ان کے مشورے سے تین سوالات پیش کیے گئے: (۱) نفس اور روح کی حقیقت کیا ہے؟ (۲) اصحاب کہف کا کیا قصہ ہے؟ (۳) ذوالقرنین کون تھا؟ ان سوالوں کا جواب علی الترتیب ۱۷ [بنی اسرائیل]: ۸۵؛ ۱۸ [الکہف]: ۹ تا ۲۶، ۸۳ تا ۹۸ میں دیا گیا۔

(۱۰) جھوٹا اور بے بنیاد پروپیگنڈہ: اس کے علاوہ اسلام کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا حربہ جس وسیع پیمانے پر اختیار کیا گیا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ہر آنے جانے والے کو آگاہ کر دیا جاتا کہ یہاں ایک ساحر، مجنوں رہتا ہے اس سے بچنا۔ جیسا کہ طفیل بن عمر دوسی کو روکا گیا تھا (ابن ہشام: سیرۃ، ۲: ۲۲ و ببعد)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے آبائی دین کا منکر بتایا جاتا، صحابہ کرامؓ کو صابئی کہا جاتا۔ جب قرآن کریم کی تلاوت ہو رہی ہوتی تو شور و غل مچا دیا جاتا، معاذ اللہ قرآن اور صاحب قرآن کو برا بھلا کہا جاتا؛ بچوں کو پیچھے لگا دیا جاتا کہ وہ مجنون، ساحر وغیرہ کا شور برپا رکھیں، مبادا کوئی آپؐ کی بات سن کر متاثر ہو جائے جیسا کہ ضماد الازدی کو ذاتی مشاہدہ ہوا احمد بن حنبل: مسند، ۱: ۳۰۲؛ البخاری: الصحیح، ۷۸۶؛ (۱۱) اور سب سے آخر میں، آپؐ کے خلاف ایکا کرکے معاذ اللہ آپؐ کو قتل کرنے کی ناپاک سازش تیار کی گئی جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بال بال بچا لیا (رک بہ ہجرۃ)۔

معاندین اسلام کے یہ وہ حربے تھے جو انہوں نے مکی دور میں روا رکھے۔ ۱۳ نبوی میں آپؐ نے اس وقت ہجرت کرنے کا فیصلہ فرمایا جبکہ تمام اہل مکہ نے آپؐ کے قتل کا ناپاک منصوبہ بنا لیا تھا۔ آپؐ نے جب ارض یثرب میں قدم رنجہ فرمایا اور وہیں سکونت اختیار کر لی تو معاندین اور مخالفین اسلام کے طریقوں میں بھی تبدیلی اور وسعت پیدا

ہو گئی ۔ چنانچہ مدنی دور میں آپؐ کو تبلیغ اسلام سے روکنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے :

(۱) قریش کا عبداللہ بن ابی کے نام خط : ابھی آپ مدینہ منورہ میں فروکش ہوے ہی تھے کہ قریش مکہ نے عبداللہ بن ابیّ کو خط لکھا جس میں انصار مدینہ کو برا بھلا کہنے کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ وہ آپؐ کو (معاذ اللہ) مشرکین کے حوالے کر دیں ، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں (دیکھیے محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۳/ب) (۲) قریش اور ان کے حلیفوں کا اعلان جنگ : جب اس طرح ان کی مقصد براری نہ ہوئی تو قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کی طرف سے آپؐ اور صحابہؓ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا۔ قریش مکہ اور یہودان خیبر نے اپنے شعلہ بیان مقرروں اور آتش نوا شاعروں کے ذریعے تمام قبائل عرب کو اسلام کے خلاف متحد کر دیا ؛ چنانچہ نو سال کے مختصر عرصے میں (اگر ۱۰ھ کو نکال دیا جائے) آپؐ کو مخالفین کے خلاف ۷۴ جنگیں لڑنا پڑیں ۔ جن میں سے ۲۷ (غزوات) وہ ہیں جن میں آپؐ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی اور ۴۷ (سرایا) وہ کہ جن میں آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مامور کرکے روانہ فرمایا (ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۵ و ۶ ؛ شرح المواھب ، ۱ : ۳۸۷ تا ۳۹۰) ؛ گویا آپؐ کو ایک سال میں آٹھ نو بار مخالفین کے خلاف صف آرا ہونا پڑا ۔ اسی سے مشرکین عرب کی اسلام دشمنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے (دیکھیے غزوات) (۳) مبلغین اسلام کا قتل : بعض قبائل عرب نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو روکنے کے لیے انوکھا اور منفرد طریقہ اختیار کیا ۔ وہ یہ کہ ان کی طرف سے کوئی آدمی یا کوئی وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنے قبیلے کے لیے مبلغین بھیجنے کی درخواست پیش کرتا ۔ آپؐ ان کی دعوت پر مبلّغین کو ارسال فرما دیتے تو انھیں دھوکے سے راستے میں شہید کر دیا جاتا ۔ یہ واقعہ دو دفعہ دھرایا گیا ۔ پہلی دفعہ بئر معونہ [رَکَ بان] کے مقام پر ستّر صحابہؓ کرام کو اور دوسری دفعہ رجیع کے مقام پر دس صحابہؓ کرام کو نہایت بیدردی سے شہید کردیا گیا۔ یہ صحابہؓ انھی قبائل کے سرکردہ افراد کی درخواست پر تبلیغ اسلام کے پر امن مشن کے لیے جا رہے تھے ، (الیعقوبی : تاریخ ، ۲ : ۷۰۱ ، ۷۲۰ مطبوعۂ بیروت ۱۹۶۰ء ؛ الواقدی : المغازی ، ۱ : ۳۴۳ تا ۳۶۲) ؛ (۴) قاصدان نبوی کا قتل : ۶ھ میں آپؐ نے ایک خط شاہ بصری کے نام لکھا تھا جسے حضرت حارث بن عمیر الازدی لے کر جا رہے تھے ، شرحبیل بن عمرو الغسانی رئیس علاقہ بلقاء نے انھیں مؤتہ کے مقام پر گلا گھونٹ کر شہید کر دیا (ابو اقدی : کتاب المغازی، ۲ : ۷۵۵ ، مطبوعہ آکسفرڈ ؛ ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۱۲۸) .

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تبلیغی خصوصیات : آپؐ کی تبلیغی زندگی کے کوائف مختصراً بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی ان تبلیغی خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے ، جن کی بدولت آپؐ کی تبلیغ کو وہ کامیابی نصیب ہوئی جو دنیا کی کسی تحریک کو بھی نصیب نہ ہو سکی ۔ قرآن کریم (۱۶ [النحل] : ۱۲۵) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظۂ حسنہ سے دعوت دینے کا حکم ہوا ہے : اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (۱۶ [النحل] : ۱۲۵) ، یعنی (اے پیغمبر ! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریقے سے ان سے بحث کیجیے۔یہ آیۂ کریمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طریقۂ تبلیغ، آپؐ کے اسلوب دعوت پر بخوبی روشنی ڈالتی ہے ۔ اس آیۂ کریمہ سے آپؐ کی حسب ذیل

تبلیغی خصوصیات واضح ہوتی ہیں : (۱) پہلا اصول جو اس کے ابتدائی جملے اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ سے مستنبط ہوتا ہے (مفتی محمد شفیع : معارف القرآن ، ۵ : ۴۰۸ بذیل آیۃ)، دعوت اسلامی میں تدریج کا لحاظ رکھنا ہے۔ آپؐ نے مکی اور مدنی دونوں ادوار میں ہمیشہ تبلیغ میں اس تدریج کے اصول کو ملحوظ خاطر رکھا ۔ اِسی بنا پر ۱۳ سالہ مکی دور میں صرف ارکان اسلام : توحید، رسالت ، معاد ، اور مسئلہ تقدیر کی تبلیغ کی گئی اور دوسرے احکام مدنی زندگی میں رفتہ رفتہ دیے گئے ۔ اس کی حکمت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ یوں بیان فرماتی ہیں کہ قرآن کریم میں جو پہلی سورت نازل ہوئی اس میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے ۔ جب معتدبہ لوگ اسلام کے دائرے میں آ گئے تو پھر حلال و حرام کے احکام دیے گئے ۔ اگر شروع میں امتناعی احکام آ جاتے تو لوگوں کو گراں گزرتے اور تعمیل میں تأمّل بلکہ انکار ممکن تھا (البخاری : الصحیح ، ۶/۶۶ ، ۳ : ۳۹۵) ۔ در اصل یہ طریقہ طبع انسانی کی گہری خصوصیات کے ادراک کا پتا دیتا ہے ۔ آسان سے مشکل کی طرف بڑھنا زیادہ مؤثر ہوتا ہے ۔ آپؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کی طرف روانہ کرتے وقت بھی تبلیغ میں اسی اصول تدریج کو ملوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی ؛ آپؐ نے فرمایا کہ پہلے ان کو توحید و رسالت کی دعوت دینا ؛ اگر وہ مان جائیں تو پھر ان کو نماز کی تعلیم دینا ؛ اگر وہ یہ بھی مان لیں پھر ان کو فریضۂ زکوٰۃ سے آگاہ کرنا (البخاری : ۴۴/۱ ، ۱ : ۳۵۲) ؛ (۲) آپؐ کی دوسری تبلیغی خصوصیت حکمت ہے ۔ حکمت کے یوں تو بہت سے مفہوم بیان ہوے ہیں ، مگر ابو حیان الاندلسی (صاحب بحر المحیط) کی یہ تعبیر عام طور سے قبول کی جاتی ہے کہ حکمت وہ کلام یا سلوک ہے جس میں اکراہ کا پہلو موجود نہ ہو اور طبع انسانی اسے فوراً قبول کرے اور وہ عقل و قلب ہر دو کو متأثر کرے ؛ حکمت اس درست کلام اور موثر طرز ابلاغ کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے اور مخاطب کو مسحور کر دے ؛ نیز دیکھیے مفتی محمد شفیع : معارف القرآن ، ۵ : ۴۰۸)۔ اس بارے میں آپؐ کو جو اختصاص و امتیاز حاصل تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب کے مشہور کاہن ضماد الأزدی نے جب آپؐ کا اثر انگیز خطبہ سنا تو اعتراف کیا کہ ایسا کلام نہ کاہنوں کے پاس ہے نہ جادو گروں اور شاعروں کے پاس؛ اس پر اس نے اسلام قبول کر لیا (احمد بن حنبل: مسند، ۱ : ۳۰۲)۔ مشہور شاعر اور رئیس دوس طفیل بن عمرو الدوسی (م ۱۱ھ/۶۳۲ء) کو کلام نبوی سن کر اعتراف کرنا پڑا : ماسمعت قولاً قطّ احسن منہ ، یعنی میں نے اس سے عمدہ کلام آج تک نہیں سنا ۔ غزوۂ حنین کے بعد جب انصار میں کچھ بد دلی پیدا ہوئی تو آپؐ کے پر اثر خطبہ سے ان کے جملہ شکوک و شبہات کا ازالہ ہوگیا ۔ (البخاری ، ۵۶/۵۶ ، ۳ : ۱۵۳ تا ۱۵۶ ؛ ابن حجر: فتح الباری، بذیل احادیث مذکورہ) ؛ (۳) آپؐ کی تیسری خصوصیت موعظۃ الحسنہ ہے ۔ موعظۂ کا مادہ وعظ ہے اور وعظ کے معنی ہیں کسی کی خیرخواہی کی بات کو اس طرح اس کے سامنے بیان کیا جائے کہ جس سے اس کا ناگوار حصّہ بھی قابل قبول ہو جائے اور مخاطب کا دل قبولیّت کے لیے نرم ہو جائے ؛ الحسنہ کے معنی ہیں کہ اس کا عنوان بھی ایسا ہو کہ جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو جائے (معارف القرآن، ۵ : ۴۰۹)۔ آپؐ کی تبلیغ و دعوت کی یہ بھی خصوصیت قابل ذکر ہے کہ آپؐ کا ظاہری اندازِ تبلیغ بھی ایسا دلکش اور جامع ہوتا تھا کہ سوائے ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے کوئی شخص بھی آپؐ سے دور نہ رہ سکتا تھا؛ اثر انگیزی کی اسی کیفیت سے متأثر ہو کر قریش مکہ نے آپؐ کو ”ساحر“ (جادوگر) کا نام دیا تھا ۔ خود رؤساے قریش

مثلاً ابوجہل ، ابو سفیان ، الاخنس بن شریق جیسے لوگ رات کو چھپ چھپ کر کلام الٰہی کی معجزاتی بلاغت کو سنتے اور سر دھنتے تھے (ابن ہشام : سیرۃ، ۱ : ۳۳۷ تا ۳۳۸) ۔ یہ اسی موعظۂ حسنہ کا اثر تھا کہ عمیر بن وہب الجمحی جو آپؐ کو قتل کرنے کی نیت سے گھر سے روانہ ہوا تھا آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر مشرف باسلام ہو گیا (کتاب مذکور ، ۲ : ۳۱۶ ببعد).

(۴) چوتھی خصوصیت آپؐ کی مجادلہ احسن ہے ۔ قرآن مجید میں دو قسم کے مجادلوں کا ذکر آتا ہے: (۱) مجادلۂ احسن اور (۲) مجادلۂ باطل۔ مجادلۂ باطل کو کفار و مشرکین کی طرف منسوب کیا گیا ہے ۔ جس سے مراد بلا کسی معقول دلیل کے اپنے موقف پر اصرار، غیر متعلق باتوں میں مسئلے کو الجھا دینے کا طریقۂ بےفائدہ کج بحثیوں میں تضیع اوقات ، اور خواہ مخواہ کی موشگافیاں کرنا ہے ۔ یہ ہمیشہ سے اہل باطل کا شیوہ رہا ہے ۔ اس کے برعکس اہل حق کو ابتداءً تو یہ تلقین کی گئی کہ جہاں تک ہو سکے معاملے کو مجادلے تک نہ پہنچنے دیں ۔ اگر مجادلے کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو مجادلے کو مجادلۂ احسن بنائیں، نیز ۱۶ [النحل] : ۲۵ جس کا مطلب ہے کہ مخاطب کے سامنے پہلے ان باتوں کو پیش کریں جن میں اصولی طور سے اشتراک ہے (۳ [آل عمران] : ۶۴) ؛ مخاطب کو مطمئن اور قائل کرنے کے لیے محبت ، اعتماد ، حسن اخلاق اور حسن استدلال سے کام لیا جائے (امین احسن اصلاحی : دعوت دین اور اس کا طریق کار ، ص ۱۱۵-۱۱۷) ۔ سیرت نبوی میں مدینہ منورہ کی زندگی میں آپؐ کا یہودیوں سے (سیرۃ النبی، ۱ : ۳۹۵ تا ۴۰۳) اور اہل نجران کے عیسائیوں سے مباحثہ ([رک به مباهله] ؛ ابن سعد : طبقات ، ۳۵۷ تا ۳۵۹) اس کی نمائندہ مثالیں ہیں.

۵- ایک اور خصوصیت قول لین ہے ۔ قول لین کا مطلب نرم بات ہے ۔ بلا شبہ مبلغ حق کی باتوں میں نرمی کے عنصر کا پایا جانا ضروری ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی ۔ قرآن مجید میں آپؐ کے اس وصف کا یوں ذکر کیا گیا ہے : فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (۳ [آل عمران] : ۱۵۹) ، یعنی پھر یہ اللہ کی رحمت کے سبب ہی سے ہے کہ آپؐ ان کے لیے نرم ہو گئے اور اگر آپؐ تند خو ، سخت طبع ہوتے تو لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے ۔ نرمی ، ملاطفت اور مہربانی کا برتاؤ آپؐ نے جو اپنے دشمنوں سے کیا اور جس نے ابو سفیان بن حرب ، عکرمہ بن ابی جہل ، عمرو بن وہب الجمعی ، ہند بنت عتبہ اور صفوان بن امیہ جیسے بےشمار لوگوں کی کایا پلٹ دی ، وہ دنیا کی تاریخ میں ایک مثال ہے آپؐ نے اپنے جانی دشمنوں کو بھی اپنی نرمی اور شیریں گفتار سے اپنا اور اسلام کا گرویدہ کر لیا.

۶- سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک اور تبلیغی خصوصیت تالیف قلب ہے ۔ یعنی آپؐ کا وہ سلوک ہے جو غیرمسلموں اور بعض نومسلموں کے ساتھ اس غرض سے آپؐ نے کیا کہ وہ اسلام کو شفقت اور حسن سلوک کا نمونہ خیال کریں ۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے اپنے قدیمی دشمنوں کی عام معافی کا اعلان فرمایا (السہیلی : روض الانف، ۲ : ۲۶۳ تا ۲۷۸) ۔ یہ اقدام تالیف قلوب میں معاون ہوا اور صرف چند دنوں میں دو ہزار قریش مسلمان ہو گئے ۔ غزوہ حنین کی فتح کے بعد مال غنیمت میں سے آپ نے بالخصوص نو مسلموں کو زیادہ حصہ دیا جس کا مقصد بھی تالیف قلب تھا ۔ تفصیل یہ ہے : (۱) ابو سفیان مع اولاد ۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی ، (۲) حکیم بن حزام ۲۰۰ اونٹ ، (۳) حارث بن ہشام ۱۰۰

اونٹ ، (۴) صفوان بن امیہ ۱۰۰ اونٹ ، (۵) قیس بن عدی ، ۱۰۰ اونٹ ، (۶) سہیل بن عمرو ۱۰۰ اونٹ ، (۷) اقرع بن حابس ۱۰۰ اونٹ ، (۷) عُیینہ بن حصن فزاری ۱۰۰ اونٹ ، (۹) مالک بن عوف ۱۰۰ اونٹ ۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ دیے گئے ۔ آپؐ کے اس طرز عمل نے ان لوگوں کو اور مخلص بنانے میں اہم کردار ادا کیا (الزرقانی : شرح المواهب اللدنية ، ۳ : ۳۵ تا ۴۲، ابن سعد : طبقات، ۲ : ۱۵۱ تا ۱۵۳، مطبوعہ بیروت).

۷۔ آپ کی تبلیغی زندگی کی اہم خصوصیت شفقت و رافت ہے ۔ آپؐ سے معاملہ کرنے والوں کا یہ متفقہ قول ہے کہ آپ مجسمہ شفقت و رافت تھے (۹ [التوبة] : ۱۲۸) ۔ آپؐ فرط رحمت سے امت کے عدم قبول حق کی وجہ سے مسلسل غم و فکر میں گھلتے رہتے ۔ جس پر قرآن کریم میں آپؐ کو تنبیہ کی گئی : فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (۱۸ [الکہف] : ۶)، یعنی کیا آپ اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے ۔ آپؐ کے متعلق صحابہؓ کرام کا یہ کہنا تھا کہ من رہ بداهة هابه و من خالطه معرفة احبه (شرح شمایل ترمذی ، ص ۱۲ ، مطبوعہ ۱۲۵۲ھ) ، یعنی جو کوئی آپؐ کو پہلی مرتبہ دیکھتا وہ آپؐ کے دبدبے سے مرعوب ہو جاتا اور جو آپؐ سے معاملہ کرتا وہ آپؐ سے محبت کرنے لگتا ہے ۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے زیادہ کسی کو مسکرانے والا نہ پایا (الترمذی : الجامع السنن ، ۲ : ۲۷۸)؛ اس سے آپؐ کی انسان شناسی اور فطرت انسانی کے وسیع ادراک کا پتہ چلتا ہے.

آپ کی تبلیغی زندگی میں جس وصف نے سب سے زیاد اہم کردار ادا کیا وہ آپ کی صفت عفو و درگزر اور حسن خلق ہے ۔ آپؐ نے اپنے سخت ترین دشمنوں کو عام معافی عطا فرمائی (سیرة النبی ، ۱ : ۵۱۵ ، ۵۲۰)؛ قتل کی نیت سے آنے والوں کو معاف فرمایا (ابن هشام ، سیرة ، ۲ : ۳۱۶)؛ اہل طائف کے ظلم و تعدی کے باوجود یہ کہ کر ان کو معاف کر دیا کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو مجھے امید ہے کہ ان کی اولاد اس سے بہرہ ور ہوگی (ابن حجر : فتح الباری ، ۶ : ۲۲۵) ۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں نے آپ کو لہولہان دیکھکر مشرکین کے حق میں بد دعا کرنے کی درخواست کی تو رحمت مجسم نے فرمایا: "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما، کیونکہ وہ نہیں جانتے (مسلم : الصحیح ، ۲ غزوہ احد) ۔ عبداللہ ابن ابی سرح ، عکرمہ بن ابی جہل ، ہند زوجہ ابو سفیان ، صفوان ابن امیہ ، وحشی بن حرب وغیرہ کو جس طرح معافی عطا کی گئی ہے وہ تاریخ عالم کا منفرد واقعہ ہے (سیرة النبی ، ۱ : ۵۲۱ ، ۵۲۲) اس کے علاوہ آپ کا مضبوط کردار ، آپ کا اپنی دعوت پر منفرد طرز عمل لوگوں کے دل و دماغ کو آپ کی تبلیغ کی طرف متوجہ کرنے میں بہت مددگار تھا ، کیونکہ آپ کے عمل میں آپ کے قول کی صداقت بڑی عمدگی سے دیکھی جا سکتی تھی.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغی زندگی کی خصوصیات اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی تمام زندگی ایک داعی اور مبلغ کی زندگی ہے ۔ اسلامی انقلاب کے پس منظر میں سب سے زیادہ جس عامل نے کام کیا وہ آپ کی تبلیغ تھی جو نفسیات انسانی کے عمیق مطالعے پر مبنی تھی ۔ ہر شخص کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا اصول آپؐ کی تبلیغی زندگی سے عنقا ہے ۔ حالات و طبائع میں فرق کے ساتھ آپ کے طریقہ تبلیغ میں تبدیلی آ جاتی تھی ۔ کلّموا الناس علی قدر عقولهم کا مقولہ ہمیشہ آپؐ کے پیش نظر رہا ۔

آپؐ نے ہر شخص سے وہی سلوک فرمایا جس کا وہ حق دار تھا ؛ آپؐ ہر شخص سے کامل بشاشت ، وفور مسرت اور مسکراتے چہرے کے ساتھ پیش آتے جس سے لوگوں کے دل باغ باغ ہو جاتے ۔ اگر مخاطب ترش روئی ، تند خوئی سے پیش آتا آپ قطعاً برا نہ مناتے ؛ اگر نازیبا گفتگو کرتا آپؐ تحمل فرماتے ۔ ایک شخص کو آپؐ نے اسلام کی دعوت دی ، اس نے کہا کہ مجھے سب باتیں منظور ہیں مگر میں فلاں کام نہیں چھوڑ سکتا ۔ یہ سن کر بعض صحابہ ناراض ہوے، مگر آپ نے مسکراتے ہوے اسے اپنے قریب بلایا اور نرمی سے اس کام کی قباحت ذہن نشین کرا دی کہ وہ خود ہی اس سے تائب ہوگیا ۔ ایک بدو نے مسجد نبوی کے ایک گوشے میں پیشاب کر دیا ۔ صحابہؓ اس کو مارنے کے لیے دوڑے ، مگر آپ نے منع فرما دیا ۔ جب وہ حاجت سے فارغ ہوگیا تو نہایت نرمی اور پیار سے اسے مسجد کی عزت و حرمت سے آگاہ فرمایا ۔ ایک بدو ضمام بن ثعلبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی قسمیں دے کر آپ سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ اللہ کے فرستادہ ہیں ۔ آپؐ نے تحمل سے جواب دیا ۔ اس نے اپنے اکھڑ انداز میں اور بھی کئی سوالات کیے ، مگر آپ نے کامل بشاشت سے جواب دیا ۔ جب وہ چلا گیا تو آپؐ نے اس کی درشتگی کو نظر انداز کرتے ہوے اس کی سادہ لوحی اور جذبہ اخلاص کی تعریف فرمائی (ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۹۹، البخاری ، کتاب الایمان).

اختتام : بعض مستشرقین آپؐ کو محض ایک لیڈر اور ہیرو کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں القاب درست نہیں ، اس لیے کہ آپؐ نبی اور رسول تھے جو تائید ایزدی سے بہرہ ور تھے ۔ دوم آپ کا نصب العین کسی دنیوی قائد کی طرح مادی نہ تھا ، بلکہ روحانی تھا ۔ سوم اس کے لیے کہ آپ سارے عالم کے لیے تھے کسی گروپ کے لیے تھے۔

مآخذ : متن مقالہ میں مذکور ہیں (محمود الحسن عارف رکن ادارہ نے لکھا).

(ادارہ)

میثاق مدینہ : میثاق مدینہ انحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بصیرت الہامی کا شاہکار ہے ۔ ایک عظیم الشان ریاست کی تأسیس اور تدبیر و تنظیم سرور دو عالم کا وہ کارنامہ ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی ۔ ایک ایسا شخص جسے اپنے ہم وطنوں نے وطن چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا ہو ، ہجرت کے سفر کی مشکلات برداشت کرتے ہوے یثرب (مدینہ) پہنچتا ہے اور اس شہر کے چند محلوں پر مشتمل ایک شہری ریاست قائم کرتا ہے.

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے قبائلی عصبیت و قومیت کے بت کو پاش پاش کرکے اس کی جگہ ایک عالم گیر برادری قائم کی ۔ رنگ ، نسل ، خاندان ، زبان اور وطن سے بالاتر ایک امت اور ملت کا قیام عمل میں لائے ۔ غیر مسلموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے حقوق و فرائض کا تعین کیا ؛ ریاست اور شہریوں کے حقوق و فرائض کی نشاندھی کی ۔ انصاف اور قانون کی حکومت قائم کی اور قانون کے سامنے مساوات کا اصول تسلیم کیا ۔ انتظامیہ ، مقننہ اور عدلیہ کے اصول و ضوابط مرتب کیے ۔ الغرض انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر اور فلاح و بہبود نیز ایک اعلیٰ و ارفع اسلامی فلاحی مملکت کے قیام کے سلسلے میں ، جتنے بھی ضروری اقدامات ہو سکتے ہیں ، کیے گئے ۔

ایک نئی ریاست کی تاسیس و تشکیل کے سلسلے میں میثاق مدینہ کو بڑی اہم اور بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف

لائے تو بہت سے مسائل کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت تھی مثلاً : (۱) مسلمانوں کو یکجا اور متحد کرنے کا مسئلہ ؛ ۲۔ مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی اصلاح و تربیت کا مسئلہ؛ (۳) مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات کو مضبوط کرنے کا مسئلہ۔ اس وقت مدینے میں یہود کے دس قبائل اور اوس و خزرج کے بارہ قبائل آباد تھے۔ اوس و خزرج میں مسلمان بھی تھے اور بت پرست بھی ۔ اوس و خزرج اسلام کی آمد سے پہلے باہم ایک خونریز جنگ میں مبتلا رہ چکے تھے جسے جنگ بُعاث کہا جاتا ہے ؛ (۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور اس کے تحفظ و دفاع کا انتظام.

سرور دو عالمؐ نے حکمت نبوی سے ان تمام مسائل کو پوری کامیابی سے اس طرح حل کیا : (۱) مسلمانوں کو رنگ و نسل کے امتیازات سے بالاتر کر کے انھیں رشتۂ اخوت [مؤاخات ، رکّ بآں] میں منسلک کر دیا اور ایک ایسی نئی ملت تیار کی جو خالص دینی اور انسانی اقدار پر مبنی تھی۔ اسے ایک خدا ، ایک رسول ، ایک قوم اور ایک ہی مقصد زندگی سے وابستہ کر دیا ؛ (۲) مسلمانوں کی روحانی و معاشرتی تربیت و اصلاح اور ان میں مرکزیت پیدا کرنے کے لیے مسجد نبوی کی تعمیر کی اور اسے اہل اسلام کی روحانی ، سماجی ، تعلیمی و عدالتی سرگرمیوں کا مرکز و محور قرار دیا ؛ (۳ ، ۴) مدینے میں بسنے والے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کو متعین و منضبط کرنے کے لیے نیز اس شہر کی سیاسی تنظیم اور تحفظ و دفاع کے لیے ایک ایسا تحریری معاہدہ کیا جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے.

آپ نے اس معاہدے کی اہمیت کے پیش نظر اسے تحریر کروایا ۔ اس میثاق کے لیے آپ نے "کتاب" اور "صحیفے" کے الفاظ استعمال فرمائے جس سے اس دستاویز کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اپنی کتاب "The First Written Constitution in the World" (لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۴ تا ۹) میں مضبوط دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ میثاق مدینہ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور ہے جسے خود ریاست کے حاکم اعلٰی نے نافذ کیا (نیز رکّ بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ حیثیت متن).

میثاق مدینہ کی تفصیلات کا علم ہمیں مختلف بنیادی اور ثانوی مآخذ و مصادر سے ہوتا ہے؛ وہ اہم بنیادی مآخذ جنھوں نے اس معاہدے کی مکمل تفصیلات درج کی ہیں : (۱) محمد بن اسحاق : سیرت النبی (جس کا فارسی اور انگریزی ترجمہ دستیاب ہے) ؛ (۲) ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ؛ (۳) ابو عبید القاسم بن سلام : کتاب الاموال ؛ اور (۴) ابن کثیر : البدایۃ و النہایۃ ۔

ابن سعد ، البلاذری ، ابن جریر الطبری ، ابن خلدون اور دیگر قدیم مؤرخین نے اس معاہدے کی تفصیلات درج نہیں کیں ۔ البتہ اس کا ذکر ضرور کیا ہے ۔ احادیث کی کم و پیش جملہ اہم کتب میں بھی اس معاہدے کا ذکر ہے ، مگر تفصیلات نہیں ہیں ۔ الزرقانی ، المقریزی اور لسان العرب کے مصنف ابن منظور نے بھی میثاق مدینہ پر جزوی روشنی ڈالی ہے.

ثانوی مآخذ میں زیادہ اہم یہ ہیں :

(۱) محمد حمید اللہ : الوثائق السیاسیۃ ، جس کا اردو ترجمہ "سیاسی وثیقہ جات" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے) ؛ (۲) وہی مصنف : عہد نبوی میں نظام حکمرانی ؛ (۳) وہی مصنف *"The First Written Constitution in the World"* ، لاہور ۱۹۷۵ء ؛ (۴) Leone Caetani : *Annali dell' Islam* (۵) : Wellhausen *Gemeni deardung Von Skizzen aud vordrbaten Medina,* (۶) : منٹگمری واٹ : *Muhammad at Medina* ؛ (۷) مجید خدوری : *The Law of War and Peace in Islam* ، لندن ؛

(۸) لیوی: *Social Structnre of Islam* ؛ (۹) قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری : رحمۃ للعالمین؛ (۱۰) امیر علی: *The Spirit of Islam* ؛

اس معاہدے کے مستند اور ثقہ ہونے میں کوئی شک نہیں ۔ بعض اہل علم کا یہ اعتراض کہ اس معاہدے کے ضمن میں محمد ابن اسحاق اپنے سے پہلے راویوں کا ذکر نہیں کرتا ، دیگر قوی تاریخی شواہد کی بنا پر رفع ہو جاتا ہے ۔ ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ/۸۳۸ء) بڑے پائے کے قابل اعتماد ، ثقہ اور قدیم عالم ہیں ۔ انھوں نے یہ معاہدہ ابن شہاب الزہری (۵۸ھ/۶۷۶تا۱۲۴ھ/۷۴۲ء) کی سند سے بیان کیا ہے ۔ اس سلسلے میں ان کی "کتاب اموال" (۱ : ۳۵۹ ، اسلام آباد) میں یہ عبارت درج ہے : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عہد نامہ جو آپؐ نے مدینہ منورہ تشریف آوری پر اہل ایمان اور اہل مدینہ کے درمیان لکھوایا ، جس میں مدینے کے یہود سے مصالحت کا پیمان بھی ہے ، ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھے روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ معاہدہ تحریر فرمایا :

اس معاہدے کی ایک اہم شق کہ بنی عوف کے یہود بذات خود اور اپنے خلفا و موالی کے ساتھ مل کر مسلمان کے ساتھ ایک امت ہوں گے . . ." کی وضاحت کرکے ابو عبید نے بعد میں آنے والے محدثین کی الجھن دور کر دی ۔ امام موصوف کہتے ہیں : معاہدے کی اس شق سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ دشمنان اسلام کے خلاف (جنگ کی صورت میں) شرط کے مطابق اخراجات کے ذریعہ مسلمانوں کی مدد کرتے رہیں گے ۔ رہ گیا دین کا مسئلہ ، سو وہ بالکل جداگانہ ہے ۔ اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۔ یہی سبب ہے کہ اس سے آگے بھی آپ نے تصریح فرما دی کہ یہود اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور اہل ایمان اپنے دین پر (کتاب مذکور ، ۱ : ۳۶۴) ۔ المقریزی کے بیان کے مطابق یہ تحریر شدہ دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تلوار سے لٹکا رہتا تھا ۔ آنحضرتؐ کے بعد یہ تلوار حضرت علیؓ کو ملی ۔ حضرت علیؓ نے لوگوں کو اس دستاویز کے حصے کوفہ میں پڑھ کر سنائے (المقریزی ، امتاع الاسماع (مطبوعہ قاہرہ ۱ : ۴۹ ، ۱۰۴ ، ۱۰۷ ؛ محمد حمید اللہ : *The First Written Constitution in the World* ، ص ۳۹ تا ۴۰ ، ۶۸).

اس معاہدے کے مستند ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ پوری عبارت میں کوئی بھی ایسی شق نہیں جو اسلام کی پالیسی یا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو ؛ مزید براں یہ ایک مسلسل اور مربوط عبارت ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مصنف ایک ہی تھا. پھر دور حاضر کے کم و بیش جملہ مسلمان اہل علم اور مستشرقین اس میثاق کے مستند ہونے کے قائل ہیں.

معاہدے کی تاریخ : اس معاہدے کی تاریخ کے بارے میں قدیم مؤرخین و محدثین کے ہاں کوئی واضح اختلاف نہیں پایا جاتا ۔ سبھی اسے ہجرت مدینہ کے فوری بعد اور غزوۂ بدر سے پہلے کا معاہدہ قرار دیتے ہیں ۔ امام ابو عبید کی رائے سب سے وزنی معلوم ہوتی ہے ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں : ہماری رائے میں یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے آغاز کے وقت کیا گیا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کو استحکام و غلبہ حاصل نہیں ہوا تھا ؛ نہ اس وقت تک اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم صادر ہوا تھا ۔ یہ (مدینہ کے) اہل کتاب تین گروہوں پر مشتمل تھے : بنو قینقاع ، بنو نضیر اور بنو قریظہ (کتاب الاموال ، ۱ : ۳۶۴) ۔ دور جدید کے اہل علم نے میثاق مدینہ کی تاریخ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے ۔ ولہاؤزن اور کائتانی اسے غزوہ بدر سے پہلے کی ہی دستاویز قرار دیتے ہیں ؛ اسی طرح

مجید خدوری بھی بڑے یقین سے اسے غزوہ بدر سے پہلے کی دستاویز قرار دیتا ہے (دیکھیے *The Law of War and Peace in Islam*، ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۶)۔

محمد حمید اللہ نے اس معاہدے کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے اور یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کا پہلا حصہ غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے اور دوسرا حصہ غزوۂ بدر سے بعد کا؛ انھوں نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور مضبوط عقلی دلائل دیئے ہیں، لیکن قدیم مآخذ سے کوئی واضح حوالہ نہیں دیا (دیکھیے *The First Written Constitution in the World*، ۲۲ تا ۲۶)۔

مقالہ نگار کی رائے میں یہ معاہدہ مکمل طور پر غزوۂ بدر سے پہلے ہی لکھا گیا۔ بنو قینقاع جو اس معاہدے کے ایک فریق تھے، انھیں غزوۂ بدر کے ایک ہی ماہ بعد، اس معاہدے کی خلاف ورزی کرنے پر، مدینے سے نکال دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نے اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ان بنی قینقاع کانوا اول یہود نقضوا ما بینھم و بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و حاربوا فیما بین بدر و احد "(ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ، قاہرہ ۱۹۳۴ء، ۳: ۵۱)، یعنی یہود میں سے بنو قینقاع پہلی جماعت تھی جس نے اس معاہدے کو توڑا جو ان کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے درمیان ہوا تھا اور انھوں نے بدر و احد کی درمیانی مدت میں لڑائی کی۔ اسی طرح کا بیان ابن سعد نے بھی دیا ہے (دیکھیے طبقات، بیروت ۱۹۵۷ء، ۲: ۲۹)۔ یہ عبارت اس بات کو پوری طرح سے واضح کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جملہ یہود سے، جن میں بنو قینقاع بھی موجود تھے، یہ معاہدہ غزوۂ بدر سے پہلے ہی کیا تھا۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ معاہدے کے متن میں باقاعدہ طور پر بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کا نام درج نہیں ہے۔ تو اس کا ایک واضح جواب یہ ہے کہ ان قبائل کو اوس و خزرج کے حلفا کی صورت میں معاہدے میں شریک کیا گیا۔ ان تینوں قبائل کا اوس و خزرج کے ساتھ حلیف ہونا مضبوط تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے۔ ابن ہشام کی درج ذیل عبارت اس معاہدے پر خوب روشنی ڈالتی ہے:

"فکانوا اذا کانت بین الاوس و الخزرج حرب خرجت بنو قینقاع مع الخزرج و خرجت النضیر و القریظہ مع الاوس یظاھر کل واحد من الفریقین حلفاء علی اخوانہ" (ابن ہشام، ۲: ۱۸۸)۔ یعنی جب کبھی اوس و خزرج میں لڑائی ہوتی تو بنو قینقاع خزرج کے ساتھ نکلتے اور بنو نضیر اور قریظہ اوس کے ساتھی بن کر نکلتے اور ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک اپنے حلیفوں کی مدد کرتا تھا بمقابلہ ان کے (یا اپنے) بھائیوں کے)۔

میثاق مدینہ کا متن: ابن ہشام اور کتاب الاموال میں درج شدہ میثاق مدینہ چھوٹے بڑے ملے جلے فقروں پر مشتمل ہے۔ دور جدید کے اکثر اہل علم نے ان فقروں کو دستوری دفعات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ولہاؤزن نے اس دستاویز کو ۴۷ دفعات پر منقسم کیا ہے۔ اکثر مغربی مؤرخین نے اسی تقسیم کو تسلیم کیا ہے۔ محمد حمید اللہ نے اس دستاویز کی باون دفعات گنوائی ہیں، لیکن قارئین کو جو یورپی مآخذ کا مطالعہ بھی کرتے ہیں، الجھن سے بچانے کے لیے ان دفعات کی تعداد ۴۷ ہی رکھی ہے اور بعض بڑی دفعات کو الف اور ب دو اجزا پر تقسیم کر دیا ہے۔

یہ معاہدہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے: پہلے حصے میں تئیس دفعات ہیں اور دوسرے میں چوبیس۔ پہلا حصہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور حقوق و فرائض کی نشاندھی کرتا ہے، جبکہ دوسرا حصہ اہل اسلام اور یہود اور دیگر اہل مدینہ کے باہمی تعلقات، حقوق و فرائض اور دیگر اہم امور کی وضاحت کرتا ہے۔

مقالہ نگار کے نزدیک چونکہ امام ابو عبید القاسم بن سلام کا متن سب سے زیادہ مستند ہے ، اس لیے ذیل میں وہی درج کیا جاتا ہے، [البتہ ابن ہشام کا متن بھی جو اس سے کسی جگہ مختلف ہو جاتا ہے ، بڑی بریکٹوں کے درمیان اضافہ کر دیا گیا ہے]:

(۱) یہ محمد نبی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا عہد نامہ ہے جو قریشی اور مدنی مسلمانوں کے درمیان ، نیز ان لوگوں کے درمیان جو ان کی پیروی کر کے ان میں اس طرح آ ملیں اور ان کے ساتھ رہیں کہ ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں ، کے درمیان طے پایا ؛ (۲) یہ سب لوگ مل کر دوسرے لوگوں سے الگ ہو کر ایک امت قرار پائیں گے ؛ (۳) قریشی مہاجرین اپنے نظام قبیلہ کے مطابق باہم اپنی دیتیں ادا کریں گے ؛ اسی طرح وہ اپنے قیدیوں کا فدیہ مومنوں اور مسلمانوں میں مروجہ دستور و انصاف سے ادا کریں گے ؛ (۴) بنو عوف اپنے نظام قبیلہ کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدیوں کو واگزار کروانے کے لیے مسلمانوں میں مروجہ دستور اور عدل و انصاف کے مطابق فدیہ دے گا] ؛ (۵) بنو الحارث [بن خزرج] اپنے نظام کے مطابق اپنی پہلی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں میں مروجہ دستور و انصاف کے مطابق دے گا؛ (۶) بنو ساعدہ؛ (۷) بنو جشم؛ (۸) بنو نجار ؛ (۹) بنو عمرو بن عوف ؛ (۱۰) بنو نبیت اور (۱۱) بنو اوس اپنے اپنے نظام کے مطابق اپنی دیتیں ادا کریں گے اور ان کا ہر گروہ اپنے قیدی کا فدیہ مسلمانوں کے مروجہ دستور و انصاف کے مطابق دے گا ؛ [آخر کی عبارت ہر جگہ دہرائی گئی ہے] (۱۲) اہل ایمان اپنے کسی زیر بار قرضدار کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے ، بلکہ قاعدے کے مطابق فدیہ ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے ؛ (۱۳) اور یہ کہ تقویٰ شعار مسلمان متحد ہو کر ہر اس شخص کی مخالفت کریں گے جو ان میں سے مومنوں کے درمیان ظلم ، گناہ ، زیادتی ، سرکشی اور فساد و بغاوت کا موجب ہوگا ؛ وہ سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے خواہ وہ ظالم ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو ؛ (۱۴) کوئی مؤمن کسی مؤمن کو کافر کے عوض قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مؤمن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا؛ (۱۵) سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے مددگار و کارساز ہوں گے ؛ (۱۶) یہودیوں میں سے جو بھی ہمارا تابع ہو جائے گا اس کے ساتھ دستور کے مطابق معاملہ و انصاف و مساوات کا سلوک روا رکھا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ؛ نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی ؛ (۱۷) مسلمانوں کی صلح یکساں اور برابر کی حیثیت رکھتی ہے ؛ کوئی مسلمان قتال فی سبیل اللہ میں دوسرے مسلمان سے الگ ہو کر صلح نہیں کرے گا ؛ اسے مسلمانوں کے درمیان مساوات و عدل ملحوظ رکھنا ہوگا ؛ (۱۸) ہر غازی جماعت کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے ؛ (۱۹) تقوی شعار مسلمان اس معاہدے کی شرائط پر کاربند رہیں گے؛ (۲۰) کوئی مشرک [یہودی] قریش کے مال کو پناہ نہیں دے گا اور نہ کسی مسلمان کے مقابلے میں وہ قریش کی مدد کرے گا ؛ (۲۱) جو کسی مؤمن کا ناحق خون کرے گا اسے مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا ، اِلّا یہ کہ اس مقتول کا ولی اس کے عوض خون بہا لینے پر رضامند ہو جائے اور تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف رہیں گے ؛ (۲۲) کسی مؤمن کے لیے جو اس معاہدے کی پابندی کا اقرار کر چکا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان لا چکا ہے ، یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی قانون شکن کی مدد کرے یا اسے پناہ دے ؛ جو ایسے مجرم کی مدد کرے گا یا پناہ دے گا تو اس پر قیامت کے دن تک اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کا غضب ہو ؛ اس سے نہ بدلہ

قبول کیا جائے گا اور نہ فدیہ؛ (۲۳) اور تم لوگ جب بھی کسی معاملے میں باہم اختلاف کرو گے تو اس کے فیصلے کے لیے اللہ تبارک و تعالٰی کی طرف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

[یہاں تک کی دفعات اہل اسلام کے باہمی معاملات سے متعلق تھیں۔ سطور ذیل کی دفعات غیر مسلم قبائل سے تعلقات کی نوعیت بیان کرتی ہیں:] (۲۴) مسلمان جب تک جنگ میں مصروف رہیں گے جنگی اخراجات میں یہودی ان کے شریک رہیں گے؛ (۲۵) بنو عوف کے یہود بذات خود اور اپنے حلیفوں اور موالی کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق اور جماعت ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر کاربند رہیں گے اور مسلمان اپنے دین پر، البتہ جس نے ظلم و گناہ کیا وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو مصیبت میں ڈالے گا؛ (۲۶) بنی نجار، (۲۷) بنو حارث؛ (۲۸) بنو ساعدہ (۲۹) بنو جُشم؛ (۳۰) بنو اوس (۳۱) اور بنو ثعلبہ کے یہود کے لیے بھی وہی کچھ (مراعات، فرائض) ہے جو یہود بنی عوف کے لیے ہے۔ (آخر کی عبارت ہر جگہ دہرائی گئی ہے)، لیکن ان میں سے جس نے ظلم و زیادتی کی تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے گھروالوں کو تباہی میں ڈالے گا؛ [(۳۲) یہ کہ بنو ثعلبہ کا بطن (شاخ) بنو جفنہ بھی بنو ثعلبہ کی طرح ہوں گے (۳۳) اور یہ کہ بنو شُطیبہ کے لیے بھی وہی کچھ ہے جو یہود بنی عوف کے لیے ہے، اور یہ کہ نیکی گناہ سے الگ ہوگی؛ (۳۴) بنو ثعلبہ کے موالی (حلفاء وغیرہ) حقوق و فرائض میں انہی کی طرح ہوں گے؛ (۳۵) اور یہ کہ یہودیوں کی کوئی شاخ ان کی ہی طرح ہوگی؛] ، (۳۶) اور ان قبائل میں سے کوئی فرد حضرت محمد صلی اللہ و آلہ وسلم کی اجازت کے بغیر [مدینہ سے ، معاہدے سے] باہر نہیں نکلے گا؛ (۳۶ ب) [اور یہ کہ کوئی شخص زخم (جرم) کا بدلہ لینے سے مانع نہیں ہوگا اور جو کوئی کسی کو قتل کرے گا پس وہ خود کو اور اپنے اہل خاندان کو ہی ہلاک کرے گا]؛ (۳۷) اور یہ کہ اہل اسلام پر اپنے اخراجات اور یہود پر اپنے اخراجات واجب ہوں گے؛ نیز جو اس معاہدے کے شرکا سے جنگ کرے گا تو تمام شرکا اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے؛ (۳۷ ب) وہ آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں گے اور ہر حال میں مظلوم کی مدد کریں گے؛ (۳۸) [اور یہ کہ یہودی جب تک مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے اپنا خرچہ برداشت کریں گے؛ (۳۹) اس معاہدے والوں کے لیے مدینہ کی حدود کا داخلی علاقہ حرم کی حیثیت رکھے گا؛ [(۴۰) اور یہ کہ ہمسایہ اپنے آپ کی طرح ہوگا، نہ اسے نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ اس پر زیادتی کی جائے گی]؛ (۴۱) [اور یہ کہ کسی کی زیر کفالت چیز کو اس کی اجازت کے بغیر پناہ نہ دی جائے گی؛ (۴۲) اس معاہدے والوں کے درمیان جو بھی نیا معاملہ یا قانون شکنی کا واقعہ پیش آئے گا جس سے نقصان اور فساد کا امکان ہو تو اس کے فیصلے کے لیے اللہ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے گا [اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس صحیفے میں نیکی اور تقوی کے مضمون پر گواہ ہیں۔]؛ (۴۳) قریش اور ان کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دے گا؛ (۴۴) اور جو کوئی یثرب (مدینہ منورہ) پر یلغار کرے گا تو یہ معاہدہ کرنے والے باہمی امداد سے اس کا مقابلہ کریں گے؛ (۴۵) ان (مسلمانوں) میں سے جو اپنے حلیف کے ساتھ صلح کرنے کے لیے یہود کو دعوت دے تو یہود اس سے صلح کریں گے۔ اسی طرح اگر وہ (یہود) ہمیں کسی ایسی ہی صلح کی دعوت دیں تو مسلمان بھی اس دعوت کو قبول کریں گے، بشرطیکہ وہ حلیف دین (اسلام) سے برسر پیکار نہ ہوں؛ (۴۵ب) اخراجات میں تمام

لوگ اپنے حصے کے ذمہ دار ہوں گے ؛ (۴۶) قبیلۂ اوس کے یہود بذات خود اور ان کے حامی اور حلیف اس عہد نامے پر خوبی و عمدگی سے عمل پیرا ہونے والوں کے ساتھ رہیں گے ۔ گناہ کی حدود سے ورے نیکی اور وفاداری ہے : ہر کام کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا ؛ زیادتی کرنے والا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا ۔ اس معاہدے پر سچائی اور نیکی سے کاربند رہنے والوں کا اللہ مددگار ہوگا ؛ (۴۸) یہ معاہدہ ظالم اور گناہ گار کو اس کے عمل بد کے انجام سے نہیں بچائے گا ؛ جو (مدینے سے) باہر نکل جائے گا وہ مامون رہے گا اور جو (مدینے میں) بیٹھا رہے گا وہ بھی مامون ہوگا ، لیکن جو ظلم و گناہ کرے گا وہ مامون نہیں رہے گا ۔ اللہ اور اس کا رسول نیکوکار اور متقی لوگوں کے حامی و محافظ ہیں (کتاب الاموال ، ۱ : ۳۵۹ تا ۳۶۵ ؛ محمد حمیداللہ : الوثائق السیاسیہ ، ص ۱۵ تا ۲۱ ؛ ابن ہشام ، سیرۃ ، ۲ : ۱۴۹ ببعد).

میثاق مدینہ کی اہمیت و افادیّت : میثاق مدینہ کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس معاہدے کی اہمیت و افادیت کے بارے میں جو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں : (۱) اس معاہدے کی بدولت مدینے کی شہری ریاست کا آغاز ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی طرف سے اس ریاست کے سربراہ تسلیم کر لیے گئے اور اس طرح ایک بین الاقوامی معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہو گئے ؛ (۲) اس معاہدے کی بدولت ، بقول سرولیم میور ، آپؐ نے ایک عظیم مدبّر اور سیاست دان کی طرح مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ اور آپس میں منتشر لوگوں کو متحد اور یکجا کرنے کا کام بڑی مہارت سے سرانجام دیا ۔ آپؐ ایک ایسی ریاست اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جو بین الاقوامی اصول پر مبنی تھا (دیکھیے سید امیر علی : *The Spirit of Islam* ، کراچی ۱۹۶۹ء ، ص ۵۸) ؛ (۳) اس میثاق کی بدولت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے عدالتی ، تشریعی ، فوجی اور تنفیذی اختیارات اپنے اور اہل اسلام کے لیے محفوظ کر لیے ؛ (۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے سیاست میں اخلاقی عناصر کو داخل کیا ۔ اصل سرچشمۂ اقتدار اللہ تعالیٰ کو قرار دیا اور خود اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت اختیار کی ؛ (۵) حقوق شہریت، تنظیم حکومت، سیاسی رواداری ، فراست اور حکمت عملی کا عمدہ اظہار بھی اسی معاہدے کے ذریعے سے ہوا ؛ (۵) اسی معاہدے کی بدولت مذہبی آزادی کا اصول وضع ہوا ۔ نیز جن بنیادوں پر غیر مسلموں سے اتحاد و تعاون ہو سکتا ہے اس کی نشاندہی ہوئی ؛ (۷) اسی معاہدے نے اہل اسلام کے باہمی حقوق و فرائض اور جملہ شہریوں کے آپس میں تعلّقات ، فرائض اور حقوق کا تعین کیا ؛ (۸) اسی معاہدے نے ظلم ، ناانصافی ، عدم مساوات اور ایسی ہی دیگر خرابیوں کا سدّباب کیا ۔ عربوں کے قتل کا بدلہ لینے کا پرانا انفرادی طریق ختم کرکے اسے اجتماعی فریضہ قرار دیا ؛ کمزوروں ، ناداروں اور مظلوموں کی داد رسی کا پورا پورا اہتمام بھی اسی معاہدے کی رو سے ہوا ؛ (۹) حالت امن اور حالت جنگ کا لائحہ عمل مرتب ہوا ؛ (۱۰) یہ معاہدہ قریش کے خلاف ایک مشترکہ اتحاد بن گیا اور دشمنان اسلام کا داخلہ مدینہ منورہ میں بند کر دیا گیا ؛ (۱۱) مدینے کو حرم قرار دیا گیا اور یوں اس نئی شہری ریاست کی حرمت قائم ہوئی ؛ نیز اس کے داخلی امن اور تحفظ و دفاع کا خاطر خواہ انتظام ہوا ؛ (۱۳) قبائل کی باہمی خانہ جنگی کا انسداد بھی اسی معاہدے کی بدولت ہوا ؛ (۱۴) اسی معاہدے نے اہل اسلام کے بڑے دشمن مشرکین مکہ کو دوسرے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف

بر انگیختہ کرنے سے روک دیا ؛ (۱۵) اسی معاہدے نے شہریوں کے اندر قانون ، اخلاق ، مذہب اور انسانی قدروں کے احترام کا بھرپور جذبہ پیدا کیا ؛ (۱۶) اسی معاہدے نے اللہ تعالٰی کے احکام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فیصلوں کو حتمی اور فائق حیثیت دے دی ؛ (۱۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جاری کردہ اسی نظام کی بدولت ایک مضبوط اسلامی ریاست اور ایک صالح معاشرہ معرض وجود میں آیا ۔ [نیز رک بہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بحیثیت مقنّن؛ آپؐ کا نظام حکمرانی؛]

مآخذ : (۱) ابو عبیدالقاسم بن سلام : کتاب الاموال ، اردو ترجمہ، مطبوعۂ اسلام آباد، ۱: ۳۵۹تا۳۶۵؛ (۲) ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ ، قاہرہ ۱۹۳۶ء، ۲:۴۷، تا ۱۵۰ ؛ (۳)ابن کثیر:البدایۃ و النہایۃ، مطبوعۂ قاہرہ ۱۹۳۲ء، ۳:۲۲۴ تا ۲۲۶ ؛ (۴) ابن اسحاق : سیرۃ رسول اللہؐ ، لنڈن ۱۹۵۵ء انگریزی ترجمہ از A. Guillaume ، ص ۲۳۱ تا ۲۳۳ ؛ (۵) محمد حمید اللہ: *The First Written Constitution in the World* ، لاہور ۱۹۷۵ء ؛ (۶) وہی مصنف : الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی و الخلافۃ الراشدہ ، بیروت ۱۹۶۹ء [ص ۱۵ تا ۲۱] ؛ (۷) وہی مصنف : عہد نبوی میں نظام حکمرانی، حیدر آباد دکن، ص ۷۶تا ۱۱۱؛ (۸) Montgomery Watt : *Muhammad at Medina* ، لنڈن ۱۹۵۶ء، ص ۲۲۱ تا ۲۲۸ ؛ (۹) مجید خدوری : *War and Peace in the Law of Islam* ، نیویارک ۱۹۵۵ء؛ (۱۰) Reuben Levy : *The Social Structure of Islam*، کیمبرج ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۱تا ۲۷۶ ؛ (۱۱) ابن سعد : الطبقات ، بیروت ۱۹۵۷ء ، ۲ : ۲۹؛ (۱۲) المقریزی : امتاع الاسماع ، قاہرہ ، ۱ : ۴۹ ، ۱۰۴ ، ۱۰۷ ؛ (۱۳) سید امیر علی : *The Spirit of Islam* ، کراچی ۱۹۶۹ء ، ص ۵۸تا۵۹؛(۱۴) قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری : رحمۃ للعالمین ، لاہور ، ۱ : ۱۱۵ تا ۱۱۷۔

(امان اللہ خان [و ادارہ])

معاہدات عہد نبوی ، صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم : ⊗ معاہدات ، جمع معاہدہ از باب مفاعلہ (مادہ ۔ ع ۔ ہ ۔ د) ، یعنی قسم کھا کر پختہ عہد کرنا ۔ یہ عموماً فریقین میں طے پاتا ہے [تفصیل کے لیے دیکھیے ابن منظور : لسان العرب، بذیل مادہ] ۔ معاہدات عہد نبویؐ کا اطلاق ان معاہدات پر ہوتا ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہجرت کے بعد اور بالخصوص قیام ریاست مدینہ کے بعد [مختلف اقوام و ملل سے کیے گئے ۔ یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت مبارکہ کا اصل مقصد اعلاے کلمۃ اللہ تھا (۹ [التوبۃ] : ۳۳ ؛ ۴۸ [الفتح] : ۲۸ ؛ ۶۱ [الصف] : ۹) ، جنگ ایک ناگزیر لائحہ عمل تھی اور صرف ایسے مجبوری کے مواقع پر یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جب کہ مخالفین کسی طرح راہ راست پر نہ آتے تھے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پوری طرح کوشش فرماتے کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے : چنانچہ اس مقصد کے تحت آپؐ خود بھی اور آپؐ کے جان نثار بھی عین میدان جنگ میں مخالفین کے سامنے شرائط صلح پیش کرتے ۔ اگر مخالفین ان میں سے کوئی ایک شرط قبول کر لیتے تو ان سے جنگ فوراً بند کر دی جاتی ۔ لڑائی کے دوران میں بھی اگر کوئی صلح کی درخواست کرتا تو آپؐ شرف قبول بخشتے ۔ اسی بنا پر ، صلح اور اس کے معاہدات مزاج نبوی کے عین مطابق ہیں ، کیوں کہ آپؐ کا اصلی مشن امن و امان کا قیام اور عدل و انصاف کا اجرا و نفاذ تھا ۔ صلح حدیبیہ میں آپؐ نے صحابہ کرامؓ کی ناگواری کے باوجود بعض ایسی شرائط بھی قبول فرمائیں ، جو بظاہر آپؐ کے خلاف جاتی تھیں ۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح امن و امان قائم ہو

جائے۔ فتح خیبر میں بھی آپؐ نے اپنی مفتوح اقوام سے ان کی مرضی کے مطابق معاہدہ فرمایا۔ اس طرح بے شمار مثالیں سیرت نبوی سے مل سکتی ہیں اور پھر اگر آپؐ کسی سے معاہدہ فرماتے تو اس کا پورا احترام فرماتے۔ آپؐ کے دشمنوں کو بھی آپؐ سے کبھی بدعہدی اور بے وفائی کی شکایت نہ ہوئی]۔

معاہدے کی پابندی پر جس قدر اسلام نے زور دیا ہے اتنا کسی دوسرے مذہب یا مکتب خیال نے نہیں دیا [رک بہ معاہدۃ]۔ معاہدات عہد نبوی کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں سے ہر معاہدے کی کامل پابندی کی گئی۔ سیاسی، اور عسکری حالات میں تفاوت کے باوجود ان معاہدات کی ہر شق اب بھی اسی طرح قابل عمل اور باعث امن عالم انسانی ہو سکتی ہے۔

عہد نبوی کے معاہدوں کی مختلف نوعیتیں ہیں اور یہ مختلف نوعیتیں مختلف ادوار سے متعلق ہیں: معاہدات کا پہلا دور غزوۂ بدر سے قبل کے زمانے (۲ھ) کا ہے۔ اس دور کے معاہدات کے پس منظر میں قریش مکہ کا اعلان جنگ کارفرما ہے، اس لیے جن قبائل کے ساتھ دوستی، حلف یا ان کی غیر جانب داری سے مدینہ کی نوزائیدہ مملکت کو فائدہ پہنچ سکتا تھا ان کے ساتھ معاہدات طے پائے۔ قریش مکہ کی سیاسی اور اقتصادی برتری اور ان کے اعلیٰ معاشرتی مقام کی وجہ سے اس طرح کے معاہدوں کی تعداد زیادہ نہ ہو سکی، البتہ جو تین معاہدے اس دور میں طے پائے وہ اس دور میں مملکت مدینہ کی کمزور عسکری حالت کے پیش نظر سود مند ثابت ہوے۔

دوسرے دور کا واحد مگر اہم معاہدہ صلح حدیبیہ ہے۔ اس معاہدے کے اثرات دور رس تھے اور سیرت نبوی کا یہ واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ فقہا نے اس معاہدے کی شقوں سے امور خارجہ سے متعلق اہم اصول وضع کیے ہیں۔

معاہدات عہد نبوی کا تیسرا دور صلح حدیبیہ سے لے کر فتح مکہ تک کا ہے۔ اب وہ زمانہ شروع ہوتا ہے جب یہ معاہدے معاہدات سے زیادہ امان ناموں کا مقام رکھتے ہیں۔ یہ معاہدے یک طرفہ قسم کی ان مراعات پر مبنی ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مفتوح قبائل کو ازخود عطا فرماتے تھے، جیسا کہ وادی خیبر کی شکست خوردہ یہودی آبادی کے معاہدے سے ثابت ہوگا۔ اگر آپؐ ان مفتوح یہودیوں کو غلام بنا لیتے یا قتل کر دیتے یا ملک بدر کر دیتے تو آپؐ کا یہ عمل اس دور کے رواج اور خود شریعت موسوی کے عین مطابق ہوتا۔

فتح مکہ کے بعد تقریباً پورا عرب اسلامی مملکت میں شامل ہو چکا تھا۔ جو قبائل اسلام قبول کرتے تھے ان کے ساتھ کسی طرح کے معاہدے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتّہ جو قبائل یا قبائل کے وہ افراد جو خارج از اسلام رہنا چاہتے تھے انہیں جزیہ کے عوض امان عطا کی جاتی تھی۔ اس دور کے عہد ناموں کو معاہدات کی فہرست میں اس لیے شامل کیا جا رہا ہے کہ ان امان ناموں میں ان مراعات کا ذکر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان ذمیوں کو عطا فرمائی تھیں۔

میثاق مدینہ: ہجرت کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدینہ منورہ کی ریاست قائم کی اور قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مدینہ منورہ میں اس سے قبل باقاعدہ ریاست کا وجود نہ تھا۔ قبائل آزاد و خود مختار حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا چھوٹا سا گروہ داخل ہوا، جو منضبط اور منظّم زندگی گزارنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ مکی زندگی کے دوران میں آپؐ نے جو تربیت اپنے اصحابؓ کو دی تھی وہ بیک وقت اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد انصار کرامؓ

بھی اس قابل ہوگئے کہ ریاستی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکیں ۔ مدینہ منورہ میں ریاست کا قیام باقاعدہ آئین کے ذریعے کیا گیا تھا ۔ یہ آئین میثاق مدینہ [رک بآں] کے نام سے معروف ہے ۔ حالانکہ اس کی حیثیت ایک آئینی حکم نامے (Constitutional Charter) کی سی ہے ، مگر چونکہ آئین ایک طرح کا عہد نامہ ہوتا ہے جو ایک طرف حکومت اور دوسری طرف افراد کے حقوق و فرائض کی حدود متعین کرتا ہے ، اسی بنا پر اس کو معاہدات میں شمار کیا جا سکتا ہے ، چنانچہ عہد نبوی کے عہد ناموں میں اولیت اسی دستاویز کو دی جاتی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ دستاویز صرف مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلّقات ہی کا احاطہ نہیں کرتی ، بلکہ اس کی مخاطب پوری مدنی آبادی (مسلم ، مشرک ، یہودی) تھی ۔ اس کا عنوان تھا : یہ دستاویز محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی جانب سے ہے [رک بہ میثاق مدینہ ؛ ابن ہشام : سیرۃ ، ص ۳۴۱ ، لائپزگ ۱۸۶۰ء] ۔ اس کے یہ معنی ہوے کہ یہ دستاویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عطا فرمائی ۔ اس کے اندر جو فرائض اور حقوق درج تھے آپؐ کی طرف سے آئین کی صورت میں عطا کیے گئے تھے ؛ دوم یہ کہ اس کے دو فریق تھے : پہلا فریق اہل اسلام پر اور دوسرا فریق ہر اس شخص یا ہر اس قبیلے پر مشتمل تھا ، جو آزادانہ طور پر اپنی آزادی فریق اول کے حوالے کرنے کا خواہش مند ہو ؛ سوم یہ کہ یہ آزادی مکمل طور پر فریق اوّل کے رحم و کرم پر چھوڑی جا رہی تھی، اس لیے کہ دوسرا فریق تین باتوں کو قبول کرتا تھا: ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے پیچھے چلے گا ؛ دوم یہ کہ ان کی جماعت کا فرد بن کر رہے گا اور سوم یہ کہ جب قتال کی ضرورت ہوگی تو مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ میں شریک ہو گا [متن کے لیے رک بہ میثاق مدینہ] ۔ یہاں اس کی چند دفعات ذیل میں درج نکات کی رو سے قابل توجہ ہیں :

فریق اول کا امن غیر منقسم قرار دیا گیا تھا ، یعنی یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے ایک حصّے سے دشمنی ہو اور دوسرے کے ساتھ دوستی ۔ مسلمان ملت واحدہ قرار دیے گئے تھے ۔ (دیکھیے شق ۱۷) ۔ جنگ شروع ہونے کے بعد فریق ثانی علیحدہ صلح کرنے کا مجاز نہ تھا ، یعنی مسلمانوں کے ساتھ شامل ہونے کے بعد فریق ثانی کو دشمن کے ساتھ صلح کرنے کی اجازت نہ تھی (شق نمبر ۲۰ ب) ۔ فریق ثانی قریش مکہ کی جانب سے کسی معاملہ میں دخل نہ دے سکتے تھے (شق ۲۰ ب) ۔ فریق ثانی کے کسی بات میں اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ (قانون الٰہی) اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے پیش کیا جاتا تھا (شق ۲۳) ۔ یہاں بھی حاکمیت اللہ کے قانون اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھ میں رکھی گئی [رک بہ میثاق مدینہ] .

یہ دفعات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ حکومت کے سربراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے اور حزب اقتدار مسلمانوں پر مشتمل تھی ۔ فریق ثانی کو حکومت میں صرف اسی قدر دخل تھا ، جہاں تک وہ قانون الٰہی پر کاربند رہتے تھے ۔ انھیں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت تھی ، مگر مشروط ۔ اس میثاق معاہدے کی یہودیوں نے خلاف ورزی کی اور اس کے نتیجے میں ان سے مملکت مدینہ کی شہریت واپس لے لی گئی [تفاصیل کے لیے رک بہ غزوات نبوی] ۔ باغی گروہوں کو ملک بدر کرنے کا قانونی جواز عہد حاضر کی ریاستیں بھی قبول کرتی ہیں کہ جو شخص یا گروہ ملک کے آئین کی صریحًا خلاف ورزی کرتا ہے وہ اس آئین کو عملی طور پر رد کر رہا ہوتا ہے اور جو فرد یا گروہ کسی ریاست کے آئین کو قبول کرنے

پر آمادہ نہ ہو وہ اس ریاست کا شہری نہیں رہتا۔

حدود مملکت سے جن یہودی قبائل کو نکالا گیا تھا وہ بغاوت کے مجرم تھے اور یہ ان کی جائز سزا تھی، مگر آپؐ نے از راہ شفقت انھیں ملک سے چلے جانے اور اپنی تمام منقولہ جائداد اور مال ساتھ لے جانے کی بھی اجازت دے دی تھی۔

دوسرا معاہدہ: [غزوۂ ابواء میں، جسے غزوہ وَدّان بھی کہتے ہیں، بنو ضمرہ کے ساتھ صلح ہوگئی تھی۔ شرائط صلح یہ تھیں کہ بنو ضمرہ نہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور نہ مسلمانوں کے کسی دشمن کی مدد کریں گے اور نہ مسلمانوں کو کبھی دھوکا دیں گے اور عند الضرورت انھیں مسلمانوں کی امداد اور اعانت کرنی ہوگی (ابن سعد: لطبقات، ۲ : ۸، مطبوعۂ بیروت)]۔

معاہدہ سوم: جُمادَی الآخرۃ سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ذات العُشیرہ تشریف لے گئے، جو کہ ینبع اور مدینے کے درمیان واقع ہے اور بنو مُدلِج سے معاہدہ کرکے مدینے تشریف لائے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر کوئی مدینے پر حملہ آور ہوا تو وہ مسلمانوں کو مدد دیں گے اور اگر ان کے علاقے پر کوئی حملہ آور ہوگا تو مسلمان ان کی مدد کریں گے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے قافلے گزرا کرتے تھے۔

میثاق مدینہ اور غزوہ ودّان کے بعد (معاہدات کے دوسرے دور میں) جو اہم معاہدہ طے پایا وہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ تھا۔ یہ تاریخی معاہدہ وقت اور مندرجات دونوں کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

یکم ذو القعدہ سنہ ۶ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے؛ تقریبا چودہ یا پندرہ سو صحابہؓ آپؐ کے ساتھ تھے۔ چونکہ آپؐ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا، اس لیے کسی قسم کا اسلحہ ساتھ نہیں لیا۔ جب آپؐ غدیر اشطاط پہنچے تو آپؐ کو اطلاع ملی کہ قریش نے آپؐ کی آمد کی خبر سن کر لشکر جمع کر لیا ہے اور آپؐ کے مقابلے کے لیے تل گئے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ خالد بن ولید بطور مقدمۃ الجیش دو سو سواروں کو لے کر مقام غمیم میں پہنچ گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ خبر سن کر وہ راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے راستے سے نکل کر مقام حدیبیہ میں پہنچ گئے۔ حدیبیہ میں قیام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک قاصد کے ذریعے اہل مکہ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، لیکن آپؐ کا قاصد بمشکل جان بچا کر واپس آیا۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ کے مشورے سے حضرت عثمانؓ کو مکہ مکرّمہ بھیجا۔ حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو قریش نے ان کو روک لیا ادھر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان غنیؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب یہ خبر سنی تو آپؐ کو بہت صدمہ ہوا اور یہ فرمایا کہ جب تک میں قریش سے بدلہ نہ لے لوں گا یہاں سے نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے درخت کے نیچے کھڑے ہوکر اپنے اصحابؓ سے شہادت پر بیعت لی؛ تمام صحابہؓ اس میں شامل ہوئے۔ اس بیعت کو بیعت رضوان کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے: لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (۴۸ [الفتح]: ۱۸)، یعنی اللہ ایمان والوں پر (اس وقت) راضی ہوا جب کہ وہ درخت کے نیچے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ مدنی معسکر کے باہر جو لوگ موجود تھے، انھوں نے اس بیعت کا منظر دیکھا تو اس کی اطلاع اہل مکہ تک پہنچا دی۔ قریش مکہ کو جب اس بیعت کا علم ہوا تو انھوں نے صلح کے لیے نامہ و پیام

کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ چنانچہ انھوں نے سہیل بن عمرو کو یہ ہدایات دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا کہ ہم صلح کا معاہدہ اس شرط پر قبول کرتے ہیں کہ اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمرہ کیے بغیر ہی مدینہ منورہ لوٹ جائیں گے ۔ حضورؐ اقدس کا اصل مقصد ہمیشہ تبلیغ و اشاعت اسلام رہا اور تبلیغ دین صرف صلح و امن اور دوستی کے ماحول ہی میں ہو سکتی ہے ؛ اس لیے آپؐ نے صلح نامہ قبول فرما لیا ۔ [آپؐ اپنے عظیم سیاسی تدبّر کی روشنی میں یہ دیکھ رہے تھے کہ اس صلح کے عواقب و نتائج اسلام اور اہل اسلام کے حق میں کس قدر مفید ثابت ہوں گے اور اس دورِ صلح میں کس طرح اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سازگار ماحول میسر آ سکے گا ۔ اسی بنا پر اگرچہ] ان کے سفارتی وفد کے سردار کا رویہ غیر مصالحانہ تھا، مگر آپؐ نے انتہائی تدبر اور تحمل سے کام لیا اور اس طرح آپؐ کو یہ معاہدہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ۔ جب صلح نامے کی شرائط طے پا گئیں تو حضرت علیؓ نے لکھنا شروع کیا اور آغاز بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کیا ۔ اس پر قریشی نمائندے سہیل نے اعتراض کیا اور کہا : صرف باسمک اللّٰھم لکھو؛ چنانچہ حضرت علیؓ نے آپؐ کے حکم سے باسمک اللّٰھم لکھا ۔ اس کے بعد سہیل بن عمرو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر اعتراض کیا ۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا : لکھو یہ ہے جس پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ اتفاق کیا ۔ شرائط صلح یہ تھیں :

(۱) دس سال کے لیے باہمی جنگ و جدال کو موقوف کر دیا جائے ؛ اس دوران میں کوئی کسی سے تعرّض نہ کرے ، جو مدنی مکہ کی طرف آئے جائے یا جو مکی مدینہ منورہ کی طرف کسی بھی سلسلے میں سفر کرے اس کا جان و مال محفوظ تصور کیا جائے گا ؛ (۲) اگر کوئی مکی نوجوان اپنے ولی اور آقا کی مرضی کے خلاف مدینہ ہجرت کر جائے تو وہ واپس کیا جائے ، اگرچہ وہ مسلمان ہو کر جائے ؛ البتہ اگر کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ مکرمہ چلا جائے تو قریش مکہ اسے واپس کرنے کے مکلّف نہ ہوں گے ؛ (۳) ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح کی عداوت نہیں رکھی جائے گی اور خفیہ طور پر کوئی بد عہدی نہ ہوگی؛ (۴) جو کوئی (قبیلہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے اس عہد نامے میں شرکت کرنا چاہے وہ کر سکے گا اور جو قبیلہ چاہے قریش کی طرف سے اس معاہدے میں شمولیت اختیار کر سکتا ہے ۔ ان حلیفوں کے ساتھ وہی سلوک اور برتاؤ کیا جائے گا جو اس عہد نامے کی رو سے فریقین کا حق ہے (جب یہ شرائط ضبط تحریر میں آ گئیں تو بنو خزاعہ نے اہل اسلام کے ساتھ اور بنو بکر نے قریش مکہ کے ساتھ معاہدے میں شرکت کرنے کا اعلان کیا) ؛ (۵) اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کے ساتھی عمرہ کیے بغیر واپس لوٹ جائیں گے اور اگلے سال عمرہ کے لیے آئیں گے اور مکہ مکرمہ میں تین رات قیام کر سکیں گے ؛ اس دوران میں اہل مکہ شہر خالی کر جائیں گے ۔ اس موقع پر مسلمانوں کے ساتھ سوا ے تلواروں کے کوئی دوسرا ہتیار نہ ہوگا [دیکھیے الزرقانی : شرح المواھب اللدنیہ ، ۲ : ۹۴ تا ۴۰۸ ، مطبوعہ قاہرہ ؛ الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۱۱ (نیز رک بہ حدیبیہ)].

بادی النظر میں یہ شرائط مسلمانوں کے لیے سخت تھیں ، [مگر سیاسی اور عسکری نقطۂ نظر سے یہ تمام شرائط اہل اسلام کے فائدے میں تھیں] ۔ مسلمانوں کو اس سال عمرہ کی اجازت نہ ملی تھی ، جس کا ازالہ دوسرے سال تین رات کے قیام اور شہر کو مسلمانوں کی تحویل میں دیے جانے سے ہوا ۔ جس دفعہ میں کسی مسلمان کے اہل مکہ کو واپس

دینے کا ذکر تھا ۔ [یہ دفعہ ابو بصیرؓ اور حضرت جندلؓ بن سہیل کی وجہ سے قریش مکہ کے لیے تلخ ثابت ہوئی ، چنانچہ بعد ازاں انھوں نے خود کہہ کر] اس شرط کو عہد نامہ سے خارج کروایا؛ جو مسلمان اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو کر مکے چلا آتا اسے واپس لینے کا کوئی فائدہ نہ تھا ۔

صلح حدیبیہ دراصل تبلیغ اور وسعت اسلام کا دیباچہ تھی، اس لیے ارشاد باری تعالی ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (۴۸)؛ ۱)، یعنی ہم نے تیرے لیے فتح مبین کا فیصلہ کر دیا ہے۔

انجام : اہل مکہ نے ۸ھ میں حلیفوں کو معاہدے میں شامل کرنے والی شرط کی خلاف ورزی کی [اور بنو بکر کی حمایت میں بنو خزاعہ کا، جو مسلمانوں کے حلیف تھے ، عین صحن کعبہ میں قتل عام کیا] ، مگر جب انھیں [شرائط صلح حدیبیہ کے مطابق] خون بہا ادا کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ صلح حدیبیہ کو ختم کر چکے ہیں ۔ اس کے نتیجے میں سنہ ۸ میں مکہ مکرمہ پر حملہ کیا گیا [اور یوں فتح مکہ پر اہل اسلام اور قریش مکہ کی طویل کشمکش اختتام پذیر ہوگئی]۔

فتح خیبر کا معاہدہ : [مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کو ایک طرف سے یہود خیبر اور دوسری طرف سے قریش مکہ ایسے خطرناک دشمنوں سے پالا پڑا تھا ۔ اسلام دشمنی میں یہود خیبر قریش مکہ سے بھی بڑھ گئے تھے ۔ ایک تو اس بنا پر کہ آپؐ کی آمد سے عرب کے یہودیوں کی علمی و معاشرتی برتری ختم ہوگئی تھی اور دوسرے اس لیے کہ یثرب کے دو عظیم یہودی قبیلے بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینہ منورہ سے خارج کیے جانے کے بعد خیبر میں جا کر آباد ہوگئے تھے ۔ اور وہاں یہ لوگ پورے عرب میں اہل اسلام کے خلاف جنگ اور نفرت کی آگ بھڑکانے میں مصروف تھے ۔ اس طرح وہی غزوۂ خندق کا باعث ہوئے تھے ، جس میں تقریبا تمام قبائل یا ان کے نمائندے شامل ہوئے تھے] اور ان کی شرارتیں ختم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا ۔ وہ نجد کے قبیلے بنو غطفان کو بھی ابھارتے رہتے تھے ، جنھوں نے اپنے ایک ہزار ہتیار بند جوان خیبر کے قلعوں کی حفاظت کے لیے روانہ کیے تھے اور دونوں کے درمیان معاہدہ طے پا چکا تھا ۔ حدیبیہ سے واپسی کے دوران میں اللہ تعالی نے ایک اور بڑی فتح کی خوشخبری بھی سنائی تھی ۔ آپؐ نے اس خوشخبری سے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ فتح خیبر کی بشارت ہے ۔ آپؐ کچھ دنوں کی تیاری کے بعد اپنے انھیں جاں نثاروں سمیت خیبر پر حملہ آور ہوئے اور تقریبا دو ماہ بعد خیبر کے بارہ قلعے مکمل طور پر مفتوح ہوگئے ۔ اہل خیبر نے آپؐ سے معاہدہ صلح کی درخواست کی ، جو قبول کر لی گئی ، چنانچہ حسب ذیل شرائط پر صلح نامہ ترتیب پایا :

(الف) یہود کو خیبر (یعنی وادی خیبر) میں رہنے کی اجازت ہوگی ؛ (ب) جب کبھی مدینہ منورہ کی حکومت چاہے گی انھیں خیبر خالی کرنا پڑے گا ؛ (چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد میں انھیں خیبر خالی کرنے کا حکم دیا گیا) ؛ (ج) خیبر میں قیام کے دوران میں انھیں قلعوں میں آباد رہنے کی اجازت نہ ہوگی ، (اس لیے انھوں نے قلعوں سے باہر نئی بستیاں آباد کر لیں) ؛ (د) وہ خیبر کی زمین پر بطور مزارع کے قابض رہ سکیں گے اور مروجہ طریقے پر فصلوں کی بٹائی مدینہ منورہ کے نمائندے کے حوالے کرتے رہیں گے (عبداللہؓ بن رواحہ سب سے پہلے صحابی تھے جو اس کام پر متعین ہوئے) ؛ (ہ) وہ جنگ کے ہتیار اور اسلحہ اسلامی لشکر کے حوالے کر دیں گے (اس شق پر فوراً عمل کیا گیا) ۔ اس معاہدے کے بعد بھی

اہل خیبر کی فتنہ انگیزیاں جاری رہیں ؛ [چنانچہ آپؐ نے یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے نکالنے کی وصیت فرمائی] جس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے دور میں عمل ہوا اور اہل خیبر کو جزیرہ عرب سے نکال دیا گیا۔

معاہدۂ خیبر میں تین باتیں سامنے آتی ہیں : اولاً یہ کہ جونہی دشمن نے شکست تسلیم کی ، فوراً لڑائی روک دی گئی ؛ دوم یہ کہ معاہدے میں مفتوح کی خواہشات کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ انھوں نے مزروعہ زمینوں پر بحال رہنے کی درخواست کی تو وہ بھی قبول کر لی گئی ؛ سوم یہ کہ مفتوح قلعوں سے ہتیار لے لیے گئے تاکہ وہ دوبارہ فساد کا باعث نہ بن سکیں۔

معاہدۂ فدک : فدک چھوٹی سی بستی تھی ، جو خیبر کے شمال میں واقع تھی۔ یہاں بھی یہودی رہتے تھے۔ جب انھوں نے سنا کہ خیبر کے یہودیوں کو شکست ہو چکی ہے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس وفد روانہ کیا اور گزارش کی کہ ان سے بھی اہل خیبر کی سی شرائط پر صلح کر لی جائے ، چنانچہ آپؐ نے ان سے بھی انہی شرائط پر معاہدہ فرما لیا [رک به فدک]۔

معاہدہ تیماء : وادی خیبر کے شمال میں تیماء کی ایک چھوٹی سی بستی تھی [جو مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر شام کی جانب واقع تھی (وفاء الوفاء ، ۲ : ۲۵)] ، جس میں یہودی آباد تھے۔ انھوں نے بھی لڑائی کے بغیر اطاعت قبول کر لی اور ان کے لیے بھی وہی شرائط رکھی گئیں ، جو اہل فدک کے لیے رکھی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ جو معاہدہ طے ہوا اس کے الفاظ یہ تھے : اللہ کے رسولؐ کی طرف سے بنو عادیا کے لیے ، ان پر نہ تو ظلم ہوگا اور نہ وہ جلا وطن کیے جائیں گے۔ رات (اس معاہدے کو) دراز کیا کرے گی اور دن اس میں شدت پیدا کیا کرے گا۔ (اسے) خالد بن سعید نے لکھا [(ابن سعد : الطبقات ؛ الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۱۹)۔ یہ معاہدہ آپؐ کے مدینہ منورہ لوٹنے سے پیشتر اور وادی القری کی جھڑپ اور صلح کے بعد طے پایا۔

جب عہد فاروقی میں فدک اور خیبر والوں کو جلا وطن کیا گیا تو اہل وادی القری اور اہل تیماء محفوظ رہے۔ اس کی وجہ مؤرخ یہ بتاتے ہیں کہ دونوں علاقے شام کی حدود میں واقع تھے جب کہ آپؐ کی وصیت جزیرہ عرب کو یہودیوں سے پاک کرنے سے متعلق تھی (الواقدی : المغازی ، ۲ : ۷۱۱)]۔

معاہدہ ایلہ : [ایلہ ساحل بحیرۂ قلزم پر واقع شام سے ملحق ایک چھوٹی سی ریاست تھی (یاقوت : معجم البلدان ، ۱ : ۳۹۱)۔ اس زمانے میں اس پر یوحنا [یُحَنّہ] بن رؤبہ (غالبا عیسائی) کی حکومت تھی۔ تبوک کی مہم میں رومی لشکر سے سامنا نہ ہوسکا ، البتہ آپؐ نے اس علاقے کی ان ریاستوں کی سرکوبی ضروری خیال فرمائی جو بوقت ضرورت اہل روم کا ساتھ دیتی تھیں ؛ چنانچہ] مُؤْتہ کی لڑائی میں شمالی سرحد کے نیم عیسائی ، یہودی اور مشرک عرب قبائل نے رومی لشکر کی امداد کی تھی۔ [آپؐ نے دومۃ الجندل کے حکمران اکیدر بن عبدالملک کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ روانہ فرمایا ؛ اس سے خائف ہوکر ایلہ کے حکمران نے دربار رسالت میں حاضری دی اور صلح کی درخواست پیش کی ، جو قبول کر لی گئی (المغازی ، ۳ : ۱۰۲۵ ببعد)] ۔ ایلہ کے قبیلے کے ساتھ جو معاہدہ ہوا وہ حقیقی معنوں میں امان نامہ تھا۔ اس کی اہم دفعات یہ تھیں :

۱۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے یُحَنّہ بن رؤبہ اور اہل ایلہ کو امان دی جاتی ہے ؛ (۲) سمندر میں ان کے جہاز اور خشکی میں ان کے مسافر مامون ہوں گے ؛ (۳) اس امان نامہ میں اہل ایلہ کے وہ حلیف شامل سمجھے جائیں گے جو شام ، یمن اور

بحیرۂ قلزم کے ساحل پر آباد ہیں ۔ [چونکہ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے اس لیے ان کے مسافروں کا بالخصوص ذکر آیا ہے] ؛ (۴) اگر کسی نے کسی طرح کی بھی معاہدہ شکنی کی تو اس کا مؤاخذہ ہوگا ؛ (۵) کسی کو یہ جائز نہیں کہ ان لوگوں کو ان چشموں پر جانے سے منع کرے جہاں وہ جایا کرتے ہیں ؛ (۶) اہل ایلہ [جن کی تعداد تین صد افراد پر مشتمل تھی] ہر سال تین سو دینار جزیہ ادا کرتے رہیں گے ؛ (۷) اگر کوئی شخص امان نامے کی ان شرائط کی خلاف ورزی کرے گا یا ان میں تبدیلی کرے گا تو اس کی دولت اسے اسے بچا نہ سکے گی ۔ [اور جو لوگ اس کی پابندی کریں گے ان کے لیے بہتری ہے (ابن ہشام : السیرہ ، ص ۹۰۲ ، گوٹنگن ۱۸۶۰ء ؛ الواقدی : المغازی ، ۳ : ۱۰۳۱) یہ معاہدہ معسکر تبوک میں طے پایا ؛ وہیں ایلہ کا حکمران آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا [(دیکھیے الوثائق السیاسیة، شمارہ ۳۰ - ۳۱)].

[اہل مقنا کے ساتھ معاہدہ : ایلہ کے قریب ایک اور اہم ریاست مقنا کی تھی ، جو شام کے ساحل پر واقع تھی (معجم البلدان ، ۷ : ۱۲۸) ؛ اسی دوران میں جب آپ ؐ مہم تبوک کی لشکر گاہ میں موجود اور آس پاس کے علاقوں کی تسخیر میں مصروف تھے ، اہل مقنا کی طرف سے ایک وفد بارگاہ رسالت میں باریاب ہوا، جس کی سربراہی عبید بن یاسر بن نمیر کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنی قوم کی طرف سے مملکت مدینہ کے لیے اطاعت کا پیغام پہنچایا ۔ آپ ؐ نے ان کو معاہدہ لکھ دیا ، جس میں ان کے حقوق و فرائض کا ذکر تھا (الوثائق السیاسیہ ، شمارہ ۳۳ و ۳۴ ؛ کتاب المغازی، ۳ : ۱۰۳۲ و ببعد] ؛

معاہدہ جرباء اور اَذرُح : [شام کی دو بستیاں ہیں ، جن کے مابین تین دن کی مسافت ہے [معجم ما استعجم ، ص ۸۴] ۔ جرباء اور اذرح کے ساتھ معاہدہ بھی غزوۂ تبوک کے دوران میں طے پایا ۔ ان پر سالانہ سو دینار جزیہ لگایا گیا اور اس کے بدلے ان کو تمام اطراف اور تمام دشمنوں سے حفاظت کا یقین دلایا گیا تھا ۔ ان کے امان نامے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مملکت مدینہ کا کوئی شخص سزا سے خائف ہوکر ان کے پاس آ کر پناہ لے تو اسے حکومت مدینہ کے حوالے کر دیا جائے گا ؛

اکیدر سے معاہدہ : غزوۂ تبوک کی مہم کے دوران میں اسی سلسلے میں حضرت خالد بن ولید ؓ کو دومۃ الجندل کے عیسائی سردار اکیدر کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ، انھوں نے اکیدر اور اس کے بھائی کو گرفتار کرکے دربار رسالت مآب ؐ میں پیش کیا اور اکیدر اسلام لے آیا ۔ اس کے ساتھ بھی مخصوص شرائط پر صلح طے پائی ۔ اس کی ایک دفعہ کے مطابق ان کی مزروعہ زمینوں اور چراگاہوں کو حسب سابق ان کی ملکیت رہنے دیا ، البتہ ان پر خراج لگا دیا گیا .

[اختتام : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اور بھی چھوٹے بڑے کئی معاہدات فرمائے (دیکھیے الوثائق السیاسیہ ، وغیرہ) ، جن میں بطور خاص یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر کسی چھوٹے یا بڑے قبیلے نے آپ ؐ سے معاہدۂ صلح کرنے کی پیش کش کی تو آپ ؐ نے اس کی پیش کش کو شرف قبولیّت بخشا اور پھر جو شرائط صلح طے ہوگئیں ان سے سرمو انحراف نہیں کیا اور نہ اس سے کچھ تجاوز کیا ۔ چند بار ایسا ہوا کہ کسی مجاہد نے غلطی سے مفتوحین میں سے کسی شخص کے مال میں سے کچھ لینے کی کوشش کی ، مگر آپ ؐ نے سختی سے اس کی ممانعت فرما دی اور اسے نہبۃ ، یعنی لوٹ قرار دے کر حرام ٹھیرایا اور اس پر تاوان واجب کیا (المغازی ، ۳ : ۱۰۳۳)۔ آپ ؐ نے جس طرح معاہدوں کا احترام کیا اور جس طرح ان پر عمل درآمد فرمایا اس کی شہادت دشمن بھی دیتے ہیں ۔ آپ ؐ کے کسی حلیف کو آپ ؐ سے معاہدے کی خلاف ورزی کی شکایت نہ ہوئی ، بلکہ

اگر فریق ثانی بھی کسی قسم کی کوتاھی کرتا تو آپ ؐ اسے نرمی سے سمجھاتے ، لیکن وہ اگر کسی طرح باز نہ آتا ، تو مجبور ہوکر آپ ؐ اس پر لشکرکشی کرتے .

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان معاہدات کو اچھے مقاصد کےلیے استعمال کرتے تھے۔ معاہدات نبوی کو آپ ؐ کی جنگی حکمت عملی کے ساتھ گہرا رابطہ تھا ۔ آپ ؐ کے مقابلے میں اگر دو جماعتیں برسر پیکار ہوتیں تو آپ ؐ ان میں سے ایک فریق سے قابل قبول شرائط پر صلح کر لیتے ۔ آپ ؐ نے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی وہاں پر آباد مختلف اقوام سے جو معاہدہ کیا ، اس نے ان فریقوں کو آپ ؐ کے مخالفین سے الگ کر دیا ۔ شاہراہ شام پر آباد مختلف قبائل بنو ضمرہ ، بنو جہینہ ، وغیرہ سے معاہدات بھی آپ ؐ کی عسکری حکمت عملی کا نتیجہ ہیں ، جس کے نتیجے میں آپ ؐ قریش مکہ کی اقتصادی شاہراہ کی ناکہ بندی کرنے میں کامیاب ہوگئے [نیز رک بہ غزوات] ۔ غرض آپ ؐ کے تمام معاہدات واضح اور منظم طور پر اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جس کا مقصد دنیا میں عدل و انصاف اور امن و امان کا قیام و رواج کرنا تھا] .

مآخذ : [(۱) محمد حمید اللہ : مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ، قاہرہ ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء ؛ (۲) ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ، طبع مصطفی السقا وغیرہ ، قاہرہ ۱۳۰۵ھ/ ۱۹۳۶ء (نیز مآخذ مقالۂ غزوات)].

(گلزار احمد [و ادارہ]

⊗ غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :

[غزوات جمع غزوۃ (از مادہ غ ۔ ز ۔ و = غزا الشیٔ غزوا ، یعنی کسی چیز کی تلاش کرنا ، ارادہ کرنا ؛ کہا جاتا ہے : غزوتُ فلانا ، یعنی میں نے فلاں کو ملنے کا قصد کیا ؛ اسی مادے سے غزوۃ بمعنی وہ چیز جو طلب کی جائے ، ہے غزا غزوا و غزاوۃً و غزوانًا القوم ، یعنی کسی قوم کی سکونت کی طرف لڑائی یا انتباہ کے ارادے سے بڑھنا ؛ غازی (ج: غُزاۃ و غُزّی و غُزّاء مؤنث : غازیہ، ج: غَوازٍ و غازیات) بمعنی جنگجو (ابن منظور : لسان العرب ؛ الزبیدی : تاج العروس ، بذیل مادہ) ۔ ابن منظور نے بہت سی مثالیں دی ہیں ، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس مادے کا استعمال جنگ کے معنوں میں عام تھا ؛ قرآن کریم میں عام طور پر لڑائی کے موقع پر جہاد اور قتال کے لیے اس کا استعمال ہوا ہے ، تاہم ایک جگہ اس مادے سے غُزّی (جمع غازی) کا بھی استعمال ہوا ہے (معجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ، بذیل مادہ) ؛ البتہ کتب سیرت میں عہد نبوی کی جنگوں کے لیے دو الفاظ ملتے ہیں : (۱) جس جنگ میں آپ ؐ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی ہو اسے غزوہ کہا جاتا ہے ؛ (۲) جس جنگ میں آپ ؐ نے شرکت نہ فرمائی ہو اور اپنی طرف سے کسی کو لشکر کی قیادت پر مامور کرکے روانہ فرما دیا ہو اسے سَرِیَّہ (ج سرایا ، از مادہ سَرَی سریً و سَرْیَۃً و سُرْیَۃً و سَرایَۃً و سَرَیاناً و مَسْرًی ، بمعنی رات کو چلنا) کہا جاتا ہے ؛ سریہ ایک چھوٹا فوجی دستہ ، اس لیے کہ اس کا چلنا مخفی ہوتا ہے (لسان العرب ، بذیل مادہ) اس کو "بَعْث" بھی کہتے ہیں (الزرقانی : شرح المواہب اللدنیۃ، ۱ : ۳۸۷ ، قاہرہ ، ۱۳۲۵ھ) ۔ غزوات و سرایا جہاد کا حصہ ہیں (رک بہ جہاد ؛ انفال ؛ نیز ابو الاعلیٰ مودودی : الجہاد فی الاسلام)] ۔ چونکہ یہ تمام مہمیں انہی کوششوں کا حصہ تھیں ، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم [کو اپنے اور اہل اسلام اور مملکت مدینہ کے دفاع اور اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے کرنا پڑیں] ، اس لیے غزوات و سرایا [اور تبلیغ و دعوت کی کوششوں] کا جب تک بہم مطالعہ نہ کیا جائے اس وقت تک صحیح صورت حال سامنے نہیں آتی.

غزوات نبوی کو چند واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا دور مکّی اعلان جنگ سے شروع

ہو کر بدر کی لڑائی پر ختم ہو جاتا ہے؛ دوسرا دور غزوۂ احد تک کا ہے؛ تیسرا دور احد کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور غزوۂ خندق تک مشتمل ہے؛ چوتھا دور صلح حدیبیہ سے لے کر غزوۂ خیبر کے اختتام تک ہے؛ چھٹا دور خیبر سے لے کر فتح مکہ تک کے عرصے کو محیط ہے اور ساتواں دور فتح مکہ کے بعد غزوات اور سرایا پر مشتمل ہے۔ ان میں اکثر ادوار کے حالات اور ان کے پس منظر میں معتدبہ فرق ہے، اس لیے حضورؐ کو ہر دور میں مختلف قسم کے اقدامات کرنے پڑے اور یہی وجہ ہے کہ ہر دور کی تدبیرات جنگ (Strategy of war)، جو آپؐ نے اختیار کیں ان میں بھی فرق ہے۔ ہر اعلیٰ کمان دار اپنے گرد و پیش کے حالات کے مطابق اپنی تدبیرات اور طریق (tactics) کو تشکیل دیتا ہے۔ حضورؐ نے جو اصول جنگ (Principles of War) اور جنگی تدبیرات و طریق استعمال کیے ان کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ابتدا: جب اہل مکہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، مدینہ منورہ پہنچنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، تو انھوں نے باہمی مشورے سے عبداللہ بن اُبَی کو خط لکھا [جس میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مدینہ منورہ میں پناہ دینے پر اظہار عتاب کیا اور آپؐ کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا اور بصورت دیگر سخت اقدامات کی دھمکی دی (ابو داؤد: السنن، ۳: ۴۰۴، باب خبر النضیر؛ الوثائق السیاسیہ، شمارہ ۳/ب)]؛ یہ گویا آپؐ کے خلاف اعلان جنگ تھا۔

[مشرکین مکہ کے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف بغض و عداوت کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہجرت مدینہ کے کچھ عرصے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ کا مکہ مکرمہ کے پاس سے گزر ہوا، سوچا عمرہ کرتا چلوں؛ ان کی صفوان بن امیہ سے دور جاہلی میں گاڑی چھنتی تھی، وہ ان کے پاس جا کے ٹھیرے اور ان کی معیت میں نصف النّہار کے قریب طواف کرنے کے لیے نکلے؛ راستے میں ابو جہل [رک بآں] ملا، اس نے پوچھا صفوان یہ تمہارے ہمراہ کون ہے؟ اس نے کہا: سعدؓ ہیں؛ ابو جہل بولا: کیا میں ان کو حالتِ امن میں خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟ حالانکہ انھوں نے صابئین کو پناہ دی اور ہمارے خلاف ان کی مدد کی ہے؛ پھر کہا: بخدا اگر صفوان تیرے ساتھ نہ ہوتا تو تو اپنے گھر کبھی واپس نہ لوٹ سکتا (البخاری، ۳: ۵۳، کتاب المغازی، باب ۲)۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے مدینہ منورہ کے آس پاس بسنے والے قبائل میں اہل اسلام کے خلاف دشمنی کی آگ اس حد تک بھڑکا دی تھی کہ مدینہ منورہ میں کئی سال تک راتوں کو پہرہ دیا جاتا تھا، صحابہ کرامؓ ہتھیار پہن کر سوتے، ہر وقت کسی ناگہانی حملے کا دھڑکا لگا رہتا۔ البخاری (۲: ۲۲۰ کتاب الجہاد، باب ۷۰) نے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے حوالے سے اسی زمانے کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک رات آپؐ حملے کے خطرے کے پیش نظر دیر تک جاگتے رہے، آپؐ نے آرام کی ضرورت کے پیش نظر فرمایا: کاش کوئی صالح شخص رات کو پہرہ دے (تاکہ میں آرام کر سکوں)! اسی وقت باہر سے ہتھیاروں کے کھٹکنے کی آواز سنائی دی؛ پوچھا: کون ہے؟ جواب ملا: سعدؓ بن ابی وقاص رات کے پہرہ دینے کے لیے حاضر ہے؛ تب آپؐ سو سکے۔ قبائل عرب کے دلوں میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف اٹھائے جانے والے اسی طوفان کا ہی اثر تھا کہ ایک مرتبہ جب آپؐ ایک غزوے سے واپسی کے موقع پر ایک درخت کے نیچے استراحت فرما رہے تھے تو ایک اعرابی نے، جو وہیں تاک میں تھا، اچک کر آپؐ کی تلوار اٹھا لی اور اسے لہراتے ہوئے آپؐ سے کہنے لگا: تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ آپؐ

نے فرمایا : اللہ ۔ یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی ۔ آپؐ نے اسے معاف کر دیا (کتاب مذکور، ۲۲۶ ، ۸۳/۵۶).

ان حالات میں آپؐ اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو اس کا نتیجہ مدینے کی تباہی کی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا ۔ آپؐ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوے ایسی تدابیر اختیار فرمائیں جس سے مدینے کا دفاع مضبوط ہوا اور مسلمانوں میں مقاومت کی لہر پیدا ہوئی] ۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے دفاع مدینہ کے ضمن میں دو طرح کے اقدامات فرمائے : اولاً، داخلی سطح پر آپؐ نے مدینہ منورہ کی ریاست کا باقاعدہ طور پر انتظام و انصرام کیا اور اس امر کی توثیق میثاق مدینہ [رَکّ بآں] کے ذریعے کی گئی ۔ میثاق مدینہ کی حیثیت بنیادی قانون (Fundamental Law) یا ملکی آئین (Constitution of the State) کی سی ہے اور اس کے دفاعی اندراجات نہایت واضح اور غیر مبہم ہیں ۔ چونکہ امور دفاع اور امور خارجہ اس آئین کی رو سے حضور اکرمؐ کے ہاتھ میں تھے، اس لیے خارجی سطح پر حضورؐ نے ایسے سفر اختیار کیے جن کے ذریعے دو طرح کے فائدے حاصل ہوے : ایک تو یہ کہ ریاست مدینہ کی حدود کا تعین ہوا اور دوسرے ان سفروں کے دوران میں آپؐ نے مختلف قبائل کے ساتھ معاہدات کیے ؛ بعض نے ریاست مدینہ کے ساتھ شمولیّت اختیار کی اور بعض نے دفاعی سمجھوتے کیے ۔ ایک قبیلے نے جنگ کی صورت میں غیر جانب دار رہنے کی شرط پر معاہدہ کیا [ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۵ تا ۱۰]۔ ممکن ہے بین الاقوامی سطح پر جنگ کے دوران میں غیر جانب داری کا یہ پہلا معاہدہ ہو ۔ [اس کے علاوہ آپؐ نے اس ہلچل کے ذریعے قریش مکہ کی تجارتی شاہراہ کے لیے جو بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب سے گزرتی تھی خطرہ پیدا کر دیا].

اسی طرح کے ایک سفر پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پہلی بار تشریف لے گئے تو اس سفر کو غزوہ وَدّان اور غزوہ ابواء کا نام دیا گیا [یہ غزوہ ہجرت کے بارھویں مہینے ، صفر ۲ھ ، میں پیش آیا] ۔ اس سفر کے دوران میں حضورؐ نے اپنے صحابہؓ سمیت ان دونوں مقامات پر [جن کے مابین چھے میلوں کا فاصلہ ہے] قیام فرمایا تھا ۔ یہ مقامات بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب واقع ہیں اور یہیں سے شام کو جانے والی شاہراہ گزرتی ہے ۔ اس علاقے پر بنو ضمرہ کا تسلط تھا [آپؐ نے بنو ضمرہ کے رئیس مَخْشِیّ بن عمرو الضمری کے ساتھ غیر جانب دار رہنے کا معاہدہ فرمایا۔ پندرہ دنوں کے بعد آپؐ مدینہ منورہ واپس آئے (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۸)] ۔ اس غزوے کے دوران میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو جیش مدینہ کا سفید علم اٹھانے پر مامور کیا گیا تھا ، جب کہ سعدؓ بن عبادہ کو نائب مقرر کرکے مدینہ منورہ میں چھوڑا گیا تھا ۔ حضورؐ نے [کسی سفر میں ، جس کی وضاحت نہیں ملتی] بنو جہینہ کے ساتھ بھی معاہدہ کیا ، جس کی رو سے اس قبیلے نے مکی ، مدنی جنگ کے دوران میں غیر جانب دار رہنے کا اقرار کیا ۔ اس غزوہ کے دوران میں کسی دشمن سے مقابلہ نہیں ہوا اور نہ ہی وہاں کوئی لشکر یا قافلہ موجود تھا [آپؐ کا سفر تبلیغی سفارتی تھا].

مہاجرین مدینہ منورہ اور اس کے گرد و نواح سے اچھی طرح واقف نہ تھے ۔ مکہ کی جانب سے اعلان جنگ ہو چکا تھا ، مگر آپؐ کو ابھی فوج کی تربیت کرنا تھی ۔ [ان سفروں سے مہاجرین کی تربیت کا پہلو بھی مدنظر تھا] اور یہ تربیت اس کے علاوہ تھی جو آپؐ مدینہ منورہ میں جاری رکھتے تھے ۔ اسی لیے ہم ان سفروں کو ، اور باتوں کے علاوہ تربیتی سفر بھی قرار دے سکتے ہیں.

سریۂ عُبیدہ بن الحارث : جب اہل مکہ نے سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے شاہراہ شام پر

قابض قبائل کے ساتھ دوستانہ معاہدے کر لیے ہیں تو انہیں سخت تشویش ہوئی۔ قریش مکہ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ دو سو سواروں پر مشتمل ایک جیش [عِکرمہ بن ابی جہل یا ابو سفیان یا مِکْرَز بن حفص کی زیر قیادت] اس علاقے کی گشت پر روانہ کیا تا کہ یہ لشکر عام گشت (Flag March) کے ذریعے قریش مکہ کی برتری کو پھر سے قائم کرے؛ یا شاید مقصد یہ ہو کہ یہ لشکر قریش کے اعلان جنگ کے مطابق، اہل مدینہ کو مجبور کر دے کہ حضورؐ کو (معاذ اللہ) قتل کر دیں یا مدینہ منورہ سے نکال دیں۔جب اس کی خبر آنحضرتؐ کو پہنچی تو آپؐ نے فوراً حضرت عبیدۃؓ ابن الحارث کے زیر کمان ساٹھ [یا اسی] مہاجر صحابہؓ پر مشتمل ایک دستہ روانہ فرمایا تا کہ وہ قریش کے لشکر کو ریاست مدینہ کی حدود کے اندر داخل نہ ہونے دے۔ ثَنِیَّۃ المَرَّہ کے دامن میں، حجاز کے [ایک چشمہ اَحیاء] کے قریب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ لڑائی تو نہ ہوئی البتہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے اس موقع پر اسلامی لشکر کی جانب سے لشکر قریش پر تیر اندازی کی۔ دو با اثر مکی [مِقداد بن عمرو اور عُتبہ بن غزوان بن جابر] اپنے لشکر سے نکل کر اسلامی لشکر میں آ ملے۔ [در حقیقت یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے (ابن سعد: الطبقات، ۱: ۷؛ ابن ہشام: سیرۃ، ۲: ۲۴۲)]۔ اہل اسلام نے واپسی کے دوران میں فوجی ترتیب (Formation) قائم رکھی۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مقابلے میں ایک قافلہ نہ تھا بلکہ باقاعدہ لشکر تھا، ورنہ واپسی کے دوران میں فوجی ترتیب قائم نہ رکھی جاتی۔ یہی نہیں، بلکہ اگر قافلہ ہوتا تو اسلامی دستہ اس کو بچ کر نہ جانے دیتا۔ اس مہم کو سریۂ رابغ [رابغ جُحفہ سے دس میل پر واقع مقام] کا نام بھی دیا گیا ہے۔ [الواقدی اور ابن سعد نے ہجرت کے آٹھ ماہ بعد ۱ھ کا واقع بتایا ہے (دیکھیے ابن سعد: الطبقات، ۲: ۷؛ کتاب المغازی، ۱: ۲)]۔ بہرحال اس طرح بغیر مزاحمت کے دونوں لشکر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے۔

سریۂ سعدؓ بن ابی وقاص: ہجرت کے تقریباً آٹھ ماہ بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کو بیس اکیس پیادہ مجاہدوں کے ساتھ الخرّار (ایک چشمہ یا وادی، جُحفہ سے قریب) کی طرف روانہ کیا۔ یہ جیش مقام الخرار پر پہنچا، مگر کسی مخالف جیش سے تصادم نہ ہوا اور بخیریت واپسی ہوگئی (الزرقانی: شرح المواھب، ۱: ۹۳۲؛ ابن سعد: الطبقات، ۲: ۷)]۔

سریہ حمزہؓ بن عبدالمطلب: قریش مکہ اپنی اس ناکامی پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ایک اور لشکر تیار کیا اور اس کی کمان ابو جہل نے اپنے ہاتھ میں لی۔ اس لشکر کی تعداد تین سو تھی۔ آپؐ نے اس مرتبہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے زیر کمان تیس صحابہؓ پر مشتمل لشکر روانہ کیا [ابن سعد، ۲: ۹]۔ ان لشکروں کا ساحل سمندر پر آمنا سامنا ہوا۔ دونوں لشکر لڑائی کے لیے صف بستہ ہو چکے تھے۔ ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ [مَجدی بن عمرو الجُہنی، جو دونوں کا حلیف تھا] پہنچ گیا اور اس نے دونوں لشکروں کو اپنے معاہدے کی رو سے مجبور کیا کہ لڑائی سے باز رہیں۔ ابو جہل نے اپنے ان اشعار میں اس بات کا افسوس کیا ہے [جو اس کی طرف منسوب ہیں (دیکھیے ابن ہشام: سیرۃ، ۲: ۲۴۷)]۔

وہ اپنے اشعار [عدد ۱۴، ۱۵] میں امید ظاہر کرتا ہے کہ آئندہ ضرور مسلمانوں پر یلغار کر سکے گا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ سریۂ رابغ اور سریہ [سِیف] البحر کے متعلق جن روایات میں بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں مہمیں قافلہ لوٹنے کی غرض سے روانہ کی گئی تھیں وہ ناقابل التفات ہیں؛ کیونکہ مدینہ ابھی کسی

جارحانہ کارروائی کے اہل نہ تھا ۔ یہ وہ دور ہے جس کے متعلق قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ : تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لیں [۹ [انفال] : ۲۶] ۔ [ایسی حالت میں اپنے سے طاقتور دشمن کے قافلے لوٹنے کے لیے ہر دوسرے مہینے نکل کھڑا ہونا قرین قیاس نہیں ؛ جن روایات کا سہارا لیا جاتا ہے ان کو حالات کے سیاق و سباق کی روشنی میں پڑھنا چاہیے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا].

غزوۂ بُواط : قریش کی جانب سے دو حملوں کے بعد ، توازن قائم رکھنے کے لیے ، حضور اکرمؐ کا دوبارہ ان کے علاقوں میں تشریف لے جانا ضروری تھا ۔ اس کے علاوہ جن قبائل کے ساتھ پہلے غزوات کے دوران میں معاہدے کیے جا چکے تھے ان کے ساتھ سربراہ مملکت کی سطح پر تعلقات قائم رکھنے اور ان کی ہمت بڑھانے کے لیے بھی یہ ضروری تھا ؛ اس لیے جو نہیں حضرت حمزہؓ کا دستہ، یا [آج کی فوجی زبان میں] لڑاکا گشت (Fighting Patrol) ، مدینہ منورہ واپس پہنچا ، آپؐ نے دوسری تبلیغی اور سفارتی مہم تیار کی اور [ربیع الاول ۲ھ میں] دوبارہ ساحلی علاقے کا رخ کیا ۔ اس بار لشکر اسلام کی تعداد [دو سو افراد پر مشتمل تھی (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۹)] ۔ اس مہم میں آپؐ نے دیگر مقامات کے علاوہ رَضوٰی (کوہ) کی جانب سے جبال جُہینہ کے قریب مقام بواط پر قیام فرمایا اور علاقے کی نگرانی کی ۔ اس دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کے مزار پر بھی تشریف لے گئے ۔ اس غزوے کے دوران میں آپؐ کا سفید علم حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اٹھائے ہوئے تھے جب کہ مدینہ منورہ میں السائبؓ بن عثمان [بن مظعون] کو نائب کے طور پر چھوڑا گیا تھا ۔ اس غزوے میں بھی دشمن سے سامنا نہ ہوا [الزرقانی : شرح المواہب اللدنیہ، ۱ : ۳۹۴] ۔

غزوۂ ذی العُشَیرہ : غزوۂ بواط سے واپسی کے دو ماہ بعد] یعنی [جمادی الاُولٰی یا جمادی الآخرہ] ۲ھ میں آپؐ ایک اور سفارتی سفر پر روانہ ہوئے ؛ اس بار بھی آپؐ وادی ینبع میں ذوالعشیرہ اور دوسرے مقامات پر ٹھیرے اور شام کی اس تجارتی شاہراہ پر [بنو مُدلج اور ان کے حلفا بنو ضَمرہ (ابن ہشام : السیرۃ النبویۃ ، ۲ : ۳۴۸) سے معاہدۂ صلح کیا ۔ غالباً یہ معاہدہ بھی ریاست مدینہ میں شمولیت کا معاہدہ تھا ۔ آپؐ کے ساتھ ڈیڑھ سو یا دو سو صحابہؓ شریک سفر تھے ؛ لِواء حضرت حمزہؓ کے پاس تھا ؛ (حوالۂ مذکور ؛ الزرقانی : شرح المواہب ، ۱ : ۳۹۰)].

غزوہ سَفوان یا بدرالاُولٰی : اس طرح اسلام اور اہل اسلام کی طاقت روز افزوں رہی ، جو مشرکین مکّہ کے لیے ناقابل برداشت تھی؛ چنانچہ چھاپہ مارنے کے لیے قریش مکّہ نے چھوٹی سی چھاپہ مار جماعت کُرز بن جابر الفہری [جو بعد میں مسلمان ہوئے اور ۸ھ میں فتح مکّہ کے موقع پر شہید ہوئے (ابن حجر: الاصابۃ)] کی کمان میں روانہ کی ۔ یہ جماعت رات کی تاریکی میں مدینہ منورہ کی چراگاہ پر حملہ آور ہوئی اور صبح ہونے سے قبل چند اونٹ ہانک کر تیز رفتاری سے واپس لوٹ گئی ۔ حضورؐ غزوۂ عشیرہ سے چند روز قبل لوٹے تھے ۔ [ممکن ہے وہ کسی بڑے ارادے سے آیا ہو ، مگر مدینہ منورہ آنے کے بعد] اس نے اس شب خون کو ہی کافی سمجھا۔دوسری صبح حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ نے جلدی سے چھوٹا سا لشکر تیار کیا اور کُرز کا تعاقب کرنے کے لیے نکلے ، مگر وہ غیر معروف راستوں سے ہوتا ہوا نکل چکا تھا ۔ اس مہم میں آپؐ سفوان کے مقام تک تشریف لے گئے ؛ یہ مقام بدر کے قریب ہے ، اسی لیے اس غزوے کو غزوۂ سفوان اور غزوۂ بدرالاولی کہتے ہیں ۔ علمبرداری کے فرائض حضرت علیؓ بن ابی طالب کو تفویض

کیے گئے تھے ۔ مدینہ منورہ میں زیدؓ بن حارثہ الکلبی کو نائب کے طور پر چھوڑا گیا تھا [ابن سعد، ۲ : ۹].

سریہ عبداللہ بن جحش : [رجب ۲ھ میں] حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو آٹھ [یا بارہ افراد] کی کمان دے کر ایک خفیہ مہم پر روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ ملفوف اقدامی احکامات (operational orders) کو دو روز کی مسافت کے بعد کھولا جائے۔ انھوں نے ایسا ھی کیا۔ اس میں تحریر تھا کہ مکہ اور طائف کے درمیان [مقام نخلہ میں ٹھیر] کر قریش مکہ کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کو زیر نظر رکھا جائے اور چند روز کے بعد واپس آ کر روداد پیش کی جائے۔ اتفاق کی بات ھے کہ جب حضرت عبداللہؓ بن جحش نخلہ کے مقام پر پہنچے تو پاس ھی قریش مکہ کا ایک چھوٹا سا تجارتی قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوے تھا ۔ حضرت عبداللہؓ نے [آپؐ کی مرضی کے بغیر] اس قافلے پر حملہ کرکے ان کے محافظوں میں سے ایک محافظ [یعنی عمرو بن الحضرمی] کو قتل کر دیا اور دو افراد [یعنی عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان] کو قیدی بنا لیا اور قافلہ لوٹ لیا ۔ ایک محافظ بھاگنے میں کامیاب ھوگیا ۔ چونکہ یہ حملہ حضورؐ کے حکم کے خلاف کیا گیا تھا ؛ اس لیے آپؐ نے مقتول کا خون بہا ادا کیا ؛ [البتہ خمس وصول کرکے مال غنیمت تقسیم کر دیا (ابن ھشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۵۲ تا ۲۵۴ ؛ الزرقانی : شرح المواھب ، ۱ : ۳۹۷ ببعد)] ۔ اس طرح غزوۂ بدر کے لیے اسباب پیدا ھوگئے ، اور غزوات کا پہلا دور اختتام کو پہنچ گیا.

غزوۂ بدر : اس اولین ، مگر اھم ترین دور پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ھوگا کہ اس دور میں چند عوامل تھے جو حالات کو بتدریج بڑی تیزی کے ساتھ کسی اھم نتیجے کی طرف لے جا رھے تھے۔ اعلان جنگ کے بعد حضورؐ کے لیے داخلی اور خارجی امور کو اطمینان بخش طور سے پائدار بنیادوں پر استوار کرنا ضروری تھا۔ اس اقدام سے قریش کے موقف میں کمزوری واقع ھوگئی ۔ دوم ، اھل مکہ نے بار بار کوشش کی کہ وہ اپنے گھٹتے ہوے وقار کو سنبھالا دے کر مدینہ کی وسعت حدود کو بایں غرض روک لیں کہ بالآخر مدینہ منورہ کی ریاست کو ختم کیا جا سکے ، مگر وہ کامیاب نہ ھو سکے ۔ بہرحال ان کوششوں میں بتدریج تیزی آتی گئی ۔ طرفین کو ایک ایک بار ھدف تک مار کرنے میں کامیابی ھو چکی تھی۔ یہ بات قریش مکہ کو گوارا نہ ھو سکتی تھی ۔ [اھل بصیرت کے لیے قابل غور ھے] کہ افق پر نئی طاقت کے ابھرنے سے پرانی طاقت کو اپنی ابتدائی ناکامیوں سے ازحد مایوسی ھوئی ۔ اب تک یہ اپنی عسکری برتری اور وافر مادی وسائل کو صحیح طور پر استعمال بھی نہ کر سکے تھے ۔ [اس لیے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں] کہ قریش کے لیے [اب اس کے سوا چارہ کار نہ رہا تھا کہ کوئی] ایسا قدم اٹھائیں جس کے ذریعے وہ اپنی پوری عسکری طاقت ، اپنے حلیف قبائل کی افرادی قوت ، اور اپنے مادی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوے مدینہ منورہ کی نئی اور کمزور سی ریاست کے وجود کو ختم کرکے اپنے مقصد میں کامیاب ھونے کی کوشش کریں.

قریش مکہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھے ۔ وہ طاقتور ھوتے ھوے اپنی پوری طاقت استعمال کرنے سے جھجھکتے تھے ۔ اس کی دو وجوہ تھیں : اگر وہ بغیر کسی واضح اور حق بجانب وجہ کے مدینہ منورہ پر بھرپور حملہ کر دیتے تو مدینہ منورہ کے حلیف قبائل ان کا رستہ روک لیتے ؛ نیز اس طرح کے جارحانہ حملے کی صورت میں قریش مکہ کے اھل انصاف حلیف، جو مسلمانوں کے ساتھ خواہ مخواہ کی عداوت کے قائل نہ تھے ، ان کے ساتھ شامل نہ ھوتے اور ان کے کچھ حلیف قبائل بھی علیحدگی اختیار

کر لیتے - دوسری دقت یہ تھی کہ قریش مکہ اور ان کے پڑوسی قبیلے (بنو بکر) کے درمیان پرانی دشمنی تھی - اگر قریش اپنا پورا لشکر لے کر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوتے تو خطرہ تھا کہ بنو بکر ان کی غیر حاضری میں مکّہ پر حملہ آور ہو جائیں گے - ان دونوں دقتوں کو رفع کرنے کی غرض سے مکہ کے ارباب اختیار نے نہایت خفیہ منصوبہ تیار کیا؛ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت شام کی طرف ایک بہت بڑا قافلہ روانہ کیا گیا، جس کا ظاہری مقصد دیگر اشیا کے علاوہ جنگی ساز و سامان خرید کر لانا تھا.

ابو سفیان جو اس مکی تجارتی قافلے کا سالار تھا، شام سے لوٹتے ہوئے جب مدینہ منورہ کی محاذاۃ میں، شاہراہ شام پر پہنچا تو اسے خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مسلمان اس پر حملہ آور نہ ہو جائیں - ادھر، اتفاقاً آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے روانہ کردہ دو افراد پر مشتمل ایک دستے کا، جو اس علاقے میں آپؐ نے مشرکین کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا، اسے سراغ مل گیا، جو اسی شاہراہ کے آس پاس موجود تھے - اس نے جنوب کی جانب زرقا کے مقام سے ضمضم بن [عمرو الغفاری] کو مکّہ مکرّمہ روانہ کیا تاکہ وہ وہاں پہنچ کر شور مچا دے کہ محمدؐ اور آپؐ کے ساتھی قافلہ لوٹنا چاہتے ہیں [ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۱۲ ببعد] - قافلے کے ساتھ صرف تیس محافظ تھے [الزرقانی، ۱ : ۴۱۰ ببعد]، اس لیے چاہیے کہ پورا مکہ اس قافلے کو بچانے کی تدبیر کرے - ضمضم غفاری جب مکّے میں داخل ہوا تو اس نے [نذیر العریان کے طور پر] اپنا پیرہن پھاڑ لیا اور اونٹ کا پالان اٹھا کر واویلا شروع کر دیا کہ قافلہ لٹ گیا ہے، جلد مدد کو پہنچو - اس ڈرامائی انداز سے پورے شہر میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور فوراً لڑائی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، ساتھ ہی رؤسائے مکّہ بنو بکر کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ شہر سے ان کی عدم موجودگی کے دوران میں مکّے پر حملہ نہ کریں - وہ مان گئے - بنو بکر کے ساتھ مباحث چار دن تک جاری رہے اور قریش کے لشکر نے بدر پہنچنے تک دس دن لیے - اس کے باوجود قرآنی شہادت کے مطابق بدر کی لڑائی کے روز قریشی قافلہ بدر کے قریب نچلی جانب تھا [ارشاد ہے : إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَ الرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ (۸ [انفال]) : ۴۲)، یعنی جس وقت تم (میدان جنگ) کے قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر اور قافلہ تم سے نیچے کی جانب تھا] - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضمضم کو بدر سے نہیں بلکہ الزرقاء سے ہی روانہ کیا گیا تھا [الواقدی، ۱ : ۲۸] - جن روایات کی رو سے ابو سفیان نے ضمضم کو آنحضرت کے لشکر کا علم ہونے کے بعد بدر سے روانہ کیا تھا وہ روایات غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہیں - غور کیجیے کہ ۱۲ رمضان ۲ھ یا اس سے ایک دن قبل حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ ایک بہت بڑا مکی لشکر مدینہ پر حملہ کے لیے چل پڑا ہے، اس پر آپؐ نے مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور یہ اطلاع ان کے سامنے رکھی - قرآن مجید کی آیات سے واضح ہے کہ اس اجلاس کے وقت سرور دو عالمؐ کو علم ہو چکا تھا کہ میدان میں قریش مکہ کا لشکر بھی ہے اور قافلہ بھی [ارشاد باری تعالیٰ ہے : وَ إِذْ يَعِدُكُمُ اللهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَ يُرِيدُ اللهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهِ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِينَ (۸ [انفال] : ۷)، یعنی اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا تم سے وعدہ کرتا تھا کہ (ابوسفیان اور ابو جہل کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا (مسخر) ہو جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے ہتھیار ہے وہ تمہارے ہاتھ آ جائے اور خدا یہ چاہتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے] - حضورؐ نے جب صحابہؓ کی

رائے دریافت کی تو مہاجر اور انصار صحابہؓ نے مقابلہ کرنے کے فیصلے کے ساتھ اتفاق کیا۔ [آراء معلوم کرنے کے لیے دیکھیے : البخاری : الصحیح ، کتاب المغازی ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۴)] - ۱۲ رمضان المبارک کو حضور اقدسؐ نے مسجد نبوی سے روانہ ہوکر ۱۶ رمضان المبارک کو بدر کی وادی کے شمالی سرے [العدوۃ الدنیا (۸ [انفال] : ۴۱) پر پہنچے ؛ بدر ایک بستی ہے جو مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان واقع ہے - مدینہ منورہ سے اس کا فاصلہ چار منزل کے قریب (شرح مواہب ، ۱ : ۴۰۶) یا ۲۸ فرسخ ہے (معجم ما استعجم، بذیل مادہ بدر)؛ [نیز رک بہ بدر)]۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے لشکر کو شمالی سرے پر چھوڑا اور دو صحابہ کو ساتھ لے کر قریشی لشکر کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے آگے تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اسی وقت قریشی لشکر کے تین افراد وہاں پانی بھرنے کے لیے پہنچے تھے - آپؐ کے ساتھیوں نے ان میں سے ایک کو پکڑ لیا - اس نے مکی لشکر کی تفاصیل سے حضورؐ کو آگاہ کیا ، [جس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کا لشکر ٹیلے کی پرلی جانب پڑاؤ ڈالے ہوے ہے] - اب آپؐ لشکر کو لے کر آگے بڑھے اور بدر کے چشموں کے شمال کی جانب اونچی ریتلی زمین پر اپنا معسکر قائم کیا - اس مقام سے آپؐ پانی کے چشموں کو اپنی نگرانی میں رکھ سکتے تھے۔

آپؐ نے صحابہؓ کے مشورے سے ایسے مقام کو لڑائی کے لیے منتخب کیا جو کسی قدر اونچا اور عساکر مشرکین کے مشرقی جانب واقع تھا ؛ اس کے پاس ہی ایک کنواں بھی تھا - رات کو بارش ہوگئی ، جس سے ریت جم گئی ، مگر مشرکین کے لشکر میں کیچڑ پھیل گئی [ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۴ ، ۱۵] - دوسری صبح ، یعنی ۱۷ رمضان المبارک پیر [شرح المواہب ، ۱ : ۴۱۰] کو نماز فجر سے فارغ ہوکر خاتم الرسل صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اپنے لشکر کو ترتیب دینا شروع کیا ؛ دو صفیں درست کی گئیں - اگلی صف میں تلوار بند اور نیزہ بردار تھے ؛ پچھلی صف میں تیر انداز متعین کیے گئے - کمان کا صدر مقام (Command Headquarter) پچھلی صف کے عقب میں ، مگر اس کے بالکل قریب اونچی زمین پر قائم کیا گیا اور اس پر سایہ کے لیے کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں سے سائبان تیار کر دیا گیا - اسی موقعہ پر ٹولیوں (Sections) اور دستوں (Platoons) کے کمان دار مقرر کیے گئے - چونکہ دشمن کے پاس سوارہ (Cavalry) بھی موجود تھا ، اس لیے دونوں پہلوؤں پر تیر انداز متعین کیے گئے ؛ انہیں مرکزی لشکر (Main Army) سے ترچھی ترتیب میں عقب کی جانب جھکاؤ دے دیا گیا تھا ، تاکہ سوارہ کا حملہ روکنے میں آسانی پیدا ہو - مبادا قریشی کمان دار اپنے سوارہ کے استعمال سے اسلامی لشکر کے پہلوؤں کو لپیٹ میں لے لے۔ اونٹوں کو لشکر کے عقب میں ایک نشیبی زمین میں پہلے سے ہی چھپا دیا گیا تھا - جنوب کی جانب سے اور وادی کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ جو راستہ عقب کو جاتا تھا اس پر ایک ٹولی (Section) متعین کی گئی تاکہ دشمن عقب سے حملہ آور نہ ہو سکے اور نہ ہی اونٹوں پر حملہ کر سکے - لشکر کو یوں تدبیراتی (Tactical) پہلو سے ترتیب دینے کے بعد آپؐ نے قریشی لشکر کے انتظار کا وقت دعا و سجود میں گزارا - آپؐ کی دعا کا ایک فقرہ روح اسلام کا نچوڑ ہے ؛ آپؐ کے الفاظ ہیں: [اَللّٰھُمَّ اِنْ تَھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃُ الْیَوْمَ لَا تُعْبَدْ (ابن ہشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۷۹) ، یعنی] اے اللہ اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج ختم ہوگئی تو قیامت تک تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

طلوع آفتاب کے ساتھ قریشی لشکر وادی بدر کے جنوب کی جانب العَقَنقل کے ٹیلے عقب سے نمودار ہوا - آپؐ نے اسے دیکھا تو فرمایا: [اَللّٰھُمَّ ھٰذِہٖ قُرَیْشٌ قد اَقْبَلَتْ بِخُیَلَائِھَا وَ فَخْرِھَا ، تُحَادُّکَ وَ تُکَذِّبُ رَسُوْلَکَ ،

اللّٰھم فنصرک الّذی و عدتنی ، اللّٰھم احنھم الغداۃ (ابن ھشام ، ۲ : ۶۷۳) ، یعنی] اے اللہ ! یہ قریش طاقت کے نشے اور غرور میں سرمست تجھ سے مقابلہ کرنے اور تیرے رسول کی تکذیب کرنے آئے ھیں ۔ اے اللہ ! ان کو ھلاک فرما ۔ پھر آپؐ نے اپنے لشکر کو آخری ھدایات دیں اور جہاد کے مقام سے روشناس [الواقدی : المغازی ، ۱ : ۵۹] ؛ جہاد کے دوران میں جس صبر و استقلال کی ضرورت ھوتی ھے، اس پر روشنی ڈالی اور حکم دیا کہ کوئی شخص اپنے مقام سے نہیں ھلے گا ۔ جب تک دشمن بالکل قریب نہ آ جائے ، اس وقت تک ھتھیار استعمال نہ ھوں ، ھر وار کارگر ھو اور اس وقت تک وار نہ کیا جائے جب تک ھدف پوری طرح زد میں نہ آ جائے [الواقدی : کتاب المغازی، ۱ : ۶۷] ۔ یہ تھا وہ اسلحتی انضباط (Armament Discipline) ، جسے آج کل کی اصطلاح میں Fire Discipline کہا جاتا ھے اور جس کے بغیر کوئی فوج اپنے ھتھیاروں کا صحیح استعمال نہیں کر سکتی ۔ ان ھدایات کے بعد حضور اکرمؐ بڑھتے ھوے دشمن کے قریب آنے کا انتظار فرمانے لگے ۔ ایک طرف تعداد کی کثرت اور ھتھیاروں کی فراوانی اور دوسری طرف جذبۂ ایمان اور اللہ کے آخری رسولؐ کی تربیت یافتہ چھوٹی سی جماعت تھی ، جس کی ایمانی قوت کا امتحان منظور تھا ۔ قریش لشکر اسلامی کے قریب پہنچ کر رک گئے اور مبارزت [رک بآں] طلب کی ؛ چنانچہ قریشی لشکر سے تین افراد عُتبہ بن ربیعہ ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ آگے بڑھے اور دونوں لشکروں کے درمیان پہنچ کر اسلامی لشکر میں سے اپنا مبارز طلب کیا ۔ اسلامی لشکر سے تین انصاری نوجوان آگے بڑھے ۔ یہ تینوں انصار مدینہ [معاذؓ، معوذؓ اور عوف]، حارث کے بیٹے تھے [یا پھر معاذ کی جگہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ تھے (ابن ھشام ، ۲ : ۲۷۷؛ ابن سعد : الطبقات، ۲ : ۱۷)]، مگر عتبہ بن ربیعہ نے انصار کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا اور کہا : ھمیں تم سے لڑنے کی ضرورت نہیں ۔ [بعض روایات کے مطابق آپؐ نے خود ان صحابہؓ کا مقابلے کے لیے نکلنا ناپسند فرمایا اور ان کو واپس بلا لیا (ابن سعد ، ۲ : ۱۷) ۔ بعد ازاں] آپؐ نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب ، حضرت علیؓ بن ابی طالب اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث کو مقابلے کے لیے نکلنے کا حکم دیا ۔ حضرت حمزہؓ عتبہ بن ربیعہ کے ، حضرت علیؓ ولید بن عتبہ کے اور حضرت عبیدہؓ بن الحارث اپنے ھم عمر عتبہ بن ربیعہ کے مقابلے میں نکلے ۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے اپنے مدّ مقابل کو زیر کر کے قتل کر دیا ؛ جب کہ حضرت عبیدہؓ [جو کسی قدر عمر رسیدہ تھے] اور عتبہ نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا تھا ۔ مبارزت کے دستور کے مطابق جب ایک بار خون بہہ نکلے تو مبارزت میں حصہ لینے والے ایک دوسرے کی مدد کو آ سکتے تھے ؛ چنانچہ سیدالشہدا حضرت حمزہؓ نے جھپٹ کر عتبہ کو ختم کر دیا [ابن سعد ، ۲ : ۱۷]۔ قریشی کمان دار اس منظر کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے فوراً پورے لشکر کو عام حملے کا حکم دےدیا [محمد حسین ھیکل : حیاۃ محمدؐ، ص ۲۶۳].

ادھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسی قسم کے غیر منضبط حملے کی توقع کیے ھوے تھے ؛ گزشتہ رات کی بارش کی وجہ سے مشرکین کی سمت کسی حد تک پھسان تھی ؛ اسلامی لشکر نسبتاً بلندی پر تھا ؛ قریشی لشکر کو سامنے سے سورج آنکھوں میں پڑ رھا تھا اور فاصلہ بھی کافی تھا ، جو دوڑ کر عبور کرنا ھر ایک کے لیے آسان نہ تھا ؛ اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ حملے کے جوش میں کچھ آگے بڑھ آئے اور کچھ پیچھے رہ گئے ؛ اس طرح قریش مکہ کی پیادہ فوج کے حملے میں توازن نہ رھا ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جنگ کے لیے تدبیراتی طور پر ایک

ایسا مقام چنا تھا ، جو اسلامی جیش کے لیے فائدہ مند تھا ۔ اس کے ساتھ ہی مکی سوارہ بھی لڑائی شروع ہوتے ہی دقتوں سے دو چار ہونا شروع ہو گیا ؛ اسلامی لشکر کے دونوں پہلوؤں پر تیر انداز متعین تھے اور ان کی ترچھی ترتیب کی وجہ سے انھوں نے دشمن کی جانب سے دائراتی (encircling) حرکت کو فوراً روک لیا ۔ زمین اور دیگر جغرافیائی دقتوں نے قریشی پیادہ اور سوارہ کی پیش قدمی (Advance) کو سست اور غیر مربوط (Uncoordinated) بنا دیا تھا ۔ اسلامی لشکر کی موزوں تدبیراتی ترتیب (Tactical Fomration) کی وجہ سے قریشی لشکر کا رسالہ رک گیا تھا اور کچھ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ لڑائی کے میدان سے ہی خارج ہو گیا ہے ۔ رسالہ صرف اسی صورت میں لڑائی پر اثر انداز ہوا کرتا ہے جب وہ ہلّہ بولنے (Charge) کے قابل ہو ۔ اسلامی لشکر کے تیر اندازوں نے قریشی رسالہ کو اپنے قریب تک نہ آنے دیا تھا ؛ وہ ہلّہ کیسے بول سکتا تھا ۔

اس دہری رکاوٹ نے حملے کو کلّیۃً غیر متوازن (Unbalanced) بنا دیا ۔ [لشکر قریش کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ لگاتار اس کے دو کمان دار مارے گئے ؛ عتبہ پہلے قتل ہوا ۔ عین گھمسان کی جنگ میں ابو جہل ، جو عتبہ کا قائم مقام اور فساد کی جڑ تھا ، مارا گیا ۔ اس طرح قریشی لشکر میں افراتفری سے ملتی جلتی حالت پیدا ہو گئی ؛ تمام لشکر منتشر اور غیر مرتب ہو کر مختلف ٹولیوں میں بٹ گیا اور اس طرح جیش اسلام پر لگاتار ، مگر غیر منظم حملے جاری رہے ، جب کہ دوسری طرف جیش اسلام منظم اور مربوط وحدت بن کر استقلال سے اپنی جگہ جما رہا اور مشرکین کے تمام حملوں کے باوجود وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکا] ۔ دوسری طرف اسلامی کمان دار کی نظر اپنے ہیڈ کوارٹر [العریش] سے محاذ (Front) کے چپے چپے پر تھی اور حسب ضرورت احکام جاری کیے جا رہے تھے ۔ دشمن کا پیادہ یوں بھی ہجوم کی شکل میں روانہ ہوا تھا ۔ (یاد رہے کہ عرب میں صف بندی کا دستور نہ تھا ، یہ بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایجاد ہے) ۔

لشکر قریش کے تیز رفتار افراد جب پتھروں کی زد میں پہنچے تو ان پر پتھروں کی پوچھاڑ کی گئی ؛ وہ رک رک کر ہتھیاروں کی زد میں آتے اور باری باری موزوں ہتیار کے ذریعے نشانہ بنا لیے جاتے ۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم صفوں کے پیچھے کھڑے ہوئے نہایت ٹھنڈے دل سے دشمن کی ان اٹھتی ، بڑھتی ، پھیلتی اور پھر اسلام کے مجاہدوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی ہوئی لہروں کو بغور دیکھ رہے تھے ۔ اگرچہ دشمن کے تیر اندازوں کا ہدف آپؐ کا ہیڈ کوارٹر [العریش] (گھاس پھونس کا چھپر) تھا ، مگر آپؐ تمام خطرات سے بے نیاز تھے ۔ جب آپؐ نے دیکھا کہ دشمن کی بڑھتی ہوئی غیر مربوط لہروں میں وہ پہلا سا جوش نہیں رہا تو آپؐ نے جھک کر زمین سے مٹھی بھر کنکر اٹھائے ، ان پر کلمات دعا و برکت فرمائے اور دشمن پر پھینکتے ہوئے بلند آواز سے فرمایا : اب حملہ کرو ، ان کو شکست ہو گی ۔ [یہ گویا پیش قدمی کا حکم تھا ؛ چنانچہ جیش اسلام "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کے مانند آگے بڑھنا شروع ہوا ۔ قاعدہ ہے کہ ایک ساتھ بڑھنے والی فوج کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ؛ چنانچہ مشرکین کی فوج بھی لمحہ بھر میں پیچھے کو ہٹنا اور دوسرے ہی لمحے میں بھاگنا شروع ہو گئی ۔

اس موقع پر دشمن کے ستّر نامور افراد قتل ہوئے اور اسی قدر قید کر لیے گئے ۔ زخمیوں کی تعداد کو تحریر میں نہیں لایا گیا ، [جب کہ جیش اسلامی کے کل ۱۴ افراد ، ۶ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے شہید ہوئے (البخاری : الصحیح ، کتاب

المغازی ، باب ۳ تا ۱۳ ؛ الزرقانی : شرح المواھب ، ۱ : ۴۰۶ تا ۴۳۵ ؛ ابن ھشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۵۷ تا ۳۷۴ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۱۱ تا ۲۷)] - اھل مکہ کو یقیناً ھر پہلو سے نقصان ھوا تھا - سب سے بڑھ کر جو نقصان ھوا وہ عزت و وقار کا نقصان تھا - قریش مکہ کو جزیرۃ العرب میں ممتاز مقام حاصل تھا ؛ وہ عرب کے سابقہ نظام کے داعی اور محافظ تھے اور نئے دین کے سب سے بڑے دشمن ؛ ان کو نئے نظام کی علمبردار چھوٹی سی تربیت یافتہ جماعت نے شکست دے دی تھی - جزیرۃ العرب کے دور دراز علاقوں میں اس انجام کا ذکر ھونا بدیہی تھا ؛ چنانچہ بدنامی سے بچنے کے لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس شکست پر خاموش سوگ منایا جائے گا ؛ کوئی اپنے مقتولین کی یاد میں (اشعار میں) گریہ و نوحہ نہ کرے گا - اس خاموش سوگ کے ساتھ ساتھ یہ عزم برقرار رکھا جائے کہ بدر کی شکست کا بدلہ جلد از جلد لیا جائے گا - رؤساے قریش ، بالخصوص ابو جہل کے قتل ھونے کی وجہ سے ابوسفیان بلا شرکت غیرے مکّی فوج کا کمان دار اعظم بن چکا تھا - اس نے قسم کھائی کہ وہ جب تک خون کا بدلہ نہ لے گا سر پر تیل نہ لگائے گا اور اپنی بیوی سے الگ رھے گا ؛ [چنانچہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے اس نے برائے نام مدینہ منورہ پر حملہ کیا (دیکھیے نیچے) - آپؐ نے قیدیوں کے لیے عرب کے مروجہ دستور (قتل یا ھمیشہ کی غلامی) کے برعکس فدیہ لے کر رھا کرنے کا فیصلہ کیا ؛ جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ، ان کی رھائی کے لیے دس دس افراد کو اس کی تعلیم دینا کافی قرار دیا؛ اس طرح تمام قیدی رھا ھو گئے (ابن ھشام : سیرۃ ، ۲ : ۲۹۸ تا ۳۰۲)].

غزوۂ بنی قینقاع : فتح بدر کے نتیجے میں ، ریاست مدینہ کے بین القبائل مقام میں معتد بہ اضافہ ھوا ، کیونکہ تعداد میں معمولی لشکر ، جس کے پاس تجہزات جنگ (Arms and Equipment) بھی ناکافی تھے، وہ اپنے مقابلے میں تین گنا فوج پر صرف فتح مند نہیں ھوا ، بلکہ اس نے دشمن کے ستر سے زیادہ آدمی قتل کر دیے اور اتنے ھی قیدی بنا لیے تھے اور اس کی اپنی فوج کے صرف چودہ افراد شہید ہوے تھے .

ظاھر ھے جس کمان دار کی تربیت یافتہ فوج ایسی شاندار کامیابی حاصل کر لے ، اس کی عسکری قابلیت کی شہرت فطری امر ھوتا ھے ، مگر اس کے ساتھ مخالفت کا بھی امکان تھا - [لہذا اسلامی مملکت کے آس پاس قبائل کا رد عمل ملا جلا تھا] ؛ البتہ مدینہ منورہ کے اندر جو یہودی آباد تھے اور میثاق مدینہ میں بھی شامل تھے انھیں مسلمانوں کی اس کامیابی پر از حد صدمہ ھوا - مدینہ منورہ کے مضافات میں یہودیوں کی تین بستیاں تھیں ، اور ان میں قلعے بھی تھے - ان بستیوں میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے- ان میں سے سب سے پہلے بنو قینقاع نے حرکت کی، جو اھل مکہ سے ساز باز رکھتے تھے- [وہ فنون حرب سے واقفیت کے علاوہ خاصی افرادی قوت بھی رکھتے تھے] - مدنی فوج کی مدینے میں واپسی پر انھوں نے میثاق مدینہ سے انحراف کرتے ھوے بغاوت پر آمادگی کا اظہار کیا - آپؐ نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی ، مگر انھوں نے بگڑ کر کہا : "کیا تم ھمیں بھی قریش مکہ کی طرح سمجھتے ھو ؟ بخدا اگر تم ھمارے ساتھ لڑو گے تو صحیح معنوں میں مردوں سے سامنا کرو گے - ھم لڑنا جانتے ہیں [ابن ھشام : سیرۃ ، ۳ : ۵] ؛ چنانچہ آپ نے ۱۵ شوال ۲ھ بروز ھفتہ کو ان کے [قلعے کے محاصرہ کا حکم دے دیا - پندرہ دن کے شدید محاصرے سے تنگ آ کر انھوں نے بالآخر ھتھیار ڈال دیے اور مدینہ چھوڑنا قبول کر لیا] - حضورؐ نے ان کی بغاوت کا قصور معاف کر دیا اور

انھیں ہتھیاروں کے علاوہ باقی ساز و سامان اور مال و دولت بھی ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی [ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۵۰ تا ۵۲]۔

غزوۂ سَوِیق : ابوسفیان [اپنی قسم پوری کرنے کے لیے] جب مدینہ منورہ پہنچا تو بنو قینقاع مدینہ منورہ سے جلا وطن کیے جا چکے تھے ۔ وہ ایک یہودی سردار سلّام بن [مِشکم] کے گھر گیا اور وہاں اسے سب حالات معلوم ہوئے ۔ [رات کے آخری پہر میں اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ] مدینہ منورہ کے مضافات میں [مقام العُرَیض میں کچھ درختوں کو جلایا اور دو انصاری صحابہؓ کو قتل کیا] اور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واپس لوٹ گیا ۔ اس طرح اس نے اپنی قسم کو پورا کیا (ابن ہشام سیرۃ ، ۳ : ۴۷ تا ۴۹) کے مطابق یہ واقعہ غزوۂ بنی قینقاع سے قبل پیش آیا]۔

آنحضرت صَلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اطلاع ملتے ہی اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے ۔ پکڑے جانے کے اندیشے سے اس نے راستے میں جا بجا ستوؤں کے تھیلے پھینکنے شروع کر دیے تاکہ وزن کم ہو جائے ، اسی بنا پر اس غزوے کو غزوہ سویق (= ستو) کا نام دیا گیا ہے [الواقدی : المغازی ، ۱ : ۱۸۱ تا ۱۸۲ ؛ ابن ہشام ، سیرۃ ، ۳ : ۴۷ تا ۴۹]۔

غزوہ قَرقَرۃ الکُدْر : ادھر بنو سُلیم مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے ۔ اس کی اطلاع آنحضرت صَلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ملی تو آپؐ نے [غزوۂ بدر سے واپسی کے سات دن بعد (ابن ہشام، ۳ : ۴۶) یا وسط محرم الحرام ۳ھ میں (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۱)] بنو سُلَیم کی خیمہ گاہوں کا رخ کیا ۔ حضورؐ کا لشکر نہایت تیزی سے بنو سلیم کے علاقے [قرقرۃ الکدر یا قراۃ الکدر] میں پہنچا ، مگر وہ اطلاع ملتے ہی پہاڑوں میں چھپ گئے ؛ کچھ جانور اپنی خیمہ گاہوں کے آس پاس چھوڑ گئے جنھیں پکڑ لیا گیا ۔ اس غزوہ کو غزوۂ بنی سلیم بھی کہا جاتا ہے ۔ [جیش اسلام کی تعداد دو سو تھی (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۴۶ ؛ الواقدی : المغازی، ۱ : ۱۸۲ تا ۱۸۴ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۱)]۔

غزوہ بنی سلیم ثانی : بنو سلیم نے مقام [بَحران میں جمع ہو کر] دوبارہ حملے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ پھر جب ان پر [ربیع الاوّل ۳ھ (ابن سعد ، ۲ : ۳۴) یا جمادی الاولی (الواقدی ، ۱ : ۱۹۶) میں] لشکر کشی کی گئی تو وہ پہاڑوں میں چلے گئے ۔ اس بار اسلامی لشکر کی تعداد [تین سو] تھی اور اس میں مہاجر اور انصار دونوں شامل تھے ۔ اس غزوہ کو غزوۂ بنی سلیم ثانی کہا گیا ہے [ابن سعد: الطبقات، ۲ : ۳۵ تا ۳۶ ؛ الواقدی ، کتاب المغازی ، ۱ : ۱۹۶ تا ۱۹۷) ؛ ابن ہشام: (سیرۃ ، ۳ : ۵۰) نے اس مہم کو قریش مکہ کے خلاف بیان کیا ہے]۔

غزوۂ بنی غطفان: [۱۲] ربیع الاوّل ۳ھ / ۶۲۴ء میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا دوسرا نجدی حلیف قبیلہ بنو غطفان مدینہ منوّرہ پر چڑھائی کی تیاریوں میں مصروف ہے ۔ آپؐ ساڑھے چار سو صحابہؓ کو ساتھ لے کر نجد [مقام ذی اَمَر] کی طرف روانہ ہوئے [اور اس تیزی سے دشمن کے سر پر جا پہنچے کہ دشمن حواس باختہ ہو گیا] ؛ انھیں اسلامی لشکر کی آمد پر پہاڑوں میں غائب ہو جانا پڑا ۔ اس مہم کا نام غزوۂ ذی امر بھی ہے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۴۹ ؛ ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۳۴)]۔

آپؐ کے اس طرح کے سفر اس قدر کامیاب ثابت ہوئے کہ قریش نے [آپؐ کو ایک مسلّمہ طاقت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور] راستے کا استعمال ترک کر دیا ، جو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ ، مدینہ کے پاس سے گزرتا تھا ۔ انھوں نے اس کے بعد جو قافلہ روانہ کیا ، اسے نجد کے راستے سے روانہ کیا ۔ رسول اللہ صَلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم

نے شروع سے خبریں حاصل کرنے کے عسکری ذرائع (Military Intelligence) کو اعلیٰ پیمانے پر منظم کر لیا تھا ۔ اس قافلے کی روانگی کی تاریخ اور اس کے سفر کی سمت معلوم ہونے پر آپؐ نے جمادی الآخرۃ ۳ھ میں حضرت زید بن حارثہؓ کو [ایک سو افراد پر مشتمل] دستۂ فوج دے کر روانہ فرمایا ۔ اس قریشی قافلے کی قیادت ابوسفیان بن حرب [(ابن ہشام، ۳:۵۳) یا صفوان ابن امیہ (ابن سعد ، ۲ : ۳۶)] کر رہا تھا ۔ حضرت زیدؓ نے قافلے کو روک لیا اور سامان اپنی تحویل میں لے لیا ۔ قافلے کے محافظ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ؛ چند ایک اسیر بھی ہوے ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپؐ نے قریش مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کا حکم دیا ۔ یہ قافلہ مکہ کے حلیف قبائل کے علاقے سے ہو کر گزر رہا تھا ، مگر آپؐ کی عسکری منصوبہ بندی (Military Planning) اور اس پر بہتر عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ قافلہ اپنی منزل مقصود پر نہ پہنچ سکا [الواقدی : المغازی ، ۱ : ۹۷ تا ۱۹۸؛ ابن ہشام ، ۳ : ۵۳] ۔ جن مہموں کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپؐ کی فوج قافلوں کو لوٹنے کے لیے ہر دوسرے مہینے نکل کھڑی ہوتی تھی اور قافلے ہاتھ نہ آتے تھے، [یہ خیال ضعیف روایات پر مبنی ہے]۔ یہ مؤرخ عسکری یا تنظیمی منصوبہ بندی کے اصولوں کی اہمیت نہیں سمجھ سکے، حالانکہ انکا تعلق محارباتی منصوبہ بندی سے ہے اور یہ ایک علم (science) ہے اور آنحضرتؐ کو اس کا ادراک تائید ایزدی کا مرہون منت ہے۔ جب جنگ شروع ہوچکی تھی اور مسلسل ہو رہی تھی تو اس قسم کے اقدامات کو محض تجارتی قافلوں کی روک ٹوک تک محدود سمجھنا درست نہیں ہوسکتا۔ حالات اور واقعات کی روشنی میں ایسی روایات فہم راوی کے دخل کی وجہ سے ناقابل اعتماد ہو جاتی ہیں.

اس دوسرے دور کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دور میں مدینہ منورہ سے آٹھ مہمیں روانہ کی گئیں ۔ ان میں سے سات کی قیادت خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے کی ۔ جس مہم کی کمان آپؐ نے ایک صحابیؓ کو عطا کی وہ انسدادی کارروائی تھی ۔ اس دور میں عسکری تربیت کی طرف پہلے سے زیادہ توجّہ دی گئی ، البتہ سفارتی سفر پہلے دور کی نسبت کم ہوے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اب دشمن علانیہ میدان میں آ گیا تھا اور دفاعی اقدامات کی ضرورت بڑھ چکی تھی ۔ اس دور میں اقتصادی ناکہ بندی کو بھی بطور ہتھیار کے استعمال کیا گیا ؛ قریش مکہ کے لیے شمال اور مغرب کی تجارتی شاہراہیں بڑی حد تک مسدود کی جا چکی تھیں ؛ اول الذّکر کے دائیں بائیں مدینہ منوّرہ کے حلیف قبائل آباد تھے ؛ آخرالذّکر پر مکہ مکرمہ کے حلیف قبائل کی موجودگی میں قریشی قافلہ روک لیا گیا تھا ۔

مدینہ منورہ کی عسکری قابلیت کی اس قدر دھاک بیٹھ چکی تھی کہ کوئی قبیلہ آسانی سے مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا ؛ [چنانچہ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ] اب مخالف ضرور بڑے پیمانے پر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوں گے ، کیونکہ دشمنوں کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے یہ موقع کھو دیا تو پھر مدینہ منورہ اتنی طاقت پکڑ لے گا اور وہ خود اقتصادی طور پر اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ ان کے لیے مسلمانوں کو شکست دینا ناممکن ہو جائے گا ۔

غزوۂ احد : [ادھر قریش مکہ بھی خاموش نہ تھے ، انھوں نے غزوۂ بدر کے بعد سے اب تک اس حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا تھا کہ مسلمانوں نے ان کو میدان بدر میں شکست سے ہم کنار کیا ہے ؛ چنانچہ انھوں نے ایک منظّم طریقے سے جنگ کی تیاریوں کا آغاز کر دیا : (۱) اپنے شعلہ بیان اور آتش نوا شاعروں کو اپنے حلیف قبائل میں روانہ کیا تاکہ اہل اسلام کے خلاف غیظ و

غضب کی آگ بھڑکا کر افرادی قوت حاصل کی جا سکے ؛ (۲) دوسری طرف تمام اہل مکہ سے چندہ لے کر سامان جنگ مہیا کیا گیا ؛ اس کے علاوہ خیبر کے یہودی ، بالخصوص یہود بنی قینقاع قبائل عرب کو بھڑکانے میں ان کے ہم نوا تھے (ابن ہشام : سیرۃ ، ۳ : ۶۴ ببعد)].

چنانچہ شوال المکرم ۳ھ میں ابوسفیان کی قیادت میں قریش مکہ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہوے [جس میں احابیش ، بنو کنانہ اور اہل تہامہ کے بہت سے حلیف قبائل بھی شریک تھے؛ یہ لشکر تین ہزار جنگجو افراد پر مشتمل تھا جس میں دو سو گھڑ سوار ، سات سو زرہ پوش اور تین ہزار اونٹ تھے ؛ پانچ سو عورتیں بھی ہمراہ آئی تھیں (ابن سعد ، ۲: ۳۷)]۔ جب کفار کا لشکر مدینہ منورہ کے باہر کوہ احد کی مغربی جانب خیمہ زن ہوا تو آپؐ نے مجلس مشاورت طلب فرمائی اور دفاع کے طریق پر غور فرمایا ۔ آپؐ کا ارادہ تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے ؛ نوجوانوں ، خصوصاً وہ ، جنھیں غزوۂ بدر میں حصہ لینے کا موقع نہ ملا تھا ، کی خواہش تھی کہ مکی لشکر کا مقابلہ باہر نکل کر کیا جائے ۔ حضور اکرمؐ نوجوانوں کے اصرار پر اٹھ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور زرہ پہن [کر باہر تشریف لائے ۔ اب نوجوانوں کو منشائے نبوی کے خلاف اصرار پر ندامت ہوئی] ، اس لیے معذرت کی اور کہا کہ آپ کی تجویز کے مطابق شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے ، مگر آپؐ نے فرمایا : پیغمبر کے لیے مناسب نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے تو لڑائی سے قبل اپنی زرہ اتار دے [ابن ہشام: سیرۃ، ۳ : ۶۸]۔ اب حضورؐ نے تین نیزے منگوا کر تین عَلَم تیار کیے؛ مہاجرین کا عَلَم [جو آپؐ کا عام ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا ، حضرت علیؓ یا حضرت مصعبؓ بن عمیر] کو عطا ہوا ۔ بنو اوس کا عَلَم [حضرت اُسَیدؓ بن حُضَیر] کو اور بنو خزرج کا عَلَم [حضرت سعدؓ بن عُبادہ کو مرحمت ہوا] ۔ حضرت عبداللہؓ بن امّ مکتوم کو نائب مقرر کر کے مدینہ منورہ میں چھوڑا اور ایک ہزار کا لشکر احد کی طرف روانہ ہوا [(ابن ہشام ، ۳ : ۶۸)؛ لشکر میں ایک سو زرہ پوش بھی تھے (ابن سعد ، ۲ : ۳۹)] ۔ مدینہ منورہ سے تقریباً دو میل باہر جا کر [الشیخین کے مقام] پر رات کے لیے پڑاؤ ڈالا گیا [اور لشکر کی نگہبانی پر حضرت سلمہؓ بن خالد کا پچاس جانبازوں کے ساتھ تقرر ہوا (حوالۂ مذکور) ۔ دوسری طرف مشرکین کے لشکر میں عکرمہ بن ابی جہل ، پچاس جوانوں کے ساتھ پہرے پر متعین تھا].

دوسری صبح ، پو پھٹنے سے پہلے حضورؐ جب کوچ کے لیے تیار ہوے تو عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا اور وجہ یہ بتائی کہ چونکہ اس کی رائے ، یعنی شہر کے اندر رہ کر لڑنے ، کو قبول نہیں کیا گیا [اور چونکہ اس کے نزدیک باہر نکل کر مقابلہ کرنا صریحاً قتل ہو جانے کے مترادف ہے] اور وہ اپنے آدمیوں کو قتل کرانا نہیں چاہتا .

اب اسلامی لشکر میں صرف سات سو کے قریب مجاہد رہ گئے تھے۔ [اگر پہلے تعداد ہزار تھی تو اب سات سو اور اگر نو سو تھی تو اب باقی رہنے والوں کی مجموعی تعداد چھ سو رہ گئی (الزرقانی ، ۲ : ۲۶)]، مگر آپؐ اس کے باوجود بھی نہایت اطمینان سے آگے بڑھے اور جبل احد کے جنوب مشرق سے ہوتے ہوے پہاڑ کے جنوب مغربی کونے کے قریب صف آرا ہوے۔ آپؐ نے یہ اہتمام کیا کہ اپنے عقب کی جانب چھوٹی سی پہاڑی [عَینان] پر حضرت عبداللہؓ بن جُبیر کی قیادت میں پچاس تیر انداز متعین فرما دیے تاکہ دشمن اپنے سوارہ سے عقبی حملہ نہ کر سکے ۔ ان

تیر اندازوں کو [تاکیدی] حکم دیا گیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنا مقام ہرگز نہ چھوڑیں (حوالۂ مذکور، ۲ : ۲۸)؛ [ابن سعد (۲ : ۴۰) کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا تم نے ہمارے عقب کی حفاظت کرنی ہے، ہمیں فتح ہو یا شکست تم نے اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہٹنا] ۔ اس پہاڑی کا نام جبل عینین بھی ہے اور جبل رُماۃ بھی ۔ آپؐ ان انتظامات میں مصروف تھے کہ آپؐ نے دیکھا کہ مکّی لشکر کے تین ہزار سپاہی وادی قناۃ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں ۔ حضورؐ کے لشکر کا دایاں بازو جبل احد کے کونے کے ساتھ تھا اور بایاں بازو وادی قناۃ کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا، اس لیے مکی کمان دار کو روبرو حملہ (Frontal Attack) کرنا پڑ رہا تھا اور وہ اپنے سوارہ کو پہلو سے حملے (Flanking Attack) کے لیے استعمال نہ کر سکتا تھا ۔ دشمن کو روبرو حملے پر مجبور کرنے کے علاوہ آپؐ نے محاذ اس قدر محدود چنا تھا کہ مکی لشکر کی افرادی برتری (Numerical Superiority) بروئے کار نہیں لائی جا سکتی تھی ۔

مکی لشکر اسلامی لشکر کے قریب پہنچ کر رک گیا اور ان کے علم بردار طلحہ بن ابی طلحہ نے آگے بڑھ کر مبارزت کے لیے للکارا : حضرت علیؓ اس کے مقابلے میں نکلے اور پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا ۔ اس کے بعد اس کے بھائی [عثمان بن ابی طلحہ] نے عَلَم سنبھالا ۔ حضرت حمزہؓ نے اسے قتل کیا ۔ پھر زرہ پوش ابو سعد بن ابی طلحہ نے قریشی علم سنبھالا اور اسے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قتل کر دیا ۔ اس طرح اِس خاندان کے آٹھ افراد عَلَم کے وقار پر مر مٹے ؛ پھر ایک غلام آگے بڑھا، وہ بھی قتل ہو گیا ۔ اس طرح قریش مکہ کے پے در پے علم برداروں کے قتل سے علم اٹھانے والا کوئی نہ رہا تو ان کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی ۔

مکی سوارہ خالد بن ولید کی کمان میں وادی قناۃ کے راستے اسلامی لشکر کی بائیں جانب سے ہو کر عقبی حملے کی کوشش کر رہا تھا، مگر جبل عینین پر متعین تیراندازوں نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی تھی ۔ جونہیں قریشی پیادے نے پسپائی (Withdrawal) اختیار کی، قریشی سوارہ بھی بھاگ کھڑا ہوا ۔ اسلامی لشکر نے بھاگتے ہوئے قریشی پیادے کے سپاہیوں کو پکڑنا اور ان کے ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیے ۔ جبل عینین پر متعین پچاس تیر اندازوں نے جب دیکھا کہ اسلامی فوج مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہے، تو ان میں سے اکثر اپنے مقام سے ہٹ گئے اور مال غنیمت سنبھالنے کے لیے چل پڑے ؛ ان میں سے صرف دس مجاہد اپنے مقام پر قائم رہے ۔ خالد بن ولید [نے جب یہ دیکھا تو اپنے تین سو سوارہ کے ساتھ آگے بڑھا اور] جبل عینین پر موجود چند تیر اندازوں کو روندتے ہوئے اسلامی لشکر پر عقب سے حملہ آور ہونے میں کامیاب ہو گیا ۔ بکھری ہوئی اسلامی فوج جو شکست خوردہ قریشی قیدیوں کو جمع کرنے میں دو دو اور تین تین کی ٹولیوں میں بٹ چکی تھی، سوارہ کے اس شدید حملے کی طرف سے غافل تھی ۔ ادھر جب بھاگتے ہوئے قریشی پیادے کے سپاہیوں کو معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر پر ان کے سوارہ نے عقب سے ہلّہ بول دیا ہے تو وہ بھی پلٹ پڑے ۔ اب اسلامی لشکر دو طرفہ حملے کا شکار ہو گیا [اور چونکہ غیر منظّم ہو چکا تھا، اس لیے اس حملے کی تاب نہ لا سکا ۔ اس حالت میں آپؐ کے ساتھ صرف چودہ جاں نثار باقی رہ گئے (ابن سعد، ۲ : ۴۲) ۔ دشمنوں نے جب آپؐ کو چند جاں نثاروں کے ساتھ پایا تو آپ پر شدت کے ساتھ حملہ کر دیا : ابن قمیئہ نے آپؐ پر تلوار کا وار کیا، جس سے آپؐ کے سامنے کا نچلا دایاں دندان مبارک شہید ہو گیا ؛ رخسار اور پیشانی بھی سخت زخمی

ہو گئی ۔ ادھر حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ ، جن کی شکل و شباہت آپؐ سے ملتی جلتی تھی ، شہید ہوگئے تو اسلامی لشکر میں افواہ پھیل گئی کہ (معاذ اللہ) آپؐ کو شہید کر دیا گیا ہے ؛ ایک روایت میں ہے کہ ابن قمیئہ نے جب آپؐ کے چہرے پر تلوار کا وار کیا اور آپ اس سے شدید زخمی ہو گئے ، تو اس نے یہ افواہ مشہور کر دی کہ اس نے معاذ اللہ آپؐ کو قتل کر دیا ہے ۔ اس افواہ سے اہل اسلام میں مزید بد دلی پیدا ہوگئی ؛ آپؐ بار بار آواز دیتے تھے : اللہ کے بندو ! میرے پاس آؤ ؛ میں اللہ کا رسول ہوں ۔ سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک نے آپؐ کو پہچانا اور بلند آواز سے صحابۂ کرامؓ کو پکارا کہ آپؐ یہاں تشریف فرما ہیں ، یہاں آؤ ۔ [یہ سننا تھا] کہ اکھڑے ہوے قدم جمنا شروع ہو گئے۔ جب صحابہؓ کی معتدبہ تعداد جمع ہو گئی تو آپؐ نے پھر اپنا لشکر منظم کرنا شروع کیا اور اہل اسلام کو لے کر آہستہ آہستہ پیچھے کو ہٹتے گئے تاکہ احد کی بلندی سے فائدہ اٹھایا جا سکے ۔ یہاں دوسری بار شدت کی لڑائی لڑی گئی ۔ یہ مقام کشادہ تھا ، اس لیے قریشی سوارہ بار بار پلٹ کر گھرے ہوے اسلامی لشکر پر حملے کر رہا تھا ۔ اس کے باوجود آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم لمحہ بہ لمحہ اپنے لشکر کو احد کے قریب لیے جا رہے تھے ۔ جونہیں جیش اسلام احد کی بلندی پر پہنچا تو قریشی لشکر کا حملہ رک گیا ؛ قریشی لشکر نے بھی دوسری چوٹی تک رسائی حاصل کر لی ، مگر کسی نئے حملہ کرنے میں انھیں کامیابی نہ ہوئی ۔ اس گھمسان کی دست بدست [لڑائی میں صحابۂ کرامؓ کی جان نثاری کا بھرپور اظہار ہوا ؛ ابن سعد کے مطابق آپ کے سامنے تیس نوجوانوں نے یکے بعد دیگر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے؛ ان میں سے ہر ایک آگے بڑھتا اور عرض کرتا : میری جان آپؐ پر نثار ہو۔ پھر پلٹ کر واپس نہ آتا (ابن سعد ، ۲ : ۴۶)] ۔ احد کی لڑائی میں [بائیس مشرک قتل ہوے جب کہ دوسری طرف] ستّر صحابہؓ شہید ہوے [الزرقانی : شرح المواہب ، ۲ : ۱۸ تا ۴۶] ۔ سیدالشہداء حضرت حمزہؓ بھی ان میں شامل تھے ۔ کچھ دیر بعد قریشی لشکر مکے لوٹتا ہوا نظر آیا۔ [آپؐ نیچے تشریف لائے، شہدا کی لاشوں کو جمع کیا ، ان پر نماز جنازہ پڑھی اور بڑی بڑی قبریں کھود کر ان میں متعدد شہدا کو دفن کر دیا گیا (ابن سعد، ۲ : ۴۳ تا ۴۴) ۔ اس سے فارغ ہوکر آپؐ] نے اپنی سپاہ کو واپس مدینہ منورہ کوچ کرنے کا حکم دیا اور یوں احد کی لڑائی ہار جیت کے بغیر اختتام کو پہنچی ؛ چنانچہ جیش اسلام نے نماز مغرب مدینہ منورہ میں آ کر ادا کی ۔

میدان جنگ سے تو مشرکین لوٹ گئے ، لیکن جب مدینہ منورہ سے آٹھ دس میل حمراء الاسد کے مقام پر پہنچے تو انھوں نے لڑائی کے انجام پر غور کیا تو انھیں پتا چلا کہ وہ جس کو مسلمانوں کی ہزیمت خیال کیے ہوے تھے وہ خود ان کی اپنی ہزیمت ہے ، کیونکہ عساکر قریش جیش اسلام کو نہ تو میدان جنگ سے باہر نکلنے پر مجبور کر سکا اور نہ ہی کوئی اور نمایاں کامیابی حاصل کر سکا تھا ۔ اس بنا پر بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ پلٹ کر دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہیے [ابن ہشام، ۳ : ۱۰۸] ۔ آپؐ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے تعاقب کرنے کا فیصلہ فرمایا ؛ چنانچہ [احد کی لڑائی کے دوسرے دن (ابن ہشام ، ۳ : ۱۰۶) شوال [۳ ہجری] کو سرور کونین صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے لشکر کو تیاری کا حکم دیا ۔ جب لشکر جمع ہو گیا تو آپؐ نے قریشی لشکر کے تعاقب کے احکام صادر فرمائے ، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ صرف وہی افراد اس لشکر میں شامل ہوں گے جو احد کی لڑائی میں حاضر تھے ۔ حضورؐ اس مہم میں حمراء الاسد

کے مقام تک تشریف لے گئے۔ وہاں معسکر قائم کرنے کے بعد نظارتی گشتیں روانہ کیں، قریشی لشکر چند میل دور [الرَّوحاء] کے مقام پر خیمہ زن تھا ۔ جونہیں ان کو معلوم ہوا کہ حضورؐ ان کے تعاقب میں مدینہ منورہ سے [نکل کر حمراء الاسد تک آ پہنچے ہیں تو آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی] ۔ وہ تیز رفتاری سے مکے روانہ ہو گئے ، البتہ [بنو عبدالقیس کے ایک تجارتی قافلے کے ذریعے] آئندہ سال بدر کے مقام پر دوبارہ مقابلہ کرنے کا پیغام بھیج دیا ۔ جب آپؐ تک یہ پیغام پہنچا تو آپؐ نے فرمایا : ہمارے لیے اللہ کافی ہے ۔ اس طرح آپ مدینہ منورہ لوٹ آئے (نیز رک بہ احد] ۔ غزوۂ احد میں جیش اسلام کی برائے نام ہزیمت کی خبر جونہیں قبائل عرب میں مشہور ہوئی تو بہت سے قبیلے اہل اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے ؛ چنانچہ اس فتنے کو فرو کرنے میں آپؐ کو خاصا وقت لگا ۔

جیش ابو سلمہؓ بن عبدالاسد کی قَطن کو روانگی: آپؐ کو اطلاع ملی کہ عرب کے مشہور ڈاکو طلیحہ بن خویلد اور سلمہ بن خویلد مدینہ منورہ پر چھاپا مارنے کی تیاریاں کر رہے ہیں تو آپؐ نے محرم ۴ھ میں حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد المخزومی کو ڈیڑھ سو افراد کا دستہ دے کر روانہ فرمایا؛ چنانچہ وہ غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوے جبل قطن میں اچانک دشمن کے سر پر جا پہنچے ۔ دشمن اس طوفانی یلغار سے حواس باختہ ہو گیا اور ان کی جمعیت منتشر ہو گئی ؛ چنانچہ حضرت ابو سلمہ سالماً و غانماً واپس تشریف لے آئے (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۵۰ ؛ الواقدی : کتاب المغازی ، ۱ : ۳۴۰ ببعد) ۔

سریۃ عبداللہؓ بن اُنَیس : آپؐ کو اطلاع ملی کہ سفیان بن خالد الھذلی اللحیانی ، عُرَنَۃ کے مقام پر جمعیت اکٹھی کر کے مدینہ منورہ پر یلغار کرنا چاہتا ہے ۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو ۵ محرم الحرام [۴ھ] سوموار کو اکیلے ہی روانہ فرمایا ۔ انھوں نے نہایت ہوشیاری سے سفیان کو ختم کر دیا (ابن سعد ، ۲ : ۵۰ تا ۵۲) ۔

۴ھ میں بئر معونہ [رک بآں] اور رجیع [رک بآں] کے واقعات پیش آئے جس سے بعض قبائل کی اسلام دشمنی اور اہل اسلام کے خلاف ان کے عناد کا بخوبی اظہار ہوتا ہے ۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ صفر ۴ھ میں ابو براء عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الاسنۃ الکلابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی قوم کے لیے مبلغین بھیجنے کی درخواست کی ۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود اس نے اٹھائی۔ آپؐ نے ستر تربیت یافتہ قراء کی ایک جماعت کو ، جس کے امیرالمنذر بن عمرو الساعدی تھے ، روانہ فرمایا ۔ جب یہ جماعت بئر معونہ (جہاں بنو سُلیم اور بنو عامر کی سکونت تھی) پہنچی تو عامر بن الطفیل نے ، بنو سلیم کی جمعیت کے ساتھ ، ان پر ہلہ بول دیا ، چنانچہ سوائے ایک فرد کے تمام کو شہید کر دیا گیا ۔

انھی دنوں عَضَل اور القارہ (قبائل) کی ایک جماعت حاضر ہوئی اور مبلغین کو بھیجنے کی درخواست کی ۔ آپؐ نے ان کے ساتھ دس قراء کی جماعت کو مَرثدؓ بن ابی مرثد کی زیر قیادت روانہ فرمایا ۔ یہ جماعت جب مقام رجیع کے قریب پہنچی تو ان تمام کو بھی بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا ۔ یہ دو عظیم واقعات تھے ، جن میں تقریباً ۷۰ تربیت یافتہ افراد شہید ہو گئے (ابن سعد : الطبقات ، ۲ : ۵۱ تا ۵۶ ؛ الزرقانی : شرح المواھب ، ۲ : ۶۴ تا ۷۸)] ۔

اسی سال [یعنی ۴ھ میں] مدینہ منورہ کے مضافات میں رہنے والا دوسرا یہودی قبیلہ بنو نضیر [رک بآں] بغاوت پر آمادہ ہوا ؛ یہ وہ یہودی قبیلہ

ہے جس کے سردار سلام بن مشکم نے غزوۂ سویق کے موقع پر ابوسفیان کی مہمان نوازی کی تھی اور اسے مدینہ کے حالات سے آگاہ کیا تھا۔ اس قبیلے نے [آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کی ناپاک سازش تیار کی۔ ان دنوں ان کا سردار حُیی بن اَخطب تھا، آپؐ نے انھیں پیغام بھیجا کہ دس دن میں اپنے مکان خالی کر دو، ورنہ محاصرہ کر لیا جائے گا۔ انھوں نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی کی شہ پر لڑائی پر آمادگی ظاہر کی؛ چنانچہ ربیع الاول ۴ھ میں ان کا محاصرہ کر لیا گیا]۔ یہ لوگ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے؛ پھر بنو نضیر نے خود ہی مدینہ منورہ سے چلے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے انھیں معاف کر دیا اور سوائے ہتھیاروں کے باقی تمام سامان انھیں لے جانے کی اجازت دے دی [ابن ہشام، سیرۃ، ۳: ۱۹۹ تا ۲۱۲؛ الحلبی: سیرۃ حلبیۃ، ۲: ۵۵۹ ببعد].

غزوۂ ذات الرِقاع: بنو غطفان بدر و احد میں قریش مکہ کی مدد کر چکے تھے۔ ۴ھ میں ایک بار مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی تیاری بھی کی تھی؛ جمادی الاولی ۴ھ [ابن ہشام: سیرۃ، ۳: ۲۱۴) یا ۱۰ محرم (ابن سعد: طبقات، ۱: ۶۱)] میں آپؐ کو اطلاع ملی کہ بہ طاقت ور قبیلہ مدینہ منورہ پر حملے کی دوبارہ تیاریاں کر رہا ہے۔ حضورؐ نے چار سو [یا سات سو (ابن سعد، ۱: ۶۱)] صحابہ کرامؓ کا لشکر تیار کیا اور بنو غطفان کی خیمہ گاہوں کا رخ کیا۔ جونہیں انھیں حضورؐ کی روانگی کی اطلاع ملی وہ پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ لڑائی نہیں ہوئی؛ تاہم لڑائی کا شدید خطرہ رہا۔ اسی خطرے کے پیش نظر وہاں صلوٰۃ الخوف [رکَ بآں] پڑھی گئی۔ اسلامی لشکر چند روز ان کے علاقے میں خیمہ زن رہ کر واپس ہوا۔ اس مہم کا نام غزوۂ ذات الرقاع ہے [ابن ہشام: سیرۃ، ۳: ۲۱۴ ببعد؛ الزرقانی، ۲: ۸۶ ببعد].

غزوۂ بدرالاخیرہ یا بدر الموعد: ابوسفیان نے [الروحاء] سے واپس جاتے ہوئے آئندہ سال اسی موسم میں بدر کے مقام پر دوبارہ مقابلے کی دعوت دی تھی؛ اسی لیے حضورؐ شعبان ۴ھ [(ابن ہشام، ۳: ۲۲۰)] یا ذوالقعدہ، یہی قرین قیاس ہے (ابن سعد، ۲: ۵۹)] میں ایک ہزار [یا پندرہ سو (حوالۂ مذکور)] پر مشتمل لشکر لے کر بدر کی طرف روانہ ہوئے؛ اس مرتبہ مدینہ منورہ میں عبداللہؓ بن رواحہ [(حوالۂ مذکور) یا عبداللہؓ بن عبداللہ بن ابی بن سلول الانصاری (ابن ہشام، ۳: ۲۲۰)] کو نائب مقرر کیا۔ وعدے کے مطابق ابوسفیان [دو] ہزار کا لشکر (جس میں پانچ سو کا سوارہ بھی تھا) لے کر مکہ سے روانہ ہوا، مگر دوسرے پڑاؤ [الظہران کے کنارے مقام مَجَنّہ] سے ہی واپس لوٹ گیا اور کہا کہ اس سال جانوروں کے لیے چارے کی کمی ہے، اس لیے لڑائی کرنا مناسب نہیں۔ اسلامی لشکر ۸ روز کے قیام کے بعد بدر سے لوٹ گیا [الحلبی: سیرۃ حلبیۃ، ۵۷۹ تا ۵۸۰].

غزوۂ دُومۃ الجَندل: جزیرۃ العرب کے شمالی علاقے کے قبائل نے [دومۃ الجندل کے مقام پر، جو دمشق سے پانچ منزل دور ہے] جمعیت فراہم کر کے شام کی شاہراہ پر کاروانوں کو تکلیف دینا شروع کر دیا تھا [اور وہ مدینہ منورہ پر یلغار کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے (ابن سعد، ۱: ۶۲)]۔ حضورؐ ایک ہزار کا لشکر لے کر [ربیع الاول ۵ھ میں] اس علاقے میں گشت کے لیے تشریف لے گئے۔ [آپ راتوں کو سفر کرتے ہوئے اچانک ان کے سر پر جا پہنچے؛ وہ حواس باختہ ہو کر منتشر ہو گئے]۔ آپؐ نے دومۃ الجندل میں کچھ دن قیام فرمایا اور [مدینہ منورہ پر متوقع حملے کے خطرے کا سد باب کرنے کے علاوہ آپؐ نے] شاہراہ کو قافلوں کے لیے

پر امن بنانے کے بعد مدینہ منورہ مراجعت فرمائی [ابن سعد : طبقات ، ۲ : ۶۲] .

غزوۂ بنی المصطلق : شعبان ۵ھ (شرح المواھب ، ۲ : ۹۵) یا ۶ھ (ابن ھشام ، ۳ : ۳۰۲)] میں بنو خزاعہ کی ایک طاقت ور شاخ نے حارث بن ابی ضرار کی سربراھی میں مدینہ منورہ پر لشکر کشی کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں - [حضورؐ ایک لشکر کے ساتھ حملہ آور ھوے - بنو مصطلق] نے معمولی سی جھڑپ کے بعد شکست قبول کر کے معافی مانگ لی - آپؐ نے انھیں معاف کر دیا - اسی سفر میں واقعہ اِفک [رکّ بہ عائشہؓ، ام المؤمنین] پیش آیا [الزرقانی : شرح المواھب ، ۲ : ۹۵ تا ۱۰۲)].

اس دور کے واقعات کسی حد تک پچھلے دور کے واقعات سے ملتے جاتے ہیں ، مگر ایک فرق نمایاں ھے : اس دور میں قریش مکہ خود تو خاموش تماشائی بنے رھے؛ جب کہ ان کے حلیفوں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف شرارت جاری رھی [غالباً در پردہ وھی انھیں بغاوت اور سرکشی پر آماد کر رھے تھے] - اس دور کی سات مہموں میں سے چھے کی کمان حضورؐ نے خود فرمائی؛ صرف ایک مہم کی کمان ایک صحابی کو دی [جس نے ایک قبیلے کی معاندانہ روش کا سدباب کیا] ؛ اس میں باقاعدہ لڑائی کا امکان نہ تھا - جن موقعوں پر لڑائی کا امکان تھا، ان میں حضورؐ نے کمان اپنے ھاتھ میں رکھی - اس سے یہ ظاھر ھوتا ھے کہ آپؐ صحابہ کرامؓ کی تربیت کا پروگرام مکمل فرمانا چاھتے تھے ؛ نیز یہ کہ کمان داروں ، نائب کمان داروں ، بلکہ صف اول کے سپاھیوں تک کو آپؐ کے طرز عمل سے ھدایت حاصل ھوتی رھے - اتنی زیادہ مہموں کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ اسلامی سپاہ ھمہ وقت ذھنی اور جسمانی طور پر تربیت کے اعلی معیار پر قائم رھتی - اس دور کا ایک پہلو یہ بھی ھے کہ قریش کے قافلوں پر تمام شاھراھیں مسدود ھو گئیں ، مگر اسلامی قافلوں کے لیے بہت کم رکاوٹ پیش آتی تھی.

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق : [اھل مکہ اور یہودِ خیبر ، جن میں بنو قینقاع اور بنو نضیر کے دو طاقت ور اور زبان آور قبیلے بھی شامل ھو چکے تھے ، اھل اسلام کے لیے ایک بار پھر متحد ھو کر میدان عمل میں کود پڑے ؛ چنانچہ] قریش مکہ کے پاس خیبر کے یہودیوں کی سفارت گئی اور انھیں اپنی پوری امداد کا یقین دلایا اور اس بات پر اکسایا کہ وہ مدینے پر حملہ آور ھوں [ابن ھشام ، ۳ : ۳۲۵ ببعد) ؛ صرف یہی نہیں بلکہ ایک مشترکہ سفارت مختلف بڑے اور افرادی قوت سے مالا مال قبائل ، مثلاً بنو غطفان ، قیس عیلان وغیرہ کے پاس گئی اور انھیں اسلامی حکومت کے خلاف اشتعال دلا کر اپنے ساتھ لڑائی میں شامل ھونے کی دعوت دی (کتاب مذکور، ۲۲۶ ؛ سیرۃ حلبیہ ، ۳ : ۱۲۹ ببعد)] .

شوال ۵ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خفیہ پیغام کے ذریعے اطلاع ملی کہ قریشی فوج اور ان کے حلیف مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ھو چکے ھیں - قریشی فوج کی تعداد دس ھزار [ابن سعد ، ۲ : ۶۶) یا بیس ھزار (الیعقوبی : تاریخ ، ۲ بذیل غزوۂ احزاب)] بتائی گئی ھے - اس فوج میں خیبر کے یہودی اور دوسرے قبائل اپنے اپنے لشکر ساتھ لائے تھے - اتنے مختلف قبائل کا ایک ھی روز مدینہ منورہ کے باھر جمع ھونا ایک غیر معمولی بات تھی - کتنا عرصہ منصوبہ تیار ھوتا رھا ھوگا اور کتنی سفارتیں ادھر ادھر سفر کرتی رھی ھوں گی ، اس کا اندازہ لگانا مشکل ھے - جن قبائل کے لشکروں کی تفاصیل مؤرخوں نے تحریر کی ھیں وہ یہ ھیں :